اردو ادب کا نمائندہ رسالہ
سہ ماہی
انتساب
سرونج
گوشۂ گوپی چند نارنگ
ڈاکٹر سیفی سرونجی

انل اگروال صدر سد بھاؤنا منچ، ڈاکٹر مختار شمیم، ڈاکٹر سیفی سرونجی، گلزار صاحب، محمد عزیز خاں، ڈاکٹر دھوم کیتو و دیگر

عبدالصبور خاں، جرنلسٹ سرونج، عبدالحفیظ عارف، محمد عزیز خاں، ڈاکٹر شان فخری، رشید انجم، گوپی چند نارنگ،
ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر تسنیم فاطمہ، بدر عالم، محمد عمر خاں

سہ ماہی سرونج

انتساب

مدیرہ
آسیہ سیفی

معاون
آفاق سیفی

اشاعت کا چوبیسواں سال | سرپرست: اٹل اگروال | شمارہ نمبر ۶۱

گوشہ گوپی چند نارنگ

ہمارے نمائندے

کینیڈا میں: شمس جیلانی

انگلینڈ میں: گلشن کھنہ

انگلینڈ میں: پرویز مظفر (برمنگھم)

اٹلی میں: ارشد اقبال آرش

پاکستان میں: سید معراج جامی

ابوظہبی میں: یعقوب تصوّر

مدینہ منورہ میں: خادم حسین خاکسار

قیمت فی شمارہ				زرِ رفاقت	
ہندوستان	:	50/-	روپئے	200/-	روپئے
برطانیہ و دیگر یوروپی ممالک	:	5/-	پونڈ	20/-	پونڈ
امریکہ	:	8/-	ڈالر	30/-	ڈالر
سعودی عرب	:	15/-	ریال	60/-	ریال
عرب امارات	:	15/-	درہم	60/-	درہم

ترتیب: ڈاکٹر سیفی سرونجی

رابطہ: سیفی لائبریری، سرونج، (ایم. پی.) ۴۶۴۲۲۸

Saifi Sironji, Saifi Library, SIRONJ (M.P.) 464228

Phone : 07591-253819, Mob.: 9300782056,

email : saifisironji@rediffmail.com

SAD BHAWNA MANCH, SIRONJ Ph.:253211

HaSnain Sialvi

فہرست

کمپوزنگ و طباعت: فاس کمپیوٹرانکس، ۳۷، چوکی تلیا، بھوپال-462 001

FAS COMPUTERONICS, 37 OPP. CHOWKI TALAYYA, BHOPAL

حمد باری تعالیٰ

حمد باری بڑی سعادت ہے
ہاں مگر اپنی اپنی قسمت ہے

حرفِ ''کن'' تو تری علامت ہے
یا خدا ! تو عظیم طاقت ہے

گردشِ ماہ و سال و صبح و مساء
ایک ادنیٰ سا رنگِ قدرت ہے

حمد کی محفلیں بپا کیجیے
دین کی یہ بھی ایک خدمت ہے

منقبت و نعت سے ذرا ہٹ کر
حمد کی اپنی اک روایت ہے

نعت گو شاعروں کو ہے معلوم
حمد گوئی میں جتنی راحت ہے

ہم ہیں اتنے ہی بے نیاز اس سے
جتنی توحید کی ضرورت ہے

اُس کے بندوں کا ہمنوا ہوجائے
ذاتِ باری کی جس کو چاہت ہے

گاہے گاہے وہ اس کو پرکھے بھی
جس کو اللہ سے محبت ہے

مجھ سے عاصی کو دی ہے فکر اپنی
میرے مولا یہ تیری عظمت ہے

میرے ہمدم بھی کم سمجھتے ہیں
جو خدا سے مجھے عقیدت ہے

میرا اللہ سے گفتگو کرنا
اُس کی توفیق کی بدولت ہے

حمد ہوتی ہے مجھے برسوں میں
یہ بھی میرے لیے غنیمت ہے

حمد ہوجائے وارثؔی جیسی
راشدؔ اس دل کی یہ بھی حسرت ہے

محمد ممتاز راشد

دوحہ قطر

☆ ''کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے'' (مظفؔر وارثی)

بیکل اتساہی

گیت

جلی جھوپڑی، قتل ہوئے سب، لُٹ گیا ہر سامان
کَبیرا کا ہے کا ابھمان

چوراہے سب پھانسی گھر ہیں، شہر ہوئے ہیں جیل
اندھی گلیوں کے نکڑ پر بم بچوں کا کھیل
لاشوں کے فٹ پاتھ پہ بیٹھا سنگ رہا طوفان
کَبیرا کا ہے کا ابھمان

بادل پی گئے تال تلیاں، ندیاں چر گئیں کھیت
اوڑھے دھوپ لکاٹھی پی کر موسم پھانکے ریت
حیرت سے اپنا آئینہ دیکھ رہا بھگوان
کَبیرا کا ہے کا ابھمان

الجھ گئی مندر مسجد کی راہوں میں دانائی
چھینکے تک بانہیں نہیں پہنچی سمٹ گئی انگڑائی
زلف نہ سنوری، روپ نہ نکھرا، بک بھی گئی مسکان
کَبیرا کا ہے کا ابھمان

جو بیتا سو بیت گیا یہ کہتے ہیں کچھ لوگ
کیسے یہ دھرموں کو لگ گیا راج نیت کا روگ
ہار گئی مانوتا جیسے جیت گیا شیطان
کَبیرا کا ہے کا ابھمان

غزلیں

مظفر حنفی

(سابق پروفیسر اقبال چیئر)
جامعہ نگر، نئی دہلی

یاد اُس کو نہ کر، بات بڑھ جائے گی
پھوس جنگلے میں برسات بڑھ جائے گی

میری آنکھوں کے تارے نہ ٹوٹے اگر
چاند گھٹ جائے گا رات بڑھ جائے گی

ایک دن سبز موسم گزر جائے گا
زرد پھولوں کی اوقات بڑھ جائے گی

ہم فقیروں کی صحبت میں بیٹھا کرو
اور توقیرِ سادات بڑھ جائے گی

ان گنت مدعی ہیں مسیحائی کے
شہر میں شرحِ اموات بڑھ جائے گی

اپنے حصے کی بتی جلاتے رہو
ورنہ غم کی سیہ رات بڑھ جائے گی

اس قدر صاف گوئی مظفرؔ میاں
کون سی آپ کی ذات بڑھ جائے گی

بلندی سے تماشا دیکھنا ہے
کہ سر نیزے پہ اپنا دیکھنا ہے

تھپیڑے نے کہا بہہ چل شتابی
جزیرہ ہے، اُدھر کیا دیکھنا ہے

نہیں دیکھی ابھی صحرا نے وحشت
مری وحشت کو صحرا دیکھنا ہے

کہا بے دست و پائی نے مچل کر
مجھے بھی زورِ دریا دیکھنا ہے

یہی ترچھی اڑانیں ہیں تمہاری
تو پھر طے ہے کہ نیچا دیکھنا ہے

مرے چاروں بازار مہنگے
کوئی سستا کھلونا دیکھنا ہے

اداریہ

سیفی سرونجی

کرتے تھے لوگ تبصرہ عنوان دیکھ کر
لکھا ہے کیا کتاب میں پڑھتا کوئی نہ تھا

ہمارے اردو شاعروں ادیبوں کا یہی سب سے بڑا المیہ ہے کہ وہ پڑھتے کم ہیں اور باتیں زیادہ کرتے ہیں خواہ کوئی تنقیدی کتاب ہو یا کوئی تحقیقی کتاب، وہ مذہب کا معاملہ ہو یا کوئی اور موضوع، کتاب پڑھنے سے پہلے ہی تبصرے شروع کردیتے ہیں اس حد تک جذباتی تحریریں سامنے آتی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ گیان چند جین کی کتاب کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ بہت کم لوگوں نے کتاب پڑھی اور لکھنے والے سینکڑوں پیدا ہوگئے کہ وہ اپنے جوہر دکھانے لگے۔

ہماری قوم کا معاملہ عجیب ہے کہ جہاں اتفاق ہونا چاہیے وہاں نفاق اور جہاں شعور اور علمی روشنی درکار ہوتی ہے وہاں جوش و جذبات سے کام لیا جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ انور شیخ اور گیان چند جین سے متعلق ہوا۔ یہ سچ ہے کہ انور شیخ نے اب سے پچیس سال پہلے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور گیان چند جین کی حالیہ کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' میں بھی اسی طرح لکھا گیا۔ اس سلسلے میں بے شمار خطوط موصول ہوئے ہیں۔ عام طور پر اس طرح کی بحث سے میں گریز کرتا ہوں جس میں مذہب سے متعلق گفتگو کی گئی ہو کہ میں کوئی عالم نہیں، نہ کوئی محقق کہ میں اس کی کھوج بین کرسکوں، اس موضوع پر بھی آگے گفتگو نہیں کی جاتی اگر ان بے شمار خطوط کے ساتھ چند معتبر ہستیوں کے خط نہ آتے۔ ان میں سب سے اہم شخصیت مشہور نقاد شمس الرحمن فاروقی صاحب کا ہے، دوسرے ہمارے کرم فرما صدائے اردو کے ایڈیٹر نعیم کوثر اور مشہور افسانہ نگار حسن جمال صاحب کا ہے، اس سے پہلے کہ اس سلسلے میں آگے گفتگو کی جائے محترم شمس الرحمن فاروقی، نعیم کوثر اور حسن جمال کے خطوط یہاں پیش کیے جاتے ہیں جو انور شیخ اور پروفیسر گوپی چند نارنگ سے متعلق ہیں۔ ان میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ دونوں ہستیاں اسلام دشمن اور اردو دشمن ہیں۔

''برادرم سیفی سرونجی سلام علیکم

انتساب کا شمارہ نمبر 59 کچھ دن ہوئے ملا تھا، شکریہ لیکن یہ دیکھ کر دل رنجیدہ ہوا کہ انور شیخ اور گوپی چند نارنگ جیسے اردو دشمن اور اسلام دشمن اب بھی آپ کے منظور نظر ہیں۔ انور شیخ نے اقبال اور دوسرے اکابر کے خلاف جو باتیں لکھی ہیں اور مذہب کے خلاف جو گندہ ذہنی کی ہے اس

سے کون واقف نہیں اور گیان چند جین کی کتاب کے خلاف تو آپ پوری کتاب لکھ رہے ہیں، حق یہ ہے کہ اب تک جو لکھا ہے اچھا لکھا، آپ کا پہلا مضمون مجھے ملا ہی نہیں تھا ورنہ میں اس کا ذکر کرتا، لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب گوپی چند نارنگ کی پشت پناہی اور اشارے کے بغیر لکھی گئی ہے، کوئی تو وجہ ہوگی کہ ایک عالم کی طرف سے لعن طعن کے باوجود گوپی چند نارنگ نے اس کتاب اور اپنے نام، اس انتساب سے اظہار برأت نہیں کیا، اس سلسلے میں آپ زیر نظر شمارے ہی میں صفحہ 147 پر آفاق عالم صاحب کا خط ملاحظہ کرلیں اور اردو ادب کا وہ نمبر بھی دیکھ لیں جس میں شمیم حنفی کا مضمون اس موضوع پر ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔"

"محترم سیفی صاحب، آداب،

انتساب 60 ملا، ممنون ہوں۔ آپ کا رسالہ خوب سے خوب تر ہوتا جارہا ہے، یہ خوشی کی بات ہے مگر میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ آپ چند لوگوں کی بیجا گرفت میں ہیں، رسالہ میں بھی نکالتا ہوں مگر حتی الامکان کسی کو خود پر سوار نہیں ہونے دیتا، میرے نزدیک ذہنی غلامی بہت بری شے ہیں، اس شمارے میں ساحر شیوی کا جناب انور شیخ سے ایک مکالمہ بڑی دلچسپی سے پڑھا اور طبیعت مکدر ہوگئی، شیخ صاحب بہت بڑے عالم، فاضل، شاعر، ادیب اور نکتہ داں ہوں گے مگر وہ اپنے مخالفین کے لیے جس طرح کی زبان استعمال کرتے ہیں اس سے ان کی سنجیدگی اور بردباری پر حرف آتا ہے۔ ان کے منہ سے خدا اور رسولؐ کا بار بار ذکر ہوتا ہے مگر ان کی اپنی زبان رسولؐ کے اطوار حسنہ اور اسلامی تعلیمات کے منافی ثابت ہوتی ہے، زمانہ جس کو بڑا کہے وہ بڑا ہوتا ہے، اپنے منہ میاں مٹھو کوئی بھی بن سکتا ہے، کاش انور شیخ اپنی زبان اور اپنے دماغ پر قابو پانا سیکھ سکیں۔ آپ ان سے اس قدر خوف زدہ ہیں کہ ان کی افسانہ نویسی پر میرے تاثرات کو ہضم نہیں کر پائے، تاہم چند سطور اس لیے لکھ رہا ہوں کہ زبان و ادب کے نام پر مغلظات برداشت نہیں کرسکتا، میرے خیال سے جو عالم ہوتا ہے وہ ظالم نہیں ہوسکتا، جناب انور شیخ کے مباحثے کی ایک قسط میں نے بھی اسباق سے ...... میں پیش کی تھی، بعد میں احساس ہوا کہ معاملہ علمی بدہضمی اور قلمی بدنظمی کا ہے، اس سب کے باوجود انور شیخ بارہا کام کی باتیں کر جاتے ہیں، بجائے ان پر خفا ہونے کے ان کی باتوں پر غور وفکر کرنا چاہیے اور مدلل جواب بھی دینا چاہیے، عام قارئین کو ایسے قضیوں سے صرف گالیاں ہاتھ آتی ہیں، کوئی شہرت نہیں ملتی۔" نیاز مند، حسن جمال۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اور حسن جمال صاحب کے خط کے علاوہ ہمارے ایک اور کرم فرما صدائے اردو کے ایڈیٹر نعیم کوثر صاحب کا خط بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"مکرمی سیفی صاحب، تسلیم،

خط اور مباحثہ کی تفصیل موصول ہوئی، میں آپ کو پہلے ہی خط لکھنا چاہتا تھا، انتساب کا ایک مسلمہ معیار تھا لیکن انور شیخ کے مضامین اور طول طویل بحث کے بعد تازہ شمارے میں ساحر شیوی کا انٹرویو اور شیخ صاحب کے جوابات نے آپ کے رسالے کے شاندار ماضی کو دھو کر رکھ دیا ہے۔ ایسی گھٹیا زبان اور وہ بھی اردو کے رسالہ میں، اُف، توبہ۔ پڑھ کر میرا سر شرم سے جھک گیا۔ آپ کو یہ انٹرویو شائع نہیں کرنا تھا، اس سے نہ صرف انتساب بلکہ سروج اور سیفی کا قد گھٹا ہے۔ خیر آپ جانیں، جہاں تک اردو زبان اور لسانیات کا سوال ہے میں کہوں گا کہ جس طرح مباحثہ میں شریک زیادہ تر صاحبان نے ڈاکٹر جین کی کتاب نہیں پڑھی، ویسے ہی نارنگ صاحب کی متذکرہ کتاب کا بھی بغور مطالعہ نہیں کیا ہے، کتاب میرے پاس بھی آئی ہے، جین صاحب کی کتاب میں 17 اسباق ہیں اور آپ دوبارہ موضوعات کی فہرست دیکھ لیں ورنہ نارنگ صاحب کی کتاب میں 23۔ دونوں کے موضوعات الگ الگ ہیں، پھر آپ حضرات کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں کہ اس کتاب سے ڈاکٹر جین کی پیدا کردہ غلط فہمیاں دور ہوگئی ہیں۔ کمال کر دیا۔ اتنے باکمال شرکاء، دوست اور آپ اسے تازہ علمی کتاب کہہ رہے ہیں جبکہ تمام پرانے مضامین ہیں جو زیادہ تر رسائل وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں، دیباچہ تازہ ہے۔ ڈاکٹر نارنگ کی میں بہت عزت اور تکریم کرتا ہوں لیکن آج تک کسی کی اندھی تقلید نہیں کی اور نہ چاپلوسی۔

آپ نے جین صاحب پر ضرور لکھا اور کسی شرکاء، 27 اگست کے جلسہ والے نے قلم نہیں اٹھایا، میں ان باکمال ادیبوں سے پوچھتا ہوں کیا متذکرہ کتاب میں نارنگ صاحب نے درج ذیل باتوں کو Reflect کیا ہے۔

(۱) مسلمان ملک کی تقسیم چاہتے تھے پھر یہاں کیوں ہیں؟
(۲) ایک عام ہندو کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر کیوں رکھا جائے۔
(۳) اور اُردو کا مزاج تنگ نظری ہے۔
(۴) اردو میں من حیث القوم ہندوؤں کی تذلیل اور اہانت۔
(۵) یہاں مسلمانوں کو اکثریت کے برابر اختیارات کیوں دیے جائیں؟
(۶) امیر خسرو اور ولی پر اردو پرستی کا الزام۔
(۷) عام اردو پڑھنے والے محمود غزنوی کے مرید ہیں۔

اس کے علاوہ زیرِ بحث بیان اقلیت کے خلاف اگر ان باتوں کا سلسلہ وار جواب دیا جاتا تو بات بنتی، نارنگ صاحب کی کتاب کا جین صاحب کی کتاب سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے، افسوس کہ آپ

نے جین صاحب پر سلسلہ بند کر دیا یعنی کسی دباؤ میں۔ لیکن ہم تو برابر لکھتے رہیں گے جب تک جین صاحب معافی نہیں مانگتے۔ ایک بھاشا ---- کی اشاعت میں جو ہاتھ شامل تھے انہیں میں خوب پہچانتا ہوں، افسوس آپ کی رپورٹ میں شائع نہیں کر پاؤں گا۔ امید کہ ناگواری محسوس نہ کریں گے۔ توفیق خاں کو آداب۔ نعیم کوثر۔''

سب سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ فاروقی صاحب اور نارنگ صاحب میرے لیے دونوں قابل احترام شخصیتیں ہیں کہ ان کی کتابیں اور مضامین پڑھ کر ہی مجھ میں کچھ شعور پیدا ہوا ہے، دونوں میرے آئیڈیل رہے ہیں، شاعروں میں مظفر حنفی، ندا فاضلی، بشیر بدر تو نقادوں میں وزیر آغا، شمس الرحمن فاروقی اور نارنگ صاحب سے ہی میں نے بہت کچھ سیکھا ہے، اسی طرح نعیم کوثر صاحب اور حسن جمال کی تحریریں بھی پڑھتا رہا ہوں، نعیم کوثر صاحب سے تو اکثر ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی ہیں، مجھے ذاتی طور پر کسی سے کوئی رنجش نہیں ہے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان خطوط میں مجھے انھوں نے اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا ہے، میں ان کی رائے کا احترام کرتا ہوں اور آئندہ خیال رکھوں گا، مگر اس سلسلہ میں کچھ باتیں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ ادب میں جو کچھ لکھا جاتا ہے یا لکھا گیا ہے کیا وہ سب سچ ہے؟ کیا ہمارے اساتذہ نے اپنی تحریروں میں حد سے زیادہ مبالغہ سے کام نہیں لیا؟ میرا تو ایمان ہی یہ ہے کہ دنیا میں قرآن کریم کے علاوہ کوئی کتاب مستند نہیں ہے، اس کے علاوہ ہر کتاب میں کچھ نہ کچھ مبالغہ ضرور شامل ہے، انسان غلطیوں کا پتلا ہے، اس میں ذاتی تعلقات، مصلحت پسندی، اقربا پروری فطری ہے، جو اکثر تنقیدی، تحقیقی کتابوں میں پائی جاتی ہے، یہ سچ ہے کہ انور شیخ سے لیے گئے انٹرویو میں بہت غیر معیاری زبان استعمال کی گئی ہے لیکن اس کے پس پردہ بھی دیکھنا چاہیے کہ پچھلے پندرہ سال سے انور شیخ کے 17 شعری مجموعے اور سینکڑوں افسانے شائع ہو چکے ہیں اور ان میں کوئی بھی بات میری نظر میں ایسی نہیں جو قابل اعتراض ہو، لیکن ہوا یہ کہ ناوک حمزہ پوری صاحب سے گلبن میں شائع ہونے والا مضمون لکھوا لیا گیا اور اس میں انور شیخ کی پرانی باتوں اور پرانے بیانات کو موضوع بحث بنا کر ان پر لعن طعن کی گئی ہے۔ ایڈیٹر گلبن نے نہ صرف انور شیخ کے خلاف مضمون لکھوایا بلکہ اسے الگ سے کتابی شکل میں شائع کرا کے ہر جگہ تقسیم کیا، اس کتابچے کا نام ہے ''کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند''۔ اس مضمون میں ناوک حمزہ پوری صاحب نے انور شیخ کے ملحدانہ خیالات کے دلائل کے جواب دیے ہیں جبکہ ان کا کہنا ہے کہ میں انور شیخ کو نہیں جانتا، نہ میں نے انہیں پڑھا ہے، اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''میرے کان انور شیخ سے آشنا نہ تھے، ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ اچھی بری تمام

چیزیں چھوٹے بڑے رسائل میں پڑھتا تھا، بینائی جاتے رہنے کا ایک بڑا سبب پچاسوں سال کی مسلسل کتب بینی بھی رہی ہے، اس طرح دس گیارہ برس سے یہ سلسلہ ٹوٹ گیا ہے، زیادہ ضروری ہوا تو بعض چیزیں پڑھوا کر سنتا ہوں اور اشد ضروری ہونے پر ہی بمشکل کچھ پڑھتا ہوں، چنانچہ انور شیخ سے ناواقفیت کی وجہ سے اپنی ہی معذوری رہی ہے ورنہ وہ تو سنا ہے کہ دھڑلے سے لکھ رہے ہیں، مدیران کی دکھتی رگ پر انگلی رکھنے کے فن سے بھی واقف ہیں اور اس طرح اپنی [illegible] آزمارہے ہیں۔''

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ناوک حمزہ پوری صاحب نہ انور شیخ کو جانتے تھے نہ انھوں نے انور شیخ کو پڑھا تھا بلکہ چند لوگوں نے انہیں جواب لکھنے پر مجبور کیا اور سرسری معلومات فراہم کیں اور تعریف کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے لکھوایا ہے انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اس سے پہلے کون کون لکھ چکا ہے اور ان کے جوابات دیے جا چکے ہیں۔ آج سے 7 سال پہلے انتساب کے انور شیخ نمبر میں جو ڈھائی سو صفحات پر مشتمل تھا پورا نمبر ان کی تعریف میں نہیں بلکہ ان کے تمام نظریات اور ملحدانہ خیالات کا بھرپور جواب تھا، اس لیے کہ میں خود حیران تھا چنانچہ میں نے تفصیل سے لکھا، میرے علاوہ سید انور حسین انور، محمد ایوب واقف، ڈاکٹر مفتی محمود اور کئی قلم کاروں نے انور شیخ سے تعلق بھی ختم کر لیا تھا اور پانچ سال تک ان کی کوئی کتاب انتساب میں نہیں چھاپی گئی، اس درمیان مناظر عاشق صاحب نے بتایا کہ انور شیخ تائب ہو گئے ہیں اور اپنے مذہب یا مسلمانوں کے خلاف کچھ نہیں لکھیں گے، انھوں نے اپنے سچے مسلمان ہونے کا اعلان کیا ہے جسے مناظر عاشق صاحب نے زرین شعاعیں میں شائع بھی کرایا اور واقعی ان دس بارہ سالوں میں ان کے پندرہ سولہ شعری مجموعے اور سینکڑوں افسانے شائع ہو چکے۔ انشاء، سخنور، ترسیل، پرواز، رنگ، اسباق اور کئی رسائل نے ان پر خصوصی گوشے اور نمبر شائع کیے، میں نے بھی نمبر اور دیگر تحریریں چھاپنا شروع کر دیں اور صاف کہہ دیا کہ اب کوئی تحریر ایسی نہ آ جائے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنے عرصے کے بعد گلبن میں ناوک حمزہ پوری سے یہ مضمون لکھوانے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور وہ بھی اس پروپگنڈے کے ساتھ کہ یہ تمہاری باتوں کا پختہ دلائل کے ساتھ جواب ہے، پھر یہ کہ '' ہندی ملاؤں کو ڈھنگ سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں یا وہ دلائل کے ساتھ گفتگو کرنے پر قادر نہیں ہیں''، اول تو یہی غلط ہے کہ صرف ناوک حمزہ پوری نے جواب دیے ہیں، کم علمی اور بے خبری ناوک حمزہ پوری کے علاوہ ایڈیٹر گلبن پر عائد ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ ناوک حمزہ پوری کو اتنے عرصے کے بعد غصہ آیا اور ایڈیٹر گلبن

کی ایمان کی رمق بھی اب جا گی، اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن کی تفصیل میں گیا تو سیکڑوں صفحات ہو جائیں گے اور کئی چہرے بے نقاب ہو جائیں گے۔ اب جبکہ دیگر علماء نے جواب جاہلاں باشد خموشی مناسب سمجھا لیکن ناوک حمزہ پوری نے جواب دینا یوں ضروری خیال کیا کہ ہندوستان میں اب تک کوئی جواب دینے کے قابل نہیں تھا، وہ لکھتے ہیں:

''یہ جان کر زیادہ افسوس ہوا کہ یہ شخص اس قسم کی دریدہ دہنی مدتوں سے کر رہا ہے اور کوئی اس کا مسکت جواب دینے کو سامنے نہیں آ رہا ہے، تعجب ہوا کہ ہندو پاک میں سینکڑوں ماہرین اقبالیات ہیں اور اقبال کے نام اور کام کو بیچ کر اپنی روزی روٹی چلا رہے ہیں وہ کیا کر رہے ہیں۔''

اب ظاہر ہے کہ جس بحث کے دروازے عرصہ ہوا بند ہو چکے ہیں از سرِ نو چھیڑنا اور کتابچے چھپوا کر تقسیم کرنا اور یہ ظاہر کرنا کہ دیکھئے ہم نے جواب دیدیا ہے جبکہ دیگر رسائل ان پر نمبر نکال کر اپنا ایمان بیچ رہے ہیں سوائے غیر ضروری بحث کے کیا نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں۔ درست ہے کہ ساحر شیوی کے انٹرویو میں انور شیخ نے غیر ادبی، غیر معیاری اور گھٹیا زبان کا استعمال کیا، لیکن اسے میں نے ہی نہیں چھاپا ہے، پرواز میں بھی چھپ چکا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی صاحب، نعیم کوثر صاحب اور حسن جمال صاحب کی رائے میرے لیے نہ صرف قابل احترام ہے بلکہ میں اس پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرتا ہوں لیکن اس کے پس پردہ اور وجوہات بھی ہیں کہ یہ سب کیوں لکھا گیا ہے؟

کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے، گیان چند نے جذبات کو ٹھیس پہنچانے والی کتاب لکھی، اس کا بھی ردِ عمل سامنے آیا، انور شیخ نے لکھا تو اس کا بھی، دونوں فریقوں نے جارحانہ رویہ اپنایا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ادب کا معاملہ ہو یا مذہب کا، کچھ لوگوں پر مصلحت پسندی ہر جگہ حاوی رہی ہے۔ بڑے سے بڑا شاعر، ادیب، نقاد مصلحت پسندی کا شکار رہا ہے، غالب، ذوق، اقبال، جوش کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ شاعر، ادیب مصلحت کے تحت ایسی شخصیات پر بھی لکھتے ہیں جن سے انہیں کچھ امیدیں ہوتی ہیں، انعام کی ہوں یا پیسے کی ہوں۔ اور یہ سلسلہ جاری رہے گا، یہی وجہ ہے کہ انور شیخ پر میں نے ہی نہیں کئی سنجیدہ قلم کاروں نے کتابیں، مضامین اور رسالوں کے خصوصی نمبر شائع کیے ہیں، اب رہا سوال اعتراض کرنے والوں کا تو یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی رسائی وہاں تک نہیں ہو پاتی ورنہ کوئی موقع لوگ چھوڑتے نہیں ہیں۔ جب مواقع نہیں ملتے تو دل کی بھڑاس اس طرح کے مضامین لکھ کر نکالتے ہیں۔ نعیم کوثر صاحب کو ہی لیجئے، ایک

سال پہلے انھوں نے بشیر بدر کے خلاف اتنا لکھا کہ ان کے کارٹون تک چھاپے اور ان پر اسلام دشمنی اور بی۔ جے۔ پی۔، آر۔ ایس۔ ایس۔ کا نمائندہ تک ہونے کا الزام لگا دیا لیکن جیسے ہی بشیر بدر نے انہیں اردو اکادمی کے ایک پروگرام میں بلایا، سارا جوش ٹھنڈا ہوگیا۔ پھر آپ کی ایمانداری اور خودداری کہاں چلی گئی۔ ایسے ہی گلبن کے ایڈیٹر سید ظفر ہاشمی ہیں۔ وہ اچھے افسانہ نگار، انشائیہ نگار ہیں لیکن ان کے تمام اداریے سطحی اور جذباتی ہوتے ہیں جن میں نہ کوئی سنجیدگی ہوتی ہے نہ تحقیق میں قلم اٹھایا، ہر کچھ بغیر معلومات کے لکھدیا، ایک سال پہلے انہوں نے اداریہ میں لکھ دیا کہ برطانیہ میں کوئی اردو وغیرہ نہیں ہے، بلا وجہ لوگ لکھ رہے ہیں بلکہ وہ لوگ لکھ رہے ہیں جو وہاں مشاعروں میں بلائے جاتے ہیں، اس پر بہت سے لوگوں نے انہیں خط لکھ کر معلومات بھی فراہم کیں، مشہور افسانہ نگار مقصود الٰہی شیخ نے تو صاف لکھدیا تھا کہ آپ کی معلومات ادھوری ہیں یعنی وہ اردو کی نئی بستیوں میں شرکت کرنے والوں پر طنز کرتے ہوئے یہ بھی بھول گئے کہ خود ان کے گھر میں یعنی اردو ادب کے مرکز لکھنؤ میں کیا حال ہے۔ میں نعیم کوثر صاحب اور سید ظفر ہاشمی سے یہی کہوں گا کہ اخبار کی صحافت اور ادب دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ تحریریں اخبار میں تو چل سکتی ہیں کہ اچھی خبروں میں شمار ہو جائیں، لیکن ادب میں نہیں، مجھے سب کا حال معلوم ہے۔

آپ نے گوپی چند نارنگ کے حوالے سے میرے بھیجے گئے مباحثہ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسے آپ نہیں چھاپ سکتے، اس لیے کہ پروفیسر نارنگ کی اس کتاب کا گیان چند جین کی کتاب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے خیال سے آپ نے اسے پڑھا ہی نہیں ہے، کسی لکھنے والے یا مباحثے میں شرکت کرنے والے نے یہ نہیں کہا کہ اس کتاب کا تعلق گیان چند کی کتاب سے ہے۔ ہاں یہ ضرور کہا کہ ایسے ماحول میں جب ایک اردو کے پروفیسر نے اردو کے خلاف زہر اگل کر اپنی ذہنیت کا ثبوت دیا ہے، دوسرے اردو کے شیدائی نے اردو کے لیے ایسی کتاب لکھی کہ جس کے لفظ لفظ سے اردو کے لیے محبت عیاں ہوتی ہے، کیا آپ کے نزدیک یہ بات قابل تعریف نہیں کہ نارنگ صاحب کی یہ کتاب اردو کے لیے اردو کے ماحول کے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے، آپ نے صحیح لکھا ہے کہ یہ پرانے مضامین ہیں لیکن یہ بھی بتائیں کہ کس نے یہ لکھا ہے کہ یہ نئے مضامین ہیں، ہاں سب نے یہ ضرور کہا ہے کہ یہ تازہ علمی کتاب ہے، دوسرے یہ کہ جس کی طرف فاروقی صاحب نے اشارہ کیا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ نارنگ صاحب نے اب تک گیان چند کی کتاب سے متعلق اپنا موقف بیان نہیں کیا، اس کے لیے بیان دینا ضروری ہے، کیا نارنگ صاحب کی بھوپال کے جلسے میں آدھے گھنٹے وہ تقریر جس میں آپ نے بھی شرکت کی تھی کوئی معنی نہیں رکھتی، نارنگ صاحب کی اس تقریر کے

ایک ایک لفظ سے پورے ادبی ماحول اور بھوپال کے ادبی حلقوں کی ساری بدگمانی نہ صرف دور ہوگئی بلکہ انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ جب تک گوپی چند نارنگ جیسی شخصیت موجود ہے کئی گیان چند پیدا بھی ہو جائیں تو کچھ نہیں کر سکتے۔ جو شخص یہ کہے کہ اردو میرا اوڑھنا بچھونا ہے، میں اردو کے بغیر نہیں رہ سکتا، اردو نے مجھے اتنا کچھ دیا ہے، اردو کا رسم الخط ثقافتی اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے جسے تبدیل کرنا زبان کی شخصیت کو قتل کرنا ہے اور پھر اس کتاب کا دیباچہ بھی پڑھ کر سنایا جس میں اردو کی اہمیت، افادیت اور اس کے روشن مستقبل پر روشنی ڈالی گئی ہے، ایسے شخص پر کسی بھی قسم کا شک کرنا میں اردو والوں کی بدنصیبی نہیں بلکہ تنگ نظری کہوں گا۔ اگر یہی تنگ نظری ہمیں رکھنا ہے تو کرشن چندر، پریم چند، مالک رام، گیان چند جین، کالی داس گپتا رضا، راجندر سنگھ بیدی، تلوک چند محروم، رتن ناتھ سرشار، ہی نہیں شیکسپیئر، ملٹن، کبیر، تلسی ان سب کو پڑھنا چھوڑ دینا چاہیے کہ یہ سب مسلمان نہیں تھے اور کوئی ضروری بھی نہیں کہ یہ سب اردو کے لیے یا مسلمانوں کے لیے یا اسلام سے ہمدردی رکھتے ہوں، ہم ادب اس لیے نہیں پڑھتے کہ یہ ہندو، یہ مسلمان ہے، اگر عصمت چغتائی نے اپنے آپ کو نذر آتش کر دیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اسے پڑھنا چھوڑ دیں۔ ادب کھلے دماغ، کھلے ذہن سے پڑھنے کی چیز ہوتی ہے، ہندو مسلمان بن کر نہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم اپنی ساری تنگ نظری دور کرلیں اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کریں کہ جس سے اپنی شناخت اور اپنا وقار قائم رکھ سکیں۔ ورنہ ایک دوسرے پر اعتراض کرنے سے کوئی مسئلہ آج تک حل نہیں ہو سکا ہے۔

نفرت کے دائروں سے نکل کر تو دیکھیے
سیفیؔ خدا کی بستی میں کوئی برا نہیں

انتساب شمارہ ۲۱ کی کمپوزنگ ہو چکی تھی اور چند خطوط کی روشنی میں اداریہ بھی کمپوز ہو چکا تھا لیکن اسی دوران صدائے اردو میں ایک تبصرہ میری کتاب ''گوپی چند نارنگ اور اردو تنقید'' میں شامل ہونے والے مضمون ''اردو زبان اور لسانیات'' پر جس میں مدیر صدائے اردو نے اہل سرونج پر طنز کیا ہے۔ اس لیے چند باتیں اس تبصرے سے متعلق بھی پیش ہیں۔

صدائے اردو کے ایک گمراہ کن تبصرے سے متعلق کچھ باتیں

صدائے اردو کے یکم نومبر کے شمارے میں میری کتاب ''گوپی چند نارنگ اور اردو تنقید'' میں شامل 'اردو زبان اور لسانیات' پر ایک مباحثے کے سلسلہ میں ایک تبصرہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے سرونج میں اردو زبان اور لسانیات پر گمراہ کن فتویٰ جاری ہوا ہے، اس تبصرے میں مدیر محترم نے مجھ پر اور اہل سرونج پر الزام بھی عائد کیے ہیں کہ صوبے کے سینئر شعرا کو چھوڑ کر ۲۴ راگست کو ساجتیہ

اکاڈمی کے پروگرام میں سیفی سرونجی کو کیوں مدعو کیا گیا، دوسرا الزام یہ کہ سرونج سے گمراہ کن فتویٰ جاری ہوا۔ جبکہ اس مباحثہ میں میرے اور محمد توفیق خاں کے علاوہ ممبئی کے محمد ایوب واقف، بھوپال کے اقبال مسعود، نسیم انصاری، کوثر صدیقی، مختار شمیم شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ اسی حسد نے مدیر صدائے اردو کو غیر متوازن تحریر لکھنے پر مجبور کیا، مدیر محترم کی لاعلمی کا یہ عالم ہے کہ انہیں خبر ہی نہیں کہ یہ ناچیز سیفی سرونجی ہند اور بیرون ہند کے بے شمار سیمیناروں میں اور ساہتیہ اکاڈمی کے کئی عالمی سیمیناروں میں شرکت کر چکا ہے۔ البتہ جب بھوپال بلایا گیا تو آپ جیسی شخصیات کو گوارا نہ ہوا۔ مدیر محترم کا یہ کہنا کہ نارنگ صاحب نے سینئر شعرا اور ادبا، کو چھوڑ کر ایک جونیئر کو کیوں بلایا، کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ آپ ہی کے شہر کے ایک نوجوان شاعر منظر بھوپالی نے آج اردو دنیا میں عالمی مشاعروں کے ذریعہ پہچان بنائی اور استاد شاعر بدھوارہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ نے تمام دنیا میں اپنے اخبار میں یہ احتجاج کیوں نہیں کیا کہ آپ سینئر شعرا، کو چھوڑ کر ایک نوجوان شاعر کو مشاعرہ میں کیوں بلاتے ہیں۔ ادبی مقام کا یہ تعین جو آپ نے مقرر کیا ہے وہ آپ کو مبارک ہو کہ یہ آپ کا اپنا معیار ہے، کیا آپ اتنا بھی نہیں جانتے کہ کسی بھی ادبی مرتبہ کا تعین کبھی بھی جونیئر یا سینئر کے حساب سے نہیں بلکہ اس کے ادبی کاموں سے اور تخلیقی جواز سے طے ہوتا ہے، کہیں آپ ان سینئر شعرا، کی بات تو نہیں کر رہے ہیں جو ہر وقت بیاض ہاتھ میں لیے مشاعرہ گاہ کے آس پاس گھومتے رہتے ہیں۔ اگر احتجاج کر کے آپ کی طرح اخباروں میں اعلان کر کے ادبی مقام حاصل کیا جا سکتا ہے تو آپ جیسے نام نہاد صحافی نہیں وہ بلند درجہ کے شاعر اور ادیب ہوتے بہر حال یہ بحث الگ ہے۔

یہ بات آں جناب نے خوب لکھی ہے کہ چوبیس اگست کو ساہتیہ اکاڈمی کا پروگرام ہوا اور ستائیس اگست یعنی تیسرے دن مباحثہ سرونج میں طے پا گیا تو یہ بھی آپ کی لاعلمی کا ایک پہلو ہے، اس لیے کہ اس پروگرام کی تاریخ پورے ایک ماہ پہلے محمد ایوب واقف صاحب اور اہل بھوپال سے طے کی جا چکی تھی اور نارنگ صاحب کی کتاب بھی ان کے بھوپال آنے سے ایک ماہ پہلے آ چکی تھی، دراصل مدیر محترم کے پاس جب کتاب آتی ہے تب وہ سمجھتے ہیں کہ دوسروں کے پاس بھی اب آئی ہوگی، یعنی وہ اپنے قد سے دوسروں کا قد ناپتے ہیں، ایسا یقیناً ہو سکتا ہے۔ اگر وہ پندرہ بیس سال اور اخبار نکالتے رہے، اگر آپ پہلے سے ساہتیہ اکاڈمی کی اس کوتاہی کی طرف اشارہ کرتے تو یقیناً اقبال مجید صاحب کو چھوڑ کر آپ کو افسانہ پڑھنے کے لیے بلایا جاتا، خیر اب بھی کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ آخر بشیر بدر صاحب نے بھی آپ کو انہیں کوششوں سے بلایا تھا۔ تیسری لاعلمی آپ کی گیان چند کی کتاب سے متعلق ہے، یہ کتاب بھی سب سے پہلے میرے پاس آئی تھی۔

مجھے مدیر محترم کی لاعلمی پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ لکھ رہے ہیں گیان چند جین کی کتاب پر سب سے پہلے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے مضمون لکھا ہے جبکہ فاروقی صاحب کے مضمون سے دو ماہ پہلے انتساب میں مضمون شائع ہو چکا تھا اور بعد میں تین قسطیں شائع ہوئی تھیں۔ بلکہ پورے ڈیڑھ سو صفحات کی کتاب میں لکھ چکا تھا اور پہلی قسط ہی نہایت مفصل اور میرے نزدیک مدلل تھی لیکن مدیر محترم کی نظر سے نہیں گزری، بعد میں جس کا اعتراف خود شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اپنے ایک خط میں کیا ہے اور صدائے اردو کے مدیر محترم کی معلومات کے لیے یہ بھی عرض کردوں کہ میں نے باقی قسطیں یا کتاب چھاپنے کا ارادہ کسی دباؤ میں آکر ملتوی نہیں کیا بلکہ فاروقی صاحب کے احترام میں کیا ہے کہ ان کے مدلل مضمون کے بعد اب کسی تبصرے یا مضمون کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے جامع انداز میں ہر بات کا منہ توڑ جواب دیدیا، رہا میرے مضمون کے نہ پڑھنے کی بات تو اس سلسلے میں فاروقی صاحب کی مصروفیات ہمیشہ مانع رہتی ہیں کہ وہ ایسے موقعوں پر بڑے بڑوں کو نظر انداز کردیتے ہیں، ہم کیا چیز ہیں۔ آج سے کئی سال پہلے ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کی کتاب ہندی ہندوی پر ایک نظم شائع ہوئی تھی جس کے ایک مضمون میں امرت رائے کی کتاب A House Divided کا مدلل جواب تھا جو کتاب میں شامل ہونے سے پہلے ہماری زبان میں بھی دو بار دو موقعوں پر شائع ہو چکا تھا لیکن فاروقی صاحب نے جب اس موضوع پر لکھا تو کہیں سحر صاحب کے مضمون کا حوالہ نہیں تھا، جب انتساب میں تبصرہ کرتے ہوئے اشارہ کیا گیا تو فاروقی صاحب نے اپنے ایک خط میں اعتراف کیا۔

برادرم سیفی سرونجی ، سلام

آپ نے برادر مکرم پروفیسر ابو محمد سحر کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے بالکل درست لکھا ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں اردو ہندی کے مسئلے سے متعلق بعض حقائق میری کتاب اردو کا ابتدائی زمانہ کے شائع ہونے سے بہت پہلے اپنی تحریروں میں بیان کردیے تھے،کوئی شک نہیں کہ بعض باتوں میں ان کو اولیت حاصل ہے، میری کوتاہی اور لاعلمی تھی کہ میں نے ان کا مضمون اس وقت پڑھا جب وہ اولاً شائع ہوا تھا اور کتاب میں نے تب دیکھی جب میری کتاب چھپ چکی تھی، میں نے اپنی کتاب کے انگریزی روپ جو زیر طبع ہے ابو محمد سحر صاحب کو مناسب خراج عقیدت پیش کردیا ہے، میری کتاب کا زیر بحث حصہ شب خون میں چھپ چکا تھا لیکن ابو محمد سحر صاحب کی بے نیازی دیکھئے کہ انہوں نے اس وقت مجھے متوجہ نہ کیا کہ تم میری کتاب تو دیکھ لو، اب کتاب ملنے پر میں نے ان سے احتجاج کیا تو اس پر درویش نے کہا کوئی بات نہیں آپ مناسب موقع پر اعتراف کردیں۔ اعتذار غیر ضروری ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔

یہ ایک بڑے آدمی کا بڑا اعتراف ہے، اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے میرے ناقص مضمون کے بارے میں اوّلیت کا اعتراف کیا ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان کا دوسرا خط توفیق صاحب کے نام ہے، اس میں بھی لکھا ہے، وہ بھی پیش خدمت ہے۔

۲۸ / اگست، برادرم جناب محمد توفیق خاں سلام علیکم

آپ کا خط ملا شکریہ، برادرم سیفی سرونجی کے مضمون کی نقل بھی مل گئی تھی اور بعد میں انتساب کا ایک شمارہ بھی ملا، جس میں اور چیزوں کے ساتھ ساتھ سیفی صاحب کا مضمون بھی تھا، ان تمام کرم فرمائیوں کے لیے آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ آپ یقین فرمائیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پرچہ مجھے اسی وقت ملتا ہے جب میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ پرچہ نہیں ملا، سیفی صاحب کو تو مبارکباد دیجئے کہ انھوں نے گیان چند کا جواب اس قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ مکمل کتاب بھی جلد شائع ہو جائے گی۔
شمس الرحمٰن فاروقی۔

ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ بڑی شخصیت کی بات دور تک پہنچتی ہے، اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ میری نظر میں اولیت کوئی معنی نہیں رکھتی، اس لیے کہ اس کتاب پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے فاروقی صاحب کی تحریر کے آگے ماند ہے۔ اب آیئے نارنگ صاحب کی کتاب اردو زبان اور لسانیات کے سلسلے میں آپ نے فرمایا ہے کہ یہ تمام مضامین بیس سال پرانے ہیں، سچ ہے، ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ پرانے مضامین ہیں، نہ کتاب میں اس کا اظہار موجود ہے نہ دیباچے میں، یہ تو صرف آپ ہی جانتے تھے۔ اب ذرا یہ بھی بتا دیں کہ مباحثہ میں شرکت کرنے والے کس شخص نے یہ کہا ہے کہ یہ مضامین نئے ہیں، ہاں کتاب ضرور نئی ہے، اس لیے سرونج میں نہیں، انتساب میں ہی نہیں اردو دنیا کے تمام رسالوں، اخباروں میں یہ اعلان درج ہے۔ نارنگ صاحب کی یہ تازہ علمی کتاب ہے۔ کیا یہ بات مدیر محترم کے ذرا سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک طرف گیان چند کی اردو کے خلاف زہر اگلنے والی کتاب آئی، دوسری طرف نارنگ صاحب کی اردو کی حمایت میں کتاب آئی اور جس کے ایک ایک لفظ سے اردو سے محبت عیاں ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ گیان چند جین کی کتاب نئی ہے تو یہ آپ کی لاعلمی کا ایک اور ثبوت ہوگا، اس لیے کہ گیان چند کی یہ تحریر بھی بالکل نئی نہیں ہے۔ لیکن ان میں ہمت نہیں تھی کہ کتابی شکل میں بطور اتمام حجت شائع کر سکیں۔ اس سے پہلے بھی وہ اردو کے خلاف لکھ چکے ہیں۔ اگر آپ کو نہیں معلوم تو شاعر کے ایڈیٹر افتخار امام سے پوچھیے اور بھی بہت سے پڑھے لکھے حضرات کو معلوم ہے۔ کتاب یہ بھی نئی ہے، کتاب وہ بھی نئی ہے۔ ایک اردو کے خلاف ہے، ایک اردو کی حمایت میں۔ اس ماحول میں مشاہیر نے نارنگ صاحب کی کتاب کی اہمیت پر مباحثہ منعقد کیا تو کیا بُرا کیا؟

اگر ایسی کتابوں پر بھی خاموشی اختیار کی تو پھر سمجھ لیجئے کہ آپ تمام عمر اپنے اخبار میں ہمیشہ کی طرح یہ اعلان کرتے رہیں گے اردو گھروں سے جا رہی ہے، اردو پڑھیے۔ مدیر محترم نے مباحثہ میں شرکاء کی ایک ایک لائن حاشیہ میں دی ہے اور دونوں کتابوں کا پس منظر جانے بغیر ان لائنوں کو پیش کیا گیا ہے جو انہیں ناگوار لگا، جبکہ دوسرا پہلو دیکھا ہی نہیں، اب دوسرا پہلو یہ دیکھئے، اس مباحثہ کی لائن:

''اپنی حالیہ کتاب اردو زبان اور لسانیات سے دو پیراگراف پڑھ کر سنائے،

انہیں سُن کر اور سمجھ کر بہت سے لوگوں کے ذہن صاف ہو گئے۔''

اعتراضات کرنے والے تو سیکڑوں مل جائیں گے لیکن کسی نے ایسا عملی کام انجام دینے کی جرأت نہیں کی نہ کسی اردو ادیب کو یہ نصیب ہوا کہ وہ اردو کی بقا کے لیے اردو کے ماحول کو سازگار بنانے کے لیے یا اردو پر بُرا وقت آنے پر کوئی عملی قدم اٹھاتا۔

وہ اتنے ہی صاف ذہن انسان ہیں، اردو والے بے شک ان کی ذات پر فخر کر سکتے ہیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ کسی کتاب کو ان کے نام معنون کر کے انہیں یا ان کے کام کو Exploit نہیں کیا جا سکتا۔

آپ نے ڈاکٹر گیان چند جین صاحب کی مذکورہ کتاب کا اگرچہ براہِ راست جواب نہیں دیا ہے لیکن ان کی تازہ مطبوعہ کتاب اردو زبان اور لسانیات میں آپ کے چوبیس مضامین ہیں، ان میں آپ نے مدلل طور پر ان سب کا جواب دے دیا ہے۔ مذکورہ کتاب کا دیباچہ پوری کتاب کی روح ہے۔ اسی طرح کی دوسری سطریں میں بھی پیش کر سکتا ہوں، علاوہ ازیں آپ گیان چند صاحب کی کتاب کے متعلق سارے جوابات گوپی چند نارنگ سے کیوں مانگ رہے ہیں۔ گیان چند جین سے ہی پوچھیے، صرف کتاب نارنگ صاحب کے نام منسوب کرنے سے وہ اردو کے دشمن ہو گئے اور وہ سارے اردو والے اردو کے خدمت گار ہو گئے جنہیں کبھی اردو کی کتابیں رسالے خرید کر پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ مدیر محترم نے اپنے پورے تبصرے میں اہل سرونج خصوصاً ابو محمد سحر مرحوم کے شاگردوں پر طنز کیا ہے۔

آخر میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اخبار کی صحافت میں اور ادبی صحافت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اپنے اخبار کو مشہور اور مقبول بنانے کے لئے سنسنی خیز خبریں شائع کی جاتی ہیں جن میں فتویٰ جاری کیا جاتا ہے، تاکہ لوگ چونکتے رہیں اور ہر شخص پر کیچڑ اچھالی جائے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اخبار پڑھیں لیکن اس طرح کے سوال جواب اور بے مقصد بحث کے لیے نہ ہمارے پاس وقت ہے نہ صفحات ضائع کرنے کے لیے فضول سرمایہ۔ ☆☆

نوٹ:- رسالہ پریس میں جانے ہی والا تھا کہ انور شیخ کے انتقال کی خبر آ گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون، اب اُن کا باب ہی بند ہو گیا، اب تو صرف ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

صفدر امام قادری

غضنفر کی افسانوی دنیا

غضنفر اردو کے اُن تخلیق کاروں میں سرفہرست ہیں جن کے لکھنے کی رفتار تیز تر ہے۔'پانی' کی ۱۹۸۹ء میں اشاعت سے اُن کے تخلیقی سلسلے پر توجہ دیں تو معلوم ہوگا کہ گزشتہ سولہ برسوں میں انھوں نے سات ناول پیش کیے۔ افسانے، تنقید، خاکے اور تدریس کے تعلق سے اُن کی تحریریں اس سے الگ ہیں۔ پانی سے تقریباً دو دہائی قبل سے وہ شاعری کے کوچے کی سیاحی میں بھی مبتلا ہیں اور اب بھی متواتر غزلیں اور نظمیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ خدا نے انہیں جو تخلیقی قوت عطا کی، اس کے استعمال میں غضنفر نے بخل سے کام نہیں لیا اور خاصے فیضانہ انداز میں انہوں نے اظہار کی باہیں پھیلائیں۔ شاعری میں اسے قدرت کلام کہتے ہیں جسے آپ غضنفر کی تخلیقی شخصیت کا سب سے بڑا عنصر تصور کر سکتے ہیں۔

لگا تار ناولوں کی اشاعت نے معاصر تخلیقی فضا میں غضنفر کو ایک معتبر ناول نگار کے بہ طور ملک گیر شناخت عطا کی ہے۔ اس دوران اُن کے افسانے وقفے وقفے سے شائع ہوتے رہے۔ ناول نگاری سے قبل بھی ان کے افسانے شائع ہوتے رہے۔ افسانہ نگار کا ناول کی طرف متوجہ ہو جانا اور ناول نگار کا افسانوی دنیا کی طرف آجانا ایک عام بات ہے لیکن غضنفر کے حوالے سے یہ خاص بات اس طور پر بن گئی کہ انھوں نے اپنی نول نگار شخصیت کے اُبھرنے کے لیے جتنی مستعدی دکھائی، اسی قدر افسانہ نگار اور شاعر کے تئیں بے اعتنائی بھی برتی۔ جس شخص کے سات ناول شائع ہو چکے ہوں، اس کے افسانوں کی ایک جلد منظر عام پر نہیں آئے، یہ تعجب کی بات ہے۔ خدا خدا کر کے غضنفر نے اپنے ۳۳/افسانوں کو'حیرت فروش' کے نام سے شائع کرادیا۔ امید کی جانی چاہیے کہ شاعری کی بھی جلد بند اشاعت جلد ہی ممکن ہوگی۔

غضنفر کو عام طور پر ایک نثر نگار کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے، جسے افسانوی نثر میں استعاراتی اور علامتی زبان کے ساتھ ساتھ مختلف انداز کے اسلوبیاتی خاکے تیار کرنے کا ہنر آتا ہو۔ ان کے ناولوں میں ایک شاعرانہ لے اُبھرتی ہے جسے کم از کم انشا پردازانہ تو کہا ہی جانا چاہیے۔ یہ بحث کسی اگلی صحبت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں کہ نثر میں شاعری کے لوازم کی شمولیت کس حد تک مناسب ہے، بس اس سچائی کو نظر میں رکھیں کہ غضنفر کا یہ ایک بڑا تخلیقی حربہ ہے کہ وہ اپنے فکشن کو شاعرانہ عناصر اور انشا پردازانہ

متعلقات سے آراستہ کرتے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں میں اس انشاپردازانہ جوہر کا اطلاق صرف منظر نگاری کے حوالے سے سامنے آتا ہے اور قرۃ العین حیدر کے ہاں ماضی کی یادوں میں نثر جمالیاتی رنگ لیتے ہوئے شاعرانہ فضا خلق کرتی ہے۔ زاہدہ حنا کے افسانوں میں یہ شاعرانہ فضا تیز رو مثنویوں کی طرح ابتدا سے آخر تک ہے اور حسین الحق کے فکشن میں شاعری اپنی زبردست اشاراتی وجود قائم کرتی ہوئی ملتی ہے۔ شاعری اور انشا پردازی کے امکانات نثر میں تلاش کرنے والوں کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گننے میں بھی پوری نہیں ہوتی۔ مقابلہ مقصود نہیں لیکن غضنفر کے فکشن میں انشاپردازانہ جوہر یا شاعرانہ ٹکڑے دوسرے لکھنے والوں کی طرح فکشن کو مصنوعی نہیں بناتے۔ حد تو یہ ہے کہ جہاں یہ شاعری الگ سے آزادانہ وجود کے طور پر اُن کی تخلیقات میں موجود ہے وہاں بھی وہ نثر اور قصے کے بنیادی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر اپنا فریضہ ادا کرتی ہے۔ مجھے محمد حسین آزاد کی یاد آتی ہے جن کی شاعرانہ نثر کا چرچا تو بہت ہے لیکن جب اُن کی تخلیقات کے متن میں اس عنصر کو تلاش کیجیے تو ایسا معلوم ہوگا کہ کتاب میں سادہ سے لفظ، ہندوی آہنگ اور مقدور بھر نثریت کے جوہر نمایاں ہیں۔ شاعری یا آزادنہ طور پر انشا پردازی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ملے گی لیکن مکمل متن کا اثر ایک جادو نگار شاعر کی طرح قائم ہوتا ہے۔ غالب اسے سادگی میں پُرکاری کہتے تھے اور بے خودی کے ساتھ ہوشیاری کی کیفیت بتاتے تھے۔ غضنفر کی افسانوی نثر کا بنیادی مزاج یہی ہے اس میں تمام شاعرانہ جوہر اور انشاپردازانہ حربے تیرتے چلتے ہیں۔ لیکن ان کے علاحدہ وجود یا آزادانہ پہچان کی ساری کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، یہ ایسی شاعری ہے جو نثر کے شہسوار کے قدموں میں پڑی رہتی ہے اور اپنا تازہ خون دے کر موجودہ عہد کے فکشن کی سب سے پُر اثر روشن، چمکدار اور زندہ نثر پیدا کرتی ہے جسے غضنفر اپنے فکشن میں استعمال کر رہے ہیں۔

غضنفر کے فکشن کے موضوعات پر توجہ دیں تو کبھی کبھی حیرت ہوگی کہ وہ اپنے عہد کے اُن تمام مسائل سے نبرد آزما ہیں جو اُن کے عہد میں رونما ہو رہے ہیں۔ ''فسوں'' اور ''وش منتھن'' کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ فرقہ واریت اور مذہبی اعتبار سے بکھراؤ کے عمل میں ملک کن نفسیاتی تبدیلیوں سے دوچار ہے، ان پر غضنفر کی گہری نظر ہے، سیاست اور معیشت کے منچ پر جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں اُن کی بنیاد، نفسیاتی سطح پر اور زیادہ گہری ہے۔ اسے سرسری طور پر سمجھنا خطرناک بات ہے۔ یوں بھی سماجی ماہرین نے فرقہ واریت کی بدلتی شکلوں پر بڑی باریکی سے نگاہ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ ١٩ویں صدی کے نوجاگرن، جنگ آزادی کے دوران ہندو مسلم کشاکش، ٧-١٩٤٦ء اور اس کے بعد کے فرقہ وارانہ فسادات اور ١٩٩٢ء میں بابری مسجد کے انہدام کے احوال پر توجہ دیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ ہر موڑ پر فرقہ واریت ایک بدلتی ہوئی شکل کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔ غضنفر فرقہ

واریت کو نہ سرسری طور پر دیکھتے ہیں اور نہ ہی ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح کوئی اسٹیریو ٹائپ خلق کر کے قانع ہو جاتے ہیں۔ اُن کا نقطۂ نظر بدلتی ہوئی فرقہ وارانہ صورتِ حال کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں سے جوجھنے میں قائم ہوا ہے۔ یہاں مختلف رنگ ابھرتے ہیں۔ غضنفر کے اسلوب یا پیشکش میں جتنی سادگی دکھائی دیتی ہے بالکل اس کے برعکس موضوعاتی سطح پر وہ پیچ در پیچ مسائل سے ہمیں آشنا کراتے ہیں۔ مذکورہ دونوں ناولوں کے ساتھ ساتھ اُن کے تین افسانوں ''خالد کا ختنہ''، ''ملبے پر کھڑی عمارت'' اور ''تانا بانا'' پر غور کرلیں تو محسوس ہوگا کہ وہ پرانے افسانہ نگاروں سے کس حد تک مختلف ہیں۔ ''تانا بانا'' اور ''ملبے پر کھڑی عمارت'' میں صراحت ہے اور ذاتی طور پر غضنفر کے نمائندہ اسلوب کو میں اشاراتی سمجھتا ہوں، اس لیے دونوں افسانوں سے قطع نظر تیسرے افسانے ''خالد کا ختنہ'' پر مختصراً گفتگو کرنا چاہوں گا۔

ناولوں کی بھیڑ میں غضنفر کے جن چند افسانوں نے انھیں افسانہ نگار کے بہ طور واضح شناخت دی اُن میں ''خالد کا ختنہ'' سرفہرست ہے۔ یہ افسانہ اردو، ہندی کے کئی رسائل کی زینت بنا اور سراہا گیا ہے۔ اگر ادب کو زندگی کی ہمہ گیر ترجمانی کہتے ہیں تو یہ تقاضا بھی فرض ہے کہ زندگی کی اہم اور غیر اہم تمام صورت حال لکھنے والے کے پیش نظر ہو۔ سعادت حسن منٹو جیسے افسانہ نگار کے ذہن میں بھی یہ موضوع نہیں آسکا۔ Subalternism یا عام زندگیوں کی شناخت کے اس دور میں شاہوں اور عزت مآبوں سے پَرے بھی نگاہ جانی چاہیے۔ طوائفوں کے کوٹھوں تک تو ترقی پسند افسانہ نگار پہنچے اور وہاں انسانی چہرے تلاش کرنے میں کامیاب رہے لیکن ''ختنے'' کی محفل تک آنے میں اُن کا اشرافیہ مزاج رکاوٹ بن گیا۔

غضنفر کے اس افسانے کا ماحول کسی قلاّش یا بھوکے ننگے کے گھر کا نہیں ہے، یہاں بھی عرب والے ماموں ممانی اور پاکستان والے خالہ خالو ہیں۔ اہتمامات بتاتے ہیں کہ یہ ختنہ واقعتاً شادی کی طرح تقریباتی ہے۔ چار صفحے کے مختصر سے افسانے میں سوا صفحہ تو ماحول سازی میں نکل گیا۔ اچھی خاصی تیاریاں ہیں، یہ موقع شادی کا بھی ہے، اسے ظاہر کرنے میں ابتدائی حصہ پورا کیا گیا ہے۔ پھر خالد گم ہو جاتا ہے، اس کی تلاش، اس کی طرف سے ختنہ نہیں کرانے کی بات، بعدہٗ اُسے رضامند کرنے کی کوشش جیسی سرگرمیوں میں اس مختصر افسانے کے دو صفحات نکل گئے، کہنا یہ ہے کہ افسانے کا اسّی فیصد حصہ پڑھا جاچکا ہے لیکن یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ اسے کیوں لکھا گیا ہے۔ مجھے ''عیدگاہ'' کی یاد آتی ہے کہ افسانے کا تین حصہ تو میلے ٹھیلے کی کہانی معلوم ہوتا لیکن جیسے ہی حامد چمٹا خریدتا ہے، اس کی شخصیت میں انقلابی تبدیلی رونما ہوتی ہے اور وہ ناتواں، بے کس حامد میلے سے واپسی میں پریم چند کی

کہانی کو عظمت کے ستارے عطا کر دیتا ہے۔

غضنفر کے افسانے میں ساری منظر کشی، پیش بندی اور ننھے دولہے کی تلاش، منت سماجت اور ختنہ کرا لینے کی لیے دباؤ سے جو تصویر قائم ہوتی ہے اُسے ختنہ نہیں کرانے کی وجہ بیان کرنے میں خالد ایک فقرے میں مسمار کر دیتا ہے، حامد ہی کی طرح خالد بھی چھوٹا سا بچہ ہے اور زندگی یا زمانے کی پیچیدگیوں سے ناواقف۔ اسی لیے کمال سادگی سے اس نے اپنے والد کے کسی خاص لمحے میں ادا کیے گئے جملے کو ادا کرتے ہوئے کیسا معصومانہ جواب دیا---" ابو آپ ہی نے تو ایک دن کہا تھا کہ جن کا ختنہ ہوتا ہے، بدمعاش انھیں جان سے مار دیتے ہیں۔" یہ افسانہ کہاں سادہ سی تقریب یا ایک سنت کی ادائیگی تک محدود دکھائی دے رہا تھا لیکن خالد کے ایک جملے نے حامد کے چمٹے کی طرح کام کیا اور ہندوستانی سماج کا سیاسی ارتقا اپنی تمام بداعمالیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آ گیا۔

غضنفر پڑھنے والوں کو اس جھٹکے پر نہیں چھوڑتے، منٹو کے افسانے "کھول دو" میں ایک کلائمکس تو سکینہ کے ازار بند کھولنے سے قائم ہوا لیکن اس کے باپ عبداللہ نے جب خوشی کے ساتھ یہ کہا، " آہا، میری بیٹی زندہ ہے" تو ایک سفاک کلائمکس اور سامنے آتا ہے۔ غضنفر خالد کے جملے کے بعد پاکستان والے خالو کے ذریعے ایک اور جملہ ادا کراتے ہیں، یہاں زندگی کا ایک دوسرا المیہ پھر سے ہمارے سامنے کھڑا ہے، ملاحظہ کیجئے۔ خالو جان نے خالد کو کس اپنائیت سے سمجھایا ہے" خالد بیٹے! اگر تم ختنہ نہیں کراؤ گے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ تمہارا ختنہ نہ دیکھ کر تمہیں ختنہ والے بدمعاش مار ڈالیں گے۔" اس بات پر خالد ختنہ کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ غضنفر چاہتے تو خالد کی رضامندی پر ہی افسانہ کو ختم کر سکتے تھے لیکن .. یہاں اشاراتی زبان میں معنوی گُہر ڈالنے کا اُن کا مخصوص حربہ انتہائی موثر انداز سے کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ واقعہ طرازی، ماحول سازی، قصے کو آگے بڑھانے کی فکر، انجام اور افسانہ نگار کا نجی تاثر اتنے سارے کام اب بھی باقی ہیں لیکن غضنفر کے پاس چھ سات مختصر جملوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ خالد کے سر پر سہرا نہیں بندھا، کسی نے اُسے نئے کپڑے نہیں پہنائے، نائی کے تھال میں پیسے نہیں گرے، ختنہ ہوتا ہے، لیکن ماحول ایسا بدل چکا ہے کہ افسانے کا آخری حصہ سوز کی گہرائیوں سے اس طرح مکمل ہوتا ہے۔" خاموشی سے اس نے مسلمانی میں راکھ بھری، کمانی فٹ کی، چمٹے میں چمڑے کو کسا اور اس پر لرزتا ہوا استرا رکھ دیا، جیسے ختنہ نہیں گردن کاٹنے جا رہا ہو۔"

...... نے مختصر پڑھ کر رُلا دینے کو فنکاری بتایا تھا، " خالد کا ختنہ" میں غضنفر نے یہی ہنر آزمایا ہے، علم، فکر جب اصول کا اعتبار حاصل کرتے ہیں تو ایسے جملے خلق ہوتے ہیں جن میں مذہبی کتابوں کی

باقی صفحہ ۲۸ پر.....

سلطانہ مہر
کیلی فورنیا، امریکہ

شام کا پہلا اور صبح کا آخری تارہ - احمد ندیم قاسمی

یہ سن ۲۰۰۰ء کی بات ہے جب میری ملاقات احمد ندیم قاسمی صاحب سے ہوئی تھی۔ میں نے اپنی کتاب کے لیے ان سے انٹرویو لیا۔ اس ملاقات میں جرائد، افسانے اور ادب کے موضوعات کے علاوہ میں نے ترقی پسند تحریک کے حوالے سے بھی ان سے گفتگو کی۔ عکس تحریر کے طور پر انہوں نے ایک شعر بھی لکھ کر دیا۔

نہ ملے زہر تو اپنا ہی لہو پیتے ہیں
جام خالی نہیں رہتے کبھی سقراطوں کے

پھر ۲۰۰۴ء میں ان سے میری ملاقات آخری ثابت ہوئی۔ میں لاہور گئی تھی، منصور احمد نے مجھے اپنا مجموعہ کلام ''طلوع'' دیا اور میں نے اپنی دو کتابوں سخنور پنجم (شعرا کا تذکرہ) اور گفتنی دوم (نثر نگاروں کا تذکرہ) قاسمی صاحب کی نذر کیا۔ جاوید صاحب نے اپنے افسانوں کا مجموعہ ''حرفِ دعا'' ان کی خدمت میں پیش کیا۔ ان دنوں وہ بیمار تھے۔ مگر بیماری کو انہوں نے خود پر طاری ہونے نہیں دیا۔ دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ گو دورانِ گفتگو انہیں کھانسی بھی ہوتی رہی مگر وہ خود کو سنبھالے رہے۔ ان سے رخصت ہونے کے بعد میں نے کئی بار ان کے بارے میں سوچا اور خدا سے دعا کی کہ وہ صحت یاب رہیں اور ادب کے ایک چھتنا ور درخت کا سایہ دیر تک سلامت رہے۔

لیکن ۱۰ر جولائی ۲۰۰۶ء کا دن ان کی زندگی کا آخری دن ثابت ہوا اور ان کے رخصت ہونے کی خبر آگئی۔ اس کے باوجود موت کے ظالم پنجے بھی انہیں ان کے چاہنے والوں سے دور نہیں کر سکے۔ وہ اب بھی ہمارے دلوں میں آباد ہیں۔ ہماری فکر میں رچے بسے ہیں۔

ان سے گفتگو درج ذیل ہے۔

'' کچھ لوگ جو نثر اور نظم دونوں لکھتے ہیں اس کے شاکی رہا کرتے ہیں کہ جب نثر لکھنے والوں کا ذکر ہوتا ہے تو لوگ انہیں شاعر کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور جب تذکرہ شعرا کا ہوتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ تو نثر لکھتا ہے۔ لیکن احمد ندیم قاسمی کی شخصیت ایسی ہے کہ دونوں طبقے انہیں سر

آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔ وہ اس عہد میں اردو کے چند سب سے بڑے افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں اور بحیثیت شاعر بھی ایک اعلیٰ اور منفرد مقام کے مالک ہیں۔

ان کا پیدائشی نام احمد شاہ ہے۔ قاسمی خاندانی لقب ہے اور ندیم تخلص رکھا ہے۔ یوں احمد ندیم قاسمی بنے اور قاسمی ہو گئے۔ ۲۰ رنومبر ۱۹۱۶ء کو سرگودھا کے ایک گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کے تھے کہ والد کا سایہ اٹھ گیا۔ چچا پیر حیدر شاہ نے سر پر ہاتھ رکھا اور بیٹا بنا کر پرورش کی۔ وہ سول سروس میں تھے اور آئے دن تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ ندیم بھی جو ابتدائی تعلیم انگہ میں حاصل کر چکے تھے۔ کیمبل پور، شیخوپورہ اور بھاولپور میں تعلیم پاتے رہے۔ اس طرح ۱۹۳۵ء میں بی۔اے۔ کر لیا۔

بچپن ہی سے ان پر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی اور مطالعے کے انتخاب میں بڑوں کی پیروی کرتے تھے۔ یہ اسی سنجیدگی کا نتیجہ تھا کہ جب مولانا محمد علی کا انتقال ہوا تو انہوں نے اس موقع پر ایک نظم کہی جو لاہور کے مشہور روزنامہ ''سیاست'' میں پہلے صفحہ پر شائع ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ نظم دیکھ کر چچا نے بتایا کہ یہ عروض اور فن کے نقائص سے پاک ہے۔ اس نظم کے سلسلہ میں چچا کو متعدد تعریفی خطوط بھی موصول ہوئے۔ وہ نظم اب ان کے پاس نہیں ہے۔

مشہور ادیب محمد خالد اختر بھاولپوری کالج میں ان کے دوست تھے اور انگریزی ادب کے بڑے دلدادہ تھے، انہوں نے مشورہ دیا کہ نظم میں کیا رکھا ہے، نثر لکھو تب بات ہے۔ چنانچہ دوست کے کہنے سے ۱۹۳۴ء میں انہوں نے اپنا پہلا افسانہ لکھا جو اختر شیرانی کے ''رومان'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ غزلیں اور نظمیں بھی لکھتے رہے اور افسانے بھی۔ ''رومان'' میں دو تین افسانے شائع ہوئے تو سعادت حسن منٹو نے اختر شیرانی کو خط لکھا کہ یہ نوجوان کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے؟ اس کے افسانوں نے مجھے بڑا متاثر کیا ہے۔ اختر شیرانی نے وہ خط اٹھا کر انہیں بھیج دیا۔ انہوں نے منٹو کو جواب لکھا اور پھر خط و کتابت کا یہ سلسلہ سعادت حسن منٹو کی وفات تک جاری رہا۔ احمد ندیم قاسمی نے منٹو کے جو خطوط کتابی شکل میں شائع کیے ان میں یہ خط بھی شامل ہے۔

بی۔اے۔ کے بعد ندیم چار سال تلاش معاش میں مصروف رہے۔ ۱۹۳۹ء میں آب کاری کے محکمے میں سب انسپکٹر ہو گئے اور ملتان میں تقرر ہوا۔ ڈھائی تین سال تک یہ نوکری کی پھر استعفیٰ دے دیا۔ اس کی وجہ وہاں کا ماحول تھا جس میں جھوٹے مقدمے بنانا اور غریبوں کے گھروں پر چھاپے مارنا پڑتے تھے۔

ایکسائز کی نوکری سے مستعفی ہو کر وہ لاہور چلے آئے اور بچوں کے مشہور رسالے ''پھول'' اور ''تہذیبِ نسواں'' کے ایڈیٹر ہو گئے۔ پھر ''ادب لطیف'' کی ادارت بھی ان کے ہاتھ آ گئی۔ یہ سلسلہ

۱۹۴۶ء تک چلتا رہا۔ پھر وہ بیمار ہو کر گاؤں چلے گئے۔ کئی ماہ کی بیماری کے بعد جب اچھے ہوئے تو پشاور ریڈیو اسٹیشن میں اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ اس ملازمت کے دوران لاہور سے ''سویرا'' جاری ہوا۔ یہ پشاور میں بیٹھ کر اس کو مرتب کرتے رہے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں ہی ''نقوش'' جاری کیا۔ نقوش میں اور بھی حصے دار تھے۔ یہ دونوں یعنی احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور دو برس تک اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن ان کی پالیسی دوسرے حصہ داروں کو پسند نہ تھی۔ لہٰذا ۱۹۵۰ء کے آغاز میں انہوں نے نقوش چھوڑ دیا۔ ایک سال یونہی گزرا اور پھر ۱۹۵۱ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ احمد علی خان، حمید اختر، ظہیر کاشمیری، ظہیر بابر اور فیض احمد فیض وغیرہ سب ہی جیل میں تھے۔ چھ ماہ جیل میں رہنے کے بعد ۱۹۵۱ء کے آخر میں رہا ہوئے۔ پھر قریب ایک سال بے کاری میں گزرا۔ ۱۹۵۳ء یہ یہ روزنامہ ''امروز'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اپریل ۱۹۵۹ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

احمد ندیم قاسمی ان لوگوں میں سے ہیں جو خاموشی سے کام کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں کی تعداد سن کر وہ لوگ بھی چونک اٹھتے ہیں جو انہیں پڑھتے رہتے ہیں۔

''چوپال، طلوع وغروب، آنچل، آبلے، در و دیوار، آس پاس سناٹا، بازار حیات وغیرہ وغیرہ۔ یوں ان کے ۱۳ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں نو فقط افسانوں کے مجموعے، قطعات کا ایک مجموعہ، ''رم جھم'' کے نام سے اور غزلوں اور نظموں کے مجموعے'' جلال و جمال، شعلہ گل، دشت وفا اور محیط'' شائع ہو چکے ہیں۔'' کپاس کا پھول'' ان کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے جو چند سال قبل شائع ہوا۔

احمد ندیم قاسمی سے میں نے یہ سوال کیا کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ'' کہانی یا افسانے کی اب وہ مقبولیت نہیں رہی جو پہلے تھی۔'' اس کے جواب میں انہوں نے کہا:

> ''شکر ہے آپ نے یہ سوال پوچھا، ایک ادبی رسالے کے مدیر کی حیثیت سے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ 'فنون' کے کسی شمارے میں افسانوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے تو قارئین شکایت کرنے لگتے ہیں۔''

انہوں نے بڑے دوٹوک طریقے پر یہ بھی کہا کہ شکار کے قصوں اور اس نہج کے دوسرے مواد کو ادب نہیں کہا جا سکتا، نہ ہی یہ معلوماتی کہانیوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے ایک بڑی باریک بات بتائی، انہوں نے کہا کہ تنظیم اور تحریک میں بڑا فرق ہے۔ پاکستان میں ترقی پسند ادب کی تنظیم ختم ہو چکی ہے لیکن تحریک جاری ہے اور اب بھی اسی تیزی سے لکھا جا رہا ہے۔ فرق محض اتنا ہے کہ پہلے رسالوں میں اس کی نمائندگی اجتماعی طور پر ہوتی تھی اب نہیں ہوتی۔ انہوں نے کہا کہ ترقی پسند ادب کے سلسلہ میں بعض لوگوں نے جو لیبل لگا رکھے ہیں،

میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ اس سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو ادب کو ایک خاص سانچے میں ڈھال کر اسے ترقی پسندی کا نام دیتے ہیں۔ ادب کو مخصوص سانچوں میں نہیں ڈھالا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اس سے اتفاق کیا کہ شاعری میں اور اب تو افسانوں میں بھی ابہام داخل ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ قرار دی کہ تہذیبی اعتبار سے ہم ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے اپنے کلچر کے خطوط واضح شکل میں موجود نہیں ہیں۔ پرانی قدریں ختم ہو چکی ہیں یا شکستہ ہو چکی ہیں اور نئی قدروں کی تخلیق یا تشکیل میں بہت تاخیر ہو رہی ہے۔ یوں ایک ذہنی خلا پیدا ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارا نوجوان ادیب اور شاعر اپنی ذات میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ ابہام ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے بتایا کہ اسے ختم کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ نوجوان طبقے کے ذہن میں صحت مند مشرقی اقدار کا احساس اور احترام پیدا کیا جائے۔

انہوں نے کہا کہ مغربی تہذیب کی بعض قدروں سے محض اس بنا پر نفرت نہیں کرنا چاہیے کہ ان کا تعلق بدیسی تہذیب سے ہے۔ اگر جدید تہذیب کا متوازن امتزاج پیدا کیا جائے تو ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ویسے یہ کیفیت عارضی ہے۔

ادبی رسالوں کی زبوں حالی کے بارے میں انہوں نے کہا کہ:

"پاکستان میں صورتِ حال زیادہ دردناک اس وجہ سے ہے کہ یہاں محض فروخت کے بل پر کوئی رسالہ کامیابی کے ساتھ جاری نہیں رہ سکتا، مختلف قسم کی صنعتوں سے وابستہ ایسے لوگ جو ادبی ذوق وشوق رکھتے ہیں وہ عزت مندانہ سطح پر اشتہارات دے کر تعاون کریں تب ہی یہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں یہ خطرہ بھی ہے کہ وہ رسالوں پر نکتۂ نظر ٹھونسنے کی کوشش کریں گے۔ یہ بھی بڑی مخدوش بات ہے۔ ادبی پرچوں کو زندہ رکھنے کی ایک اور صورت بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ ادیبوں کے تعاون سے ایک انجمن بنائی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر کام کرے۔ لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ ادیبوں کی انا کی دھار بڑی تیز ہوتی ہے۔ امداد باہمی والے تعاون کے لیے بڑی قربانیاں درکار ہوں گی۔"

میں نے پوچھا کہ نئے ادیبوں اور شاعروں کے لیے آپ کے پاس کیا پیغام ہے؟ تو انہوں نے بڑی خوبصورت بات کہی، انہوں نے کہا:

"جب تک کرۂ ارض موجود ہے ہر شے میں حسن بھی ہے اور معنی بھی، جب انسان نہ رہے گا تو تاریکی اور ویرانی ہوگی، اس لیے نوجوان ادیب خواہ اپنی ذات کو ادب کا موضوع بنائیں یا کسی چیز کو لیکن اس بات کا ضرور خیال رہے کہ ان کی تحریر سے انسان میں ذہنی

تناسب، حسن اور خیر و برکت کا جذبہ پیدا ہو، یہی ترقی پسند ادب کی کسوٹی ہے۔''

احمد ندیم قاسمی آج کل لاہور میں ہیں، ماہنامہ ''فنون'' اب بھی ان کی زیر ادارت اسی آب و تاب سے نکل رہا ہے۔ قاسمی صاحب روزنامہ ''جنگ'' میں بھی ہفتہ وار کالم لکھ رہے ہیں۔

۲۰ رنومبر کو احمد ندیم قاسمی کا ۸۷ واں جنم دن مناتے ہوئے ظفر معین بلے نے طاہر نقوی کے بنائے ہوئے قاسمی صاحب کے پنسل اسکیچ کے ساتھ ایک کارڈ چھاپا ہے جس پر قاسمی صاحب کی تصویر کے اوپر ظفر معین بلے کا یہ شعر درج ہے۔

جئے ندیم ہزاروں برس کہ جس نے ظفر

مجھے شعور دیا، اعتبار بخشا ہے

اس کارڈ کے دوسری طرف لکھا ہے:

''اکیسویں صدی کا شاعر''

احمد ندیم قاسمی محض ایک شخصیت کا نام نہیں، وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ، ایک تحریک اور ایک دبستان بھی ہیں۔ ۸۷ سالہ زندگی میں انہوں نے جو فکری اور تخلیقی سفر طے کیا ہے اس کے انمٹ نقوش جادۂ ادب پر ثبت ہیں جو اس راستے کے مسافروں کی ہمیشہ رہنمائی کرتے رہیں گے۔

دعا ہے کہ ہمارے سروں پر یہ شاخ قائم و دائم رہے۔ (آمین)

کارڈ کے اندرونی حصے میں لکھا ہے:

''ادب دوستوں اور سخن فہموں کو، شعر و سخن کی آبرو اور اردو ادب کے مان احمد ندیم قاسمی کا ۸۷ واں جنم دن مبارک ہو۔ (ظفر معین بلے)''

دوسری طرف احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر تحریر ہے۔

رات کو روشن رکھنا میرا کام ندیم

شام کا پہلا صبح کا آخری تارا ہوں

(مجھے یہ کارڈ محترم شبنم رومانی کے پاس مل گیا اور میری گزارش پر انہوں نے مجھے عاریتاً دے دیا۔ شبنم صاحب کا بے حد شکریہ)

۱۹۹۷ء میں محترم شاعر امجد اسلام امجد کی زیر نگرانی اس صدی کے عظیم شاعر جناب احمد ندیم قاسمی کو خراجِ محبت اور خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک ویڈیو ترتیب دی گئی جسے شالیمار ریکارڈنگ اینڈ براڈ کاسٹنگ کمپنی لمیٹڈ پاکستان نے ویڈیو کیسٹ کی صورت دی ہے۔ قاسمی صاحب کی خوبصورت تصویر کے ساتھ امجد اسلام امجد کی تحریر و ہدایات اور شاعر گلزار کے نغموں سے سجا کر اسے

A tribute to living legend کا نام دیا گیا ہے۔

آخر میں مَیں محترم احمد ندیم قاسمی کی ایک نظم آپ کی خدمت میں ضرور پیش کرنا چاہوں گی جس کا عنوان ہے:

بھیک .....

تم گداگر کے گداگر ہی رہے
تم نے کشکول تہِ جامۂ بانات چھپا رکھا تھا
اور چہرے پہ انا تھی

جو ہمیشہ کی طرح جھوٹی تھی
وہ یہ کہتی ہوئی لگتی تھی کہ ہم بھیک نہیں مانگیں گے
یعنی مر جائیں گے لیکن کسی منعم کے درِ زر پہ نہ دستک دیں گے
یہ جو گرتے ہوئے سکوں کی کھنک چاروں طرف گونجی ہے
یہ شنیدہ ہے کئی برسوں کی
اور کشکول کا لہجہ بھی وہی ہے جو ہمیں از بر ہے
لاکھ انکار کرو، لاکھ بہانے ڈھونڈو
تم گداگر کے گداگر ہی رہے ☆☆

....صفحہ ۲۲ کا بقیہ

تاثر آفرینی اور اجمال آجائے۔ غضنفر اپنی نثر میں ایجاز کی اس بھٹی میں تپ کر ہمارے لیے تخلیقی بُت تراش رہے ہیں۔ لاکھ لوگ کہیں کہ فکشن صراحت کا فن ہے لیکن غضنفر کا بس چلے تو وہ شاعری سے بھی زیادہ ایجاز اور اجمال کو نثر کا تن بدن بخش دیں، اُن کا افسانہ ''خالد کا ختنہ'' اس کی ایک بہترین مثال ہے۔

اردو کے افسانوی منظرنامے پر ایسے ہنرمند زیادہ نہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی شخصیت کے ہزار ہا جوہر ہمارے سامنے اُبھار لیے ہوں۔ غضنفر کو بھی ابھی نہ جانے کتنے سنگ ہائے میل سر کرنے ہیں۔ ابھی فتوحات کی ابتدا ہے۔ مجھے وہ اس لیے پسند ہیں کہ اصناف کی روایتی حد بندیوں سے وہ واقف ہوتے ہوئے مختلف مقامات پر انھیں ضرور توڑتے ہیں۔ یہ بغاوت نئے انداز کی تلاش اور ہر لمحہ کچھ نیا پیش کرنے کا جذبہ قابلِ احترام ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو اردو فکشن میں انھیں لافانی مقام حاصل ہو کر رہے گا۔ ☆☆

رؤف خیر

تین مصرعوں کی نظمیں

گلوبلائزیشن کے اس دور میں ہر چیز سمٹی جارہی ہے۔ عدیم الفرصتی نے ناول کی جگہ افسانہ، افسانے کے بدل منی افسانے کو مقبولیت بخشی۔ اسی طرح مثنوی، قصیدہ، مسدس و مخمس پر مشتمل مرثیوں کی جگہ مختصر نظموں نے لے لی۔ پھر پابند نظم کی جگہ آزاد نظم و معریٰ نظم کا فروغ اسی سہل پسندی کا غماز ہے۔ قارئین وسامعین کے مذاق کے ساتھ ساتھ شعراء کے تساہل کا بھی اس میں دخل ہے۔ تجربات کے نام پر شعرائے کرام نے بھی اپنے ہنر دکھائے۔ رباعیات کی مخصوص بحروں میں جوہر دکھانا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے رباعی گو شعراء بہت کم گزرے ہیں۔ کچھ شعراء نے تو صرف تفنن طبع کے طور پر ہی رباعیات کہیں۔ البتہ بعض شعراء نے میدان رباعی کو اپنا کر اسے اپنی شناخت کا ذریعہ بنالیا جیسے امجد حیدرآبادی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، انیس و دبیر وغیرہ۔ بعض شعراء نے چار مصرعوں کے مخصوص بحور کی پابندی پر لاحول پڑھ کر قطعات کا اسلوب اپنالیا۔ چار مصرعوں پر مشتمل قطعات کہنے والوں نے قطعے کو رباعی کا ہم پلہ قرار دینے میں اہم حصہ ادا کیا۔ اختر انصاری، عبدالحمید عدم، نریش کمار شاد نے گویا اس صنف میں اپنے دل کی قاشیں رکھ دیں۔

رباعی یا قطعے کے چار مصرعوں میں بہر حال ردیف و قافیہ کی خوش آہنگی برقرار رکھی گئی۔ قافیہ و ردیف کے استعمال کا سلیقہ بھی قطعہ و رباعی کا وصف خاص ہے۔ لیکن بعض شعرائے کرام نے ایک سیڑھی نیچے اتر کر تین مصرعوں ہی کے دائرے میں خود کو محصور کرلیا اور تین مصرعوں میں بھی قافیہ و ردیف کا التزام نہ رکھا۔ البتہ زیادہ سے زیادہ آہنگ کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ دو مصرعوں میں دنیا رکھ دینا تو ہر اچھے غزل گو کو آتا ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے ایک سطری نظمیں لکھیں جن میں وزن کا اہتمام نہیں رکھا گیا۔ (ملاحظہ ہو ''پہلی کرن کا بوجھ'') اس کے برخلاف راقم الحروف (رؤف خیر) نے یک مصرعی نظمیں لکھیں جن میں بہر حال بحر و وزن کو ہاتھ سے جانے نہ دیا گیا اور ایک پورا خیال ایک مصرعہ میں بیان کردیا گیا۔ (ملاحظہ ہو شعری مجموعہ ''شہداب'' اور ''سخن ملتوی'')۔ بقول علامہ اقبال۔

مضمون او بہ مصرع برجستہ تمام
منت پذیر مصرع دیگر نمی شود

خود اس شعر میں پہلے ہی مصرعے میں خیال مکمل ہو چکا ہے۔

عوام و خواص کو بہر حال رباعیات و قطعات یاد ہیں اور برمحل و برموقع اشعار بلا تکلف استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہم نے کبھی تین مصرعوں کی نظمیں کسی کو سناتے نہیں سنا۔ حتیٰ کہ خود شاعر اپنی تین مصرعوں کی نظمیں کسی کو سناتے نہیں سنا۔ حتیٰ کہ خود شاعر اپنی تین مصرعوں کی نظمیں یاد نہیں رکھ پاتے (راہی شہابی کو تو اپنی لمبی لمبی پابند نظمیں تک یاد ہیں)۔ عوامی مقبولیت بہر حال ایک ادبی معیار سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں کو انیس کے مرثیوں کے بعض بند حالی کی مسدس "مدوجزر اسلام" کے بعض بند، علامہ اقبال کے "شکوہ و جواب شکوہ" کے بند یاد ہیں اور وہ مزے سے سناتے رہتے ہیں۔ اچھے شعر کی ایک خوبی یہ بھی تو ہے کہ وہ سننے والے کے دل میں ترازو ہو جائے اور حافظے میں محفوظ رہ جائے۔

تین مصرعوں میں اول اول قافیہ و ردیف کا شعوری اہتمام نہیں برتا جاتا تھا جیسے

مخمور جالندھری: گزرا تھا ابھی کون سڑک سے کہ ابھی تک
ہاتھوں میں ہے بنئے کے اسی طرح ترازو
درزی کی سوئی پہلے جہاں تھی ہے وہیں پر

☆

مغنی تبسم: کیا آج بھی کوئی دن ہے/کوئی تاریخ ہے/ یا خدا!

☆

کیدار ناتھ: یوں تو مرنا تھا ، مر گیا لیکن
مجھ کو افسوس صرف اتنا ہے
اس کو قسطوں میں موت آئی ہے

☆

پروین شاکر: اکیلے گھر میں/شریر چڑیا کا گیت/ چہرے اگا رہا ہے

☆

رؤف خیر: مجھے بچوں سے ایسی خاص دلچسپی نہیں تھی
مگر میں باپ جب خود بن چکا ہوں
تو ہر بچے پہ پیار آنے لگا ہے

ایسی بے شمار مختصر نظمیں کتب و رسائل میں مل جاتی ہیں لیکن بعض شعراء نے تین مصرعوں کو خاص افاعیل کے تحت قافیہ و ردیف کی پابندی کے ساتھ برت کر ایک خاص صنف کو اردو ادب کا حصہ

بنادیا۔ یہاں میں ایسی ہی اصناف سخن کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

مساوی الاوزان تین مصرعوں کی ایسی نظمیں جن میں ایک خاص خیال کو قافیہ و ردیف کی پابندی کے ساتھ پیش کیا گیا، حمایت علی شاعر نے بہت لکھیں۔ ان کا مجموعۂ کلام ''مٹی کا قرض'' پاک کتاب گھر اردو بازار کراچی پاکستان سے ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا جس میں چونتیس (۳۴) ثلاثیاں مختلف عنوانات کے تحت شامل ہیں جیسے:

(الہام)

کوئی تازہ شعر اے رب جلیل
ذہن کے غار حرا میں کب سے ہے
فکر محوِ انتظارِ جبرئیل

☆

(اسلوب)

کس طرح تراش کر سجائیں
نادیدہ خیال کے بدن پر
لفظوں کی سلی ہوئی قبائیں

☆

(زاویۂ نگاہ)

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نوازدے تو یہی خدا ہے

تین مصرعوں کی نظم پر باضابطہ عنوان لگا کر حمایت علی شاعر نے موضوعات کی حد بندی کر دی اور اسے ثلاثی کا نام دیا۔ اس کے برخلاف اورنگ آباد کے ایک جدید شاعر قمر اقبال نے تین مصرعوں کی نظموں کو ''تثلیثات'' کا نام دے کر ''تتلیاں'' ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔ یہ تثلیثات مختلف موضوعات پر تو ہیں لیکن ان پر عنوانات نہیں ہیں جیسے:

دو پڑوسی جو ملک ہوتے ہیں
ان کے بچھڑے ہوئے سبھی رشتے
سرحدوں سے لپٹ کے روتے ہیں

☆

روشنی کون کس کو دیتا ہے
شام ہوتی ہے جب تو سورج بھی

اپنی کرنیں سمیٹ لیتا ہے

☆

ساتھ رہ کر جدا سمجھتی ہے
چھین لوں جسم کا لباس ابھی
زندگی خود کو کیا سمجھتی ہے

☆

تھے عجب کرب و اضطراب میں ہم
خود کو لفظوں میں منتقل کر کے
سو گئے چین سے کتاب میں ہم

☆

یاد ہے وہ فساد کا منظر
رو رہی تھی گلی میں اک بچی
اپنی گڑیا کو گود میں لے کر

☆

روپ باتیں مزاج دیکھ لیا
اس کی تصویر ہم نے دیکھی تھی
اور اس کو بھی آج دیکھ لیا

مذکورہ مساوی الاوزان تثلیثات میں پہلے اور تیسرے مصرعے میں قافیہ وردیف کا التزام برتا گیا ہے درمیانی مصرع دونوں مصرعوں کے مابین ربط کو مضبوط و منضبط کرتا ہے۔ یہ مصرع بھرتی کا نہیں لگتا۔ یہی ان تثلیثات کی خوبی ہے کہ دو مصرعوں ہی میں اگر بات مکمل ہو پاتی تو ثلاثی لکھنے کی کیا ضرورت رہ جاتی۔ قمر اقبال نے ایک ہی بحر میں تمام تثلیثات کہہ ڈالی ہیں جب کہ حمایت علی شاعر کی ثلاثیوں میں بحروں کا تنوع پایا جاتا ہے۔ گویا ثلاثی کے لئے کسی خاص بحر یا مخصوص افاعیل کی پابندی لازمی نہیں۔ مختصر بحور اوزان میں بھی یہ لکھی جا سکتی ہیں۔ ہمارے بیشتر شعراء مزاج کی مناسبت سے غیر متداول بحور میں تجربے کرنے سے بچنے کی خاطر کسی ایک مترنم بحر ہی میں کھل کھیلتے ہیں۔ چنانچہ ان کا زیادہ تر کلام ایک ہی بحر میں ہوتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ قمر اقبال کی تثلیثات بھی یکسانیت کی شکار ہیں۔

میرٹ چھاؤنی کے دیپک قمر (ولادت ۲۶/اکتوبر ۱۹۴۳ء) کا مجموعہ "ہلے ہلارے" مئی

۱۹۹۱ء میں شائع ہوا جس کے پیش لفظ میں مدیر "شانِ ہند" شری سرور تونسوی نے اسے اردو ماہیوں کا پہلا مجموعہ قرار دیا۔ ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) صفحات پر مشتمل اور تقریباً ڈیڑھ ہزار (۱۴۸۹) ماہیوں پر مبنی یہ پورا مجموعہ تین ہم وزن مصرعوں کے ایسے ماہیوں سے عبارت ہے جن کا پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ و ردیف اور درمیانی مصرع بے قافیہ ہے۔ ان تمام ماہیوں کا وزن ہے۔

(مفعول مفاعیلن)۔ یہ ماہیے مختلف موضوعات پر لگاتار اور بے تکان، بے عنوان کہے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے دیپک قمر کی پرگوئی کی داد دینی چاہیے کہ انہوں نے تین مصرعوں کی اس صنف کو سنجیدگی سے اپنایا اور ایک پورا مجموعہ "بلے بلارے" اردو ادب کو دیا۔ ان کے چند ماہیے بلے بلارے کے حوالے سے پیش ہیں (اس سے پہلے بھی میں نے اپنے ایک مضمون "اردو ماہیے کے تین مصرعے" میں ان کا ذکر کیا تھا)۔

بیلوں سے بڑھی گوری / آنگن میں پھدکتی تھی / اب سیج چڑھی گوری

کیا آگ جلائے ہے / بھیگے ہوئے اپلے ہیں / چمنی ہے نہ چائے ہے

بھائی سے لڑے بھائی / یہ اپنے ہی پرکھوں سے / ہے ریت چلی آئی

آتے ہوئے دیکھا تھا / وہ بھیڑ میں یوں کھویا / گویا کہ چھلاوا تھا

فی صفحہ ایک درجن کے حساب سے مختلف موضوعات پر تین مساوی مصرعوں پر مشتمل ایک سو اٹھائیس صفحات کے "بلے بلارے" میں دیپک قمر اپنی ہمہ جہت فکر سے چونکاتے ہیں۔

ماہیے کے سلسلہ میں کافی بحث و تمحیص کے بعد نقادوں نے اس کے افاعیل کا تعین کیا ہے۔ ماہیے دراصل پنجابی لوک گیت ہے اور لوک گیت کا تعلق چونکہ عوام سے ہوتا ہے اس لئے کسی خاص وزن کی پابندی کی توقع عوام سے رکھنا زیادتی ہوگی۔ بس ایک خوش آہنگی کے سہارے یہ صنف چل پڑی۔ پنجابی سے اردو میں باضابطہ قدم رکھنے سے پہلے اس نے موسیقی سے تعلق استوار کر کے فلمی گیت کا روپ دھرا جیسے:

تم روٹھ کے مت جانا / مجھ سے کیا شکوہ / دیوانہ ہے دیوانہ

(قمر جلال آبادی فلم "پھاگن")

دل لے کر دغا دیں گے / یار ہیں مطلب کے / یہ دیں تو کیا دیں گے

(ساحر فلم "نیا دور")

ان ماہیوں میں پہلے اور تیسرے مصرعوں میں قافیہ و ردیف ہیں جب کہ دوسرا مصرع نہ صرف بے قافیہ ہے بلکہ پہلے اور تیسرے مصرعے کے مقابل اک سبب کم بھی ہے۔ ابتداً ماہیے مساوی

الاوزان مصرعوں ہی میں کہے جاتے رہے ہیں جیسے:

باغوں میں پڑے جھولے/تم بھول گئے ہم کو/ہم تم کو نہیں بھولے

(چراغ حسن حسرت)

کیچڑ میں کنول دیکھا/ بے آسرا بچے کو/ روتے ہوئے کل دیکھا

(علی محمد فرشی)

سنتا ہے نہ کہتا ہے/گم اپنے خیالوں میں/ پاگل کوئی رہتا ہے

(نصیر احمد ناصر)

چاندی کی کٹوری ہے/ بیوی مرے بھائی کی/ کہتے ہیں چٹوری ہے

(سیدہ حنا)

عوامی انداز کے ماہیے تو کسی خاص وزن کے التزام سے مبرا تھے لیکن فلمی ماہیے بھی درمیانی مصرعے کے سبب خفیف کی کمی ہی سے لکھے گئے تھے اور آخر آخر یہی وزن ماہیے کی پہچان ٹھہرا۔ ثلاثی اور ماہیے میں کچھ تو حدِ امتیاز ہونی چاہیے تھی۔ عام طور پر کچھ لوگوں نے اس کا وزن مفعول مفاعیلن/ فاع مفاعیلن/مفعول مفاعیلن۔قرار دیا ہے۔

مدیر''تیر نیم کش'' ڈاکٹر عارف حسن خان نے اپنی کتاب ''معراج العروض'' میں اس کے اوزان کچھ یوں دیئے ہیں۔

فعلن فعلن فعلن/فعلن مفعول فعل/فعلن فعلن فعلن

اور اس بنیادی وزن میں کمی بیشی کے ساتھ کئی اور اوزان میں ماہیے کہے جا سکتے ہیں۔ شرط بس اتنی ہی ہے کہ درمیانی مصرعے پہلے اور تیسرے مصرعے کے بالمقابل بہر حال ایک سبب خفیف کم ہو۔

''اردو میں ماہیا نگاری'' میں بھی جناب حیدر قریشی نے اس وزن پر ہی اصرار کیا ہے۔ جس میں درمیانی مصرع بالالتزام یک سبب خفیف کم ہوتا کہ ثلاثی اور ماہیے میں فرق باقی رہے۔ اس کے افاعیل کے خشک مباحث سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم اس صنف کی اردو ادب میں پذیرائی کرتے ہیں۔ مختلف اصناف کی طرح اس صنف ماہیے میں مختلف موضوعات کو برتا گیا ہے۔ حمدیہ، نعتیہ، اخلاقی، سماجی، سیاسی، وغیرہ وغیرہ ہر قسم کے ماہیے لکھے گئے۔ ماہیے کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے۔ یکساں مصرعوں والے مجموعے ''بلے بلارے'' (دیپک قمر) کو ماہیوں کا مجموعہ بلکہ بقول سرور تونسوی پہلا مجموعہ کہنا نامناسب ہی ہوگا کہ یہ ماہیے نہیں بلکہ ثلاثیاں ہیں۔ سیدہ حنا، نصیر احمد ناصر، علی محمد فرشی اور چراغ حسن حسرت کے ماہیے بھی دراصل ثلاثی ہی ہیں۔ حیدر آباد دکن کے پروفیسر قمر ساحری نے جو

ہجرت کے بعد پاکستان میں رہتے تھے جن کا ابھی پچھلے دنوں انتقال ہوا، اگست ۱۹۹۶ء میں ایک ایسا انوکھا مجموعہ ''بادِ سبز'' دیا جس میں ماہیے حروف تہجی کے حساب سے کہے گئے ہیں۔ گزشتہ دور میں اساتذہ کے دیوان، غزلیات کے ردیف کے آخری حرف کو بنیاد بنا کر ترتیب دیئے جاتے تھے۔قمر ساحری نے پہلے حرف کو بنیاد بنا کر بے شمار ماہیے لکھ ڈالے۔ ان کے ''بادِ سبز'' کی یہی اک خاص بات ہے۔ موضوعات عمومی ہیں بلکہ عوامی ہیں۔قمر ساحری ایک ترقی پسند شاعر تھے اور بادِ سبز میں بھی ان کی یہی فکر بولتی دکھائی دیتی ہے۔ بہ اعتبار حرف تہجی چند منتخب ماہیے ملاحظہ فرمائیے۔

(الف) آواز کہاں تک دیں/ ساتھ تمہارے ہیں/تم ساتھ جہاں تک دیں

اک بات پہ ڈٹ جاؤ/ ظلم سہیں کب تک/میداں میں نکل آؤ

انصاف کہاں ہوگا/یاد ہمیں آیا/سرمایہ جہاں ہوگا

(ب) بانہوں میں نہیں نرمی/سرد ہوئے جذبے/بوسوں سے گئی گرمی

بے معنی تبسم کیا/بات کرو آؤ/چھپ چھپ کے تکلم کیا

باشندہ دکن کا ہوں/حرف نکھرتے ہیں/اردو کے وطن کا ہوں

(پ) پھر تیری مہک آئی/ڈھول اڑی دل سے/آنکھوں میں چمک آئی

(ج) جذبے تو بہت سے ہیں/کام دکھاؤ تو/وعدے تو بہت سے ہیں

علیٰ ہٰذ القیاس ان کے سارے ماہیے اسی نوعیت کے ہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نئی اصناف کی پذیرائی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ انہوں نے مختلف گیارہ ماہیے نگاروں پر مشتمل ایک مجموعہ ''رم جھم'' چھاپ دیا اس سے پہلے جناب حیدر قریشی کے مجموعے ''عمر گریزاں'' میں ماہیے شامل تھے اور ایک مجموعہ ''محبت کے پھول'' بھی جناب حیدر قریشی کی ماہیا نوازی کی دستاویز ہے۔ جرمنی میں بیٹھے ہوئے وہ اس پنجابی صنف کے فروغ میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ ان کے رسالے ''جدید ادب'' میں بالالتزام ماہیے شامل رہتے ہیں۔ ہندوستان میں نذیر فتح پوری کے ماہیوں کا مجموعہ ''ریگِ رواں'' اور فراغ روہوی کے ماہیوں پر مشتمل مجموعہ ''چھیاں چھیاں'' ان کے علاوہ بہار کے شاہد جمیل کا مجموعہ ''سو ماہیے'' ۲۰۰۲ء میں چھپ کر آیا ہے۔ ڈاکٹر طاہر رزاقی کے مجموعے ''رتیں'' میں بھی سو ماہیے شامل ہیں۔ شمیم انجم وارثی نے ''مغربی بنگال میں ماہیا نگاری'' کے عنوان سے چونتیس ماہیا نگاروں کے فی کس بیس بیس ماہیے جمع کر کے ایک کتاب شائع کی۔ بہار اور کلکتہ میں جگہ جگہ میں ماہیے کے مشاعرے بھی اعلیٰ پیانے پر منعقد ہوئے۔ دو ماہی ''گلبن'' احمد آباد (اب لکھنؤ)، ''قرطاس'' (ناگپور) نے ماہیا نمبر نکالے۔ اس دوران ماہیوں کے

دو مجموعے اور چھپ گئے۔ ایک جناب عاصی کاشمیری کا "موسم بھی اک جیسے" دوسرا ساحر شیوی کا "وادی کوکن"۔ مراد آباد سے نکلنے والے "تیر نیم کش" (مرحوم) کے مدیر ڈاکٹر عارف حسن خاں کے ماہیوں کا مجموعہ "خوابوں کی کرچیں" بھی شرمندہ تعبیر ہوا۔ مختصر یہ کہ مختصر سے عرصے میں اس مختصر سی صنف نے کافی لمبی جست لگا ڈالی۔

ہم جانتے بہتر ہیں / کس سے بڑے ہیں ہم / اور کس کے برابر ہیں

(فراغ روہوی)

گرچہ ہے یہ نادانی / دل کی مگر میں نے / ہر بات سدا مانی

(عاصی کاشمیری)

ناپختہ دلیلوں سے / کیس بگڑتا ہے / کمزور وکیلوں سے

(نذیر فتح پوری)

ہر غم کا مداوا ہے / ماں کا تبسم تو / قدرت کا کرشمہ ہے

(اطیب اعجاز)

افسوس تو کیا کرنا / زہر کا عادی تھا / لازم تھا اسے مرنا

(رؤف خیر)

سنا ہے ڈاکٹر جمیلہ عرشی راجستھان یونیورسٹی سے ماہیے پر ڈی لٹ کر رہی ہیں۔

تین مصرعوں پر مشتمل اک اور صنف ہائیکو جاپانی صنف سخن "تانکا" کا اردو روپ ہے۔ ابتدا ہمارے اردو شعراء نے ہائیکو کے معاملے میں بھی خاصی غیر ذمہ داری دکھائی تھی۔ تین مصرعوں کی نظمیں کہہ ڈالیں انہیں ہائیکو کا نام دے ڈالا۔ مدراس کے علیم صبا نویدی کا ایک مجموعہ "ترسیلے" نکلا جسے انہوں نے ہائیکو کا نام دیا تھا جو ۱۹۸۶ء میں مدراس سے چھپا تھا جس میں تین مساوی الوزن مصرعوں کی نظمیں ہیں الا ماشاء اللہ۔ حالانکہ ہائیکو کے مصرعے ۵۔۷۔۵ سلے بلز Syllables میں کہے جانے چاہیے۔ گویا یہ صنف ماہیے کے مقابلے میں بالکل متضاد صنف ہے۔ ماہیے میں درمیانی مصرع اک سبب خفیف چھوٹا ہوتا ہے۔ اور یہاں درمیانی مصرع اک سبب خفیف (اک سلے بل Syllable) بڑا ہوتا ہے۔ ہر چند دونوں اصناف کے افاعیل بالکل الگ ہیں۔ علامہ نادم بلخی کے ہائیکو کا مجموعہ "ترلوک" ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا تھا۔ علیم صبا نویدی نے اپنی کتاب "اردو شاعری میں نئے تجربے" میں صفحہ ۱۳۰ پر کھلے دل سے اعتراف کیا کہ

"راقم الحروف (یعنی علیم) نے پہلے ناواقفیت کی بناء پر "اوراق" (لاہور) میں

بعض ہائیکوز کے مطالع کے بعد ''ترسیلے'' میں تثلیثوں کو ہائیکو کے زمرے میں لاکر ایک مجموعہ اردو ادب کو دیا۔''

ہائیکو کو بڑھاوا دینے میں ''ساقی'' (دہلی) کے'' جاپان نمبر'' جنوری ۱۹۳۶ء کا دخل ہے۔ جو پروفیسر نورالحسن برلاس کے تعاون سے شائع ہوتا تھا۔ جن کا ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کے استاد کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا تھا۔ محسن بھوپالی نے جاپانی قونسل خانے کے تعاون سے کراچی میں کئی ہائیکو مشاعرے کروائے۔ محسن بھوپالی کے ہائیکو کا مجموعہ ''منظر تپلی میں'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔ یہی اب ہائیکو کے محسن شمار ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان کی پہچان میں ''نظمانے'' بھی اہم حصہ ادا کرتے ہیں۔ چاند ہائیکو ملاحظہ فرمایئے:

یارب تیری شان/لفظوں سے ہے بالاتر/کیسے کروں بیان

(محسن بھوپالی)

اے میرے معبود/حور و ملائک اور انسان/سب کا تو مسجود

(احمد سعدی)

جھرنا بہتا ہے/پتھر سے اپنی بپتا/کہتا رہتا ہے

(سحر انصاری)

کیا بتلائیں حال/ذہن و دل میں پھیلے ہیں/اندیشوں کے جال

(سہیل غازی پوری)

باتیں خوابوں کی/لکھے گا تو لکھنے پر/پابندی ہوگی

(رؤف خیر)

اعلیٰ ہو، وہ بہت/فطرت پر آجائے تو/پستش غایت پست

(رؤف خیر)

ہند و پاک میں ہائیکو لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے اس کے باوجود ماہیے کے مقابلے میں اس کو قبول عام کم کم ہی نصیب ہوا ہے۔

ترویئی کے تعلق سے صبا نویدی نے اپنی کتاب ''اردو شاعری میں نئے تجربے'' میں لکھا:

''تین مصرعوں پر مشتمل ایک جدید صنف ہے جو نہ ثلاثی ہے نہ ہائیکو نہ ماہیا (ماہیا) بلکہ یہ ایک ایسی تثلیثی صنف ہے جس کی اختراع کا سہرا فلمی گیت کار گلزار جہلمی کے سر بندھتا ہے۔ خود گلزار نے اپنی صنف کے بارے میں یہ بتایا

کہ پہلے دو مصرعے ایک پورا مکمل شعر ہے جن میں خیال کی بھی تکمیل ہو جاتی ہے مگر تیسرا مصرع لاکر شعر کے تاثر کو از سر نو بدل دینے کی کوشش ہوتی ہے۔ یہ تیسرا مصرع تبصرہ یا رائے (Comment) بھی ہو سکتا ہے۔

گلزار کی ایک ترو ینی ملاحظہ فرمایئے۔

سانپ جتنا بھی خوبصورت ہو/ اپنی فطرت بدل نہیں سکتا/ اس لئے کینچلی بدلتا ہے

گویا اس میں نظام قافیہ کا التزام نہیں پایا جاتا صرف آہنگ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ گلزار نے تینوں مصرعے ہم وزن ہی رکھے ہیں جیسے ان کی ایک اور ترو ینی ہے:

سب پہ آتی ہے سب کی باری ہے/ موت انصاف کی علامت ہے/ زندگی سب پہ کیوں نہیں آتی

گلزار کی اتباع کرتے ہوئے تیسرے مصرعے سے ترو ینی کے خیال کو الٹ دینے کے اسلوب کو عام کرنے کے بجائے اردو کے شعراء نے اس کے مصرعوں کو مسلسل بڑھانے میں یا گھٹانے میں زیادہ دلچسپی دکھائی۔ یعنی پہلا مصرع اگر دو افاعیل پر منحصر ہے تو دوسرا مصرع تین اور تیسرا مصرع چار افاعیل کا ہوگا۔ فاعلن فاعلن/ فاعلن فاعلن فاعلن/ فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن۔ بہر حال کچھ اس قسم کے کم و بیش افاعیل کو مسلسل بڑھا کر ترو ینیاں کہی گئیں۔ علامہ شارق جمال، کاظم نائطی، علیم صبا نویدی، مناظر عاشق، حکیم منظور وغیرہ۔

ندائے آسمانی/ تمہیں لکھنی ہے خود اپنی زبانی/ ذرا چوکے تو خود بن جاؤ گے تم داستانی

(حکیم منظور)

اسی طرح فاروق شکیل کی ترو ینی ہے:

فضا اچھی نہیں ہے/ کہیں آب و ہوا اچھی نہیں ہے/ ہر اک شئے میں ملاوٹ ہے، غذا اچھی نہیں ہے

اس کے برخلاف دوسرے شعراء کی ترو ینیوں میں یہ التزام بھی نہیں پایا جاتا۔

لوگ خاموش ہوئے/ جاگتے ہیں دیوار و در مگر/ آدمی جسم کے اندر بھی چلا ہے اکثر

(مناظر عاشق)

ہر صنف کا اپنا ایک مخصوص شناس نامہ ہوتا ہے۔ جس طرح چار مصرعوں کی ہر نظم رباعی نہیں کہلاتی، تین مصرعوں کی نظم کا بھی یہی حال ہے کہ ہر تین مصرعوں کی نظم کو ان کی مخصوص ہیئتوں کے حساب سے مختلف زمروں میں تقسیم کیا جائے گا۔

اگر تین مصرعے مختلف اوزان میں ہے مگر بحر و آہنگ ایک ہی ہے تو وہ تو تین مصرعوں کی نظمیں ہیں۔

باقی صفحہ ۴۵ پر.....

محمد زاہد الحق

شفق کے دو نئے ناول: بادل اور کابوس

اردو ناول کی ابتدا اور ارتقا سے اہل علم و ادب بخوبی واقف ہیں۔ پھر بھی تاریخی پہلو پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف نے ابتدا ہی سے سماج و معاشرے سے اپنا رشتہ جوڑے رکھا ہے۔ کبھی سماج و معاشرے کی اصلاح کے لیے ناول لکھے گئے تو کبھی سماجی برائیوں پر اس صنف کے ذریعہ زبردست وار کیا گیا۔ سرحد کے دونوں پار ہوئے خونی فسادات سے اردو ناول کے ہزاروں صفحات بھی سرخ ہوئے مگر میں اس خاص عہد کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ جب قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، جوگندر پال، جیلانی بانو وغیرہ صنف ناول میں طبع آزمائی کر رہے تھے اور ان لوگوں کی تحریر میں ایسے ایشوز بھی تھے جن کا ہمارے سماج اور معاشرے سے گہرا تعلق تھا۔ پھر بھی یوں محسوس ہونے لگا کہ اردو ادب میں صنف ناول کے حوالے سے جمود کی کیفیت طاری ہو چکی ہے اور اردو ناول کی دنیا جلد ہی ویران ہو جائیگی۔ ایسے میں چند نوجوان لکھنے والوں نے آگے بڑھ کر ناول کو اس بحرانی دور سے باہر نکالنے کی ذمہ داری قبول کی اور اردو ناول کی تاریخ گواہ ہے کہ انہی نوجوانوں نے اردو ناول کی دنیا کو ویران ہونے سے بچایا، ساتھ ہی ناول میں ویسے تجربات بھی کیے جن سے اردو ناول اب تک دور تھا۔ ان نوجوانوں نے علامتی ناول لکھے اور جب بیانیہ کا زور بڑھتا گیا تو انہوں نے بھی اپنی تحریر میں تبدیلی پیدا کی اور تخلیقی زبان کا بھرپور استعمال کیا۔ ایسے ہی ناول نگاروں میں شفق کا شمار ہوتا ہے جو کئی لحاظ سے اپنے تمام معاصر ناول نگاروں سے ممتاز و منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ہم جس نسل کے نوجوان لکھنے والوں کا ذکر کر رہے ہیں ان میں شفق کے علاوہ عبدالصمد، شموئل احمد، سید محمد اشرف، غضنفر، پیغام آفاقی، مشرف عالم ذوقی، حسین الحق، صلاح الدین پرویز، انور خان، مظہر الزماں خان وغیرہ کا نام سرفہرست ہے۔ الیاس احمد گدی اور اقبال مجید بھی ناول نگار کے بطور اسی دور میں نمایاں ہوئے۔ آج اردو ناول کا جو تانا بانا ہمارے سامنے ہے اور اس صنف کو جتنی ترقی حاصل ہوئی ہے اس میں اسی نسل کے لوگوں کا خون جگر خصوصیت کے ساتھ شامل ہے۔

شفق نے اپنا پہلا ناول ''کانچ کا بازی گر'' ۱۹۸۲ء میں لکھا۔ یہ ناول علامتی ناول ہے جس

میں ایمرجینسی کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے شفق نے اس زمانے میں رونما ہونے والے واقعات کو بہت خوش اسلوبی سے علامت کے پیرایے میں بیان کیا۔ علامت اور تجرید کے عنفوان شباب یعنی جدیدیت کے دور میں اس ناول کی شہرت بہت رہی لیکن رفتہ رفتہ ''کانچ کا بازی گر'' اردو ناول کی تاریخ وتنقید سے غائب ہوگیا۔ شفق کو بھی اس ناول سے کوئی تحریک نہیں ملی۔ بیس برس بعد ''بادل'' شائع ہوا تو شفق کا اسلوب یکسر بدل گیا تھا۔ ''کابوس'' اپنی نوعیت کے مخصوص ناول ہونے کا درجہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم ان اسباب وعوامل کی طرف رجوع کریں جن کی بنا پر یہ بات سامنے آئے گی کہ کس وجہ سے شفق کی تحریر ان کے تمام ہمعصروں سے منفرد ومختلف ہے یا یوں کہیں کہ ''بادل'' اور ''کابوس'' کی وہ کون کون سی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے یہ دونوں ناول اس عہد کے دوسرے ناولوں سے الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہیں۔

اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ''بادل'' اور ''کابوس'' ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو ناول نگاری کی پوری تاریخ دیکھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ سلسلہ وار ناول لکھنے کا رواج ہمارے یہاں موجود نہیں ہے۔ البتہ قرۃ العین حیدر اور عبدالصمد کے ناولوں کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ناولوں میں Continuity یا تسلسل ہے۔ عبدالصمد کے ناولوں کے بارے میں تو ناقدین کہتے ہیں کہ ان کی ہر تحریر اپنی پچھلی تحریر کی توسیع ہے۔ ایسا ہی خیال کچھ ناقدین نے شفق کے ان دونوں ناولوں کے بارے میں بھی ظاہر کیا ہے۔ مگر عبدالصمد اور قرۃ العین حیدر کی مثالیں موجود ہونے کے باوجود شفق نے ان دونوں ناولوں کے ذریعہ اردو ناول نگاری میں ایک نیا تجربہ پیش کیا ہے۔

شفق کا ناول ''بادل'' اپنے آپ میں مکمل ہے۔ یہی احساس ہمیں شفق کے دوسرے ناول ''کابوس'' کو پڑھنے کے بعد بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں ناولوں میں واضح آغاز و اختتام موجود ہے۔ مگر جب ان دونوں ناولوں کو یکے بعد دیگرے پڑھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے دو جلدوں میں ایک ہی ناول پڑھا ہے۔ یعنی ''بادل'' کی توسیع ہمیں ''کابوس'' کی شکل میں نظر آتی ہے۔ ابھی تک ہمارے ادب میں اس طرح کے ناول لکھنے کا چلن نہیں ہوا ہے مگر یہ ممکن ہے کہ شفق کے یہ دونوں ناول مشعل راہ ثابت ہوں اور اس طرح کی ناول نگاری کا رواج عام ہو جائے۔ ایسا تجربہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے میں ہمیشہ یہ خدشہ برقرار رہتا ہے کہ ناول نگار اپنے مقصد میں ناکام نہ ہو جائے۔ مگر شفق نے پہلے ناول اور ایک سال بعد دوسرا ناول پیش کرکے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنی بات کو قارئین کے سامنے ایک نئے انداز میں رکھنے میں کامیاب ہیں۔ اگر ان کے پہلے ناول نے قارئین کو متاثر نہ کیا ہوتا تو دوسرا ناول بھی شاید ہوا ہو جاتا۔ لیکن شفق نے اتنا بڑا چیلنج قبول کیا

اور اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نئے تجربے کو قارئین کے سامنے کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔

''بادل'' اور'' کابوس'' کی پوری کہانی سیاسی واقعات و حادثات کو اپنے آغوش میں سمیٹے ہوئے ہے۔'' بادل'' کے پلاٹ میں عالمی سیاست کا رچاؤ ہے تو'' کابوس''میں ہندوستانی سیاست کا۔ ان دونوں ناولوں میں سیاسی حرکات و سکنات کے متوازی خالد اور سلمی کی رومانی کہانی بھی پیش کی گئی ہے۔ یہ متوازی قصے کی تکنیک ہے۔اس میں شفق نے نہایت ، ہنر مندی سے رومانی کہانی کو عالمی سیاسی تناظر میں مضبوط بیانیہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ایسا کہیں پر بھی محسوس نہیں ہوتا کہ رومانی کہانی کا رنگ سیاسی ہو رہا ہے یا سیاست سے رومانی کہانی متاثر ہو رہی ہے۔ اس کے لیے شفق نے دونوں ناولوں میں دو متوازی کہانیوں کو فطری پن کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔دوسری تمام کہانیوں کی طرح ان رومانی اور سیاسی کہانیوں میں بھی کئی نشیب و فراز نظر آتے ہیں مگر کہیں پر بھی شفق نے ایک کہانی کو دوسرے سے خلط ملط ہونے نہیں دیا۔انہوں نے قارئین کو یہ دکھایا ہے کہ جب عالمی سیاست اور ملکی سیاست سے پورا سماج و معاشرہ دوچار ہے تب بھی محبت اور پیار کی سماج میں جگہ باقی رہ جاتی ہے۔یہی محبت اور پیار ہے جس کو شفق نے امن کی علامت کے بطور اپنے ناولوں میں لایا ہے۔

ان دونوں ناولوں کے حوالے سے کئی دانشوروں اور ناقدوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شفق کی یہ تحریریں ادبی نہ ہو کر صحافتی ہیں۔مگر میری حقیر رائے میں ایسا سوچنا ادبی اعتبار سے درست نہ ہوگا۔یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں ناولوں کا محور و مرکز سیاسی حادثات و واقعات ہیں۔کسی بھی واقعے یا حادثے سے واقفیت سیاست کا حصہ ہے مگر سلمی، خالد اور نعیم کے کرداروں کے ذریعہ شفق نے جس انداز سے سیاسی واقعات کو ضابطہ تحریر میں لایا ہے وہ خالص ادبی نمونہ ہے۔یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ ماضی کے حادثات و واقعات یا شخصیات سے متعلق باتوں کو ادبی شکل میں پیش کرنا مشکل کام نہیں ہے۔مگر دقت تو اس وقت ہوتی ہے جب ماضی قریب یا حال کے کسی واقعے کو ناول نگار یا افسانہ نگار اپنی تخلیق میں پیش کرنا چاہتا ہے۔شفق نے بھی کئی حالیہ سیاسی واقعات کو ان دونوں ناولوں میں پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا اور قصہ گڑھ کر بیانیہ سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تخلیق کو صحافتی تخلیق سے ممیز کیا۔کچھ اصحاب نظر کا یہ اختلاف ہو سکتا ہے کہ سیاسی واقعات جس طرح سے رونما ہوئے ، ان کو ناول کے پیرائے میں پیش کر دینا کوئی کمال نہیں ہے۔آپ کی سوچ بالکل درست ہو سکتی ہے مگر ذرا یہ بھی سوچیے کہ وہ سیاسی واقعات جن سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے ممالک متاثر ہوئے ہوں، جن سے ہمارے سماج کا ہر شخص متاثر ہوا ہو، ان کو ناول کے پیرائے میں یا کسی بھی ادبی صنف

میں پیش کرنا کیا چیلنج نہیں ہے؟ اور ہاں، شفق نے تو حادثات و واقعات کو جیسا دیکھا، ویسا اوروں کو دکھایا ہے یا یوں کہیں کہ انہوں نے ان دونوں ناولوں کو پیش کر کے سماج و معاشرے کے عام لوگوں کی سوچ فکر اور ذہنی پریشانیوں کو پیش کیا ہے:

''پہلے ہم اس پر غور کر لیں کہ ہمارا انداز فکر متعصّبانہ تو نہیں، کیا ہم ان کی ہر بات کو شک کی عینک سے دیکھنے لگے ہیں؟ شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ پچپن برسوں سے ہمیں حملہ آور کہا جا رہا ہے۔ ہم پر الزام ہے کہ ہمیں اس سرزمین سے محبت نہیں، ہماری وفاداریاں مشکوک ہیں اور ہمدردیاں پاکستان سے وابستہ ہیں تو ہم کیا کریں، جب اسی وقت کمیونسٹ پارٹیاں امریکہ کے خلاف مظاہرہ کرتی ہیں تو کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور مسلمانوں کے مظاہرے کے ساتھ بندوقیں سینوں پر تن جاتی ہیں، ہم نے اس ملک کو ابوالکلام، یوسف خان اور اظہر دیا مگر انہوں نے ہمیں کب اپنایا یا اپنا جانا، ہمیں آتنک وادی کا لقب ملا اور اب ٹریڈ ٹاور پر حملہ ہوا ہے، کس نے کیا یہ معلوم نہیں، ممکن ہے اسامہ نے کیا ہو تو اس میں سارے مسلمانوں کا پینٹ اترنے کی بات کہاں سے آ گئی۔''

(بادل، صفحہ ۷۸-۷۹)

یا اس اقتباس کو دیکھیں جس میں اسی خیال کو ظاہر کیا گیا ہے جو عام آدمی کی فکر میں شامل ہوتا ہے:

''سریواستو جی کے خیالات میں تبدیلی آئی ہے، وہ قاعدے کی بات کرنے لگے ہیں۔ دراصل انہوں نے تعصب کی عینک نہیں لگائی، اگر ملک کے سارے لوگ مشرا جی جیسے خیالات کے ہو جائیں تو یہاں سے مسلمان اصلی گھی کی طرح غائب ہو جائیں گے، کسی کسی دوکان پر سونگھنے کے لیے ملیں گے جیسا یہ حکومت کر رہی ہے، دو مسلمانوں کو منسٹری دے کر سیکولر ہونے کا تمغہ لگا لیا ہے۔''

(بادل، ص ۱۲۲)

شفق نے دونوں ناولوں میں زبان کا پورا پورا تخلیقی استعمال کیا ہے۔ ان دونوں ناولوں کو پڑھنے کے بعد یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ شفق کی زبان ان کے معاصرین سے بالکل مختلف ہے۔ ہاں شفق اور غضنفر اپنی تحریر میں جو تخلیقی زبان استعمال میں لائے ہیں وہ ان کے دوسرے معاصرین کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے یا کم ملتی ہے۔

''بادل'' اور ''کابوس'' میں شفق نے اپنی تمام فنکارانہ صلاحیتوں کا خوب استعمال کیا ہے۔ ان دونوں ناولوں کو باریک بینی سے دیکھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ شفق کی گردو پیش کے حالات و واقعات پر بہت گہری نظر ہے۔ ان کا سماج کے مختلف مسائل کا بہت گہرا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ چونکہ ان کے یہ دونوں ناول سیاسی اور رومانی کہانیوں کا خوبصورت امتزاج پیش کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بالکل دو مختلف پہلوؤں یعنی سیاست اور محبت کا شفق نے بہت نزدیک سے مطالعہ کیا ہے اور اس کے تمام تر پہلوؤں کے متعلق اپنی سوچ کا بھرپور اظہار بھی کیا ہے۔ ''بادل'' اور ''کابوس'' میں جو سیاسی واقعات پیش کئے گئے ہیں ان کو پیش کرتے ہوئے شفق نے ہندوستانی سماج اور معاشرے میں موجود فرقہ واریت کے مسئلے کو بھی سامنے لایا ہے۔ تب ہی تو شفق نے لکھا ہے:

''نعروں کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں، پھر اژدہے کے سر کی طرح جلوس نمودار ہوا، آگے آگے ارتھیاں، پیچھے تلواریں لیے کیسریا رنگ میں رنگی شیو اور بجرنگی سینا۔ وہ فضا میں تلواریں لہرا رہے تھے۔

لاؤڈ اسپیکر سے ایک بھاری آواز ابھری۔ بابر کے کتو

سیکڑوں آوازوں نے کہا۔ واپس جاؤ واپس جاؤ۔

کٹوا قوم

ہائے ہائے۔

جے ہندو

جے ہندوستان۔''

(کابوس، ص ۱۵)

ہندوستان میں مسلمانوں کی جو حالت ہے، وہ دن بہ دن بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے سماج میں جو بھائی چارگی اور مذہبی رواداری تھی اس کو کس طرح لوگوں نے اقتدار تک پہنچنے کے لیے برباد کیا؟ آزادی اور تقسیم ملک کے بعد نفرت کی آگ کو کس پیمانے پر مٹھی بھر لوگوں نے ملک بھر میں پھیلانے کی کوشش کی؟ ان سب باتوں کو وہ اپنے ذاتی تجربے میں لاکر بہت باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔ عالمی دہشت گردی کے نام پر امریکہ نے دنیا کے کئی مسلم ممالک کو زد میں لے لیا ہے۔ جس کی مثالیں فلسطین، چیچنیا، افغانستان، عراق، ایران وغیرہ سے دی جاسکتی ہے۔ امریکہ نے کیسے مسلم ممالک کے خلاف پوری دنیا میں اپنے فائدے کے لیے Public Opinion تیار کیا اس کو شفق نے عالمی سیاسی تناظر میں پرکھنے کے بعد اپنی تحریر میں بہت صاف گوئی

اور بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ آئینہ لیے کھڑے ہیں اور سب کو اپنی حقیقت کا احساس اس آئینے کے سامنے لاکر کرادیتے ہیں۔ پچھلی مرکزی حکومت نے State Repression کا جو طریقہ اختیار کیا اس کی چند مثالیں مسلم نوجوانوں کو SIMI اور دیگر So called terrorist outfit سے وابستہ کرکے POTA اور TADA کے تحت زدوکوب کرنے تک ہی محدود نہیں تھیں بلکہ حکومت کی یہ سوچی سمجھی ہوئی سازش تھی کہ اس طرح سے مسلم نوجوانوں کے ذہنوں کو برباد کر دیا جائے۔ حکومت کی اس سوچی سمجھی ہوئی سازش کو ہمارے سماج و معاشرے کے بہت سے دانشور سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں مگر اس مشکل اور پریشانی سے عام لوگوں کو آگاہ کرنے اور اس کا حل تلاش کرکے اس مصیبت سے باہر نکلنے کا راستہ اردو میں صرف اور صرف شفق کو ہی نظر آیا جس کو انہوں نے ناول کے پیرائے میں ''بادل'' اور ''کابوس'' کی شکل میں سب کے سامنے پیش کر دیا۔

ہندوستان کا مخلوط سماج اور اس میں موجود مذہبی رواداری کو بھی شفق نے بڑی باریکی سے مشاہدہ میں لایا ہے اور سری واستو اور مشراجی کے کردار کے حوالے سے اکثریت کی مثبت اور منفی سوچ کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج پورا معاشرہ فرقہ پرستی کی زد میں ہے پھر بھی روشن خیال اور سیکولر ذہنیت کے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ اچھے اور برے دونوں لوگ آج بھی موجود ہیں۔ ہندوستانی سماج کی مذہبی رواداری کی صحیح پیشکش سری واستو جی کے حوالے سے اور فرقہ پرست طاقتیں جو کہ اقلیتوں کی دشمن ہیں ان کی ترجمانی مشراجی کے حوالے سے پیش کرنے میں شفق مکمل طور پر کامیاب ہیں۔ یہاں ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ سماج اور معاشرے کی مختلف اکائیوں کا شفق نے بغور مشاہدہ کیا ہے جس کے نتیجے میں ان کا اپنا ایک واضح رویہ ہے۔

شفق نے ''بادل'' اور ''کابوس'' میں بہت سے کردار ایسے لیے ہیں جو حقیقی ہیں کیونکہ عالمی اور ہندوستانی سیاست کے کئی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے ان کو ایسے کردار سے بچ نکلنے کی صورت نظر نہ آئی ہوگی۔ مگر خالد، سلمیٰ اور نعیم جیسے مرکزی کردار تخلیق کرکے شفق نے اپنی فنکارانہ ہنرمندی کا مسلم ثبوت پیش کیا ہے۔ یہ تینوں کردار خیالی ہیں مگر ان کی پیشکش ایسی ہے کہ کہیں پر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ہمارے سماج و معاشرے کا حصہ نہیں ہیں۔ ''بادل'' میں خالد کا کردار سب سے موثر کردار ہے۔ وہ اتنا زندہ دل ہے کہ اس سے مل کر نعیم اور سلمیٰ کے اندر بھی زندگی جینے کی تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ مگر ''کابوس'' میں پہنچ کر حالات کے بھنور میں وہی خالد اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ اپنی زندگی کی بھیک مانگتا ہے اور اس کی ہاتھ جوڑی ہوئی تصویر تمام اخباروں میں چھپتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس طرح کی پیشکش سے شفق نے خالد کے کردار کو کمزور کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ ناول نگار نے اس سماجی اور نفسیاتی کیفیت کو

سامنے رکھا ہے کہ جہاں خالد کو حالات نے اس چوراہے پر لاکر کھڑا کر دیا ہے جہاں صرف بے چارگی اور بے بسی ہے۔ پولس کے ذریعہ زدوکوب کیے جانے کے بعد بھی خالد ٹوٹتا نہیں ہے۔ نعیم اور سلمیٰ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور اپنے سے دور جانے کے لیے کہتا ہے۔ وہ تمام حالات سے خود نپٹنا چاہتا ہے۔ مگر جب State repression شروع ہوتا ہے جس کے نتیجے میں گجرات دنگے شروع ہوجاتے ہیں تو ایک عام مسلم نوجوان کی طرح وہ بھی ٹوٹ جاتا ہے اور اکثریتی فرقہ کے لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنی زندگی کی بھیک مانگتا ہے۔

مجموعی طور پر ''بادل'' اور'' کابوس'' کے تنقیدی جائزے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شفق کی تحریروں سے اردو ناول نگاری کا دائرہ یقیناً وسیع ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے ان دونوں ناولوں کے لئے جس موضوع، زبان، اسلوب اور انداز بیان کا انتخاب کیا ہے اور جس مقصد کے تحت یہ دونوں ناول تخلیق کیے ہیں، اس میں ندرت اور نیا پن ہے۔ لفظ ناول جو کہ لاطینی زبان کے لفظ نایلا (Novella) سے مشتق ہے جس کے معنی ندرت اور نیا پن کے ہیں، اسے شفق نے نہ صرف سمجھا ہے بلکہ بحسن وخوبی اپنی تحریروں میں اتارا بھی ہے۔ ☆☆

صفحہ ۳۸ کا بقیہ.....

پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ و ردیف ہے اور دوسرا مصرع بے قافیہ ہے لیکن پہلے اور تیسرے مصرعے کا ہم وزن ہے تو یہ تو ثلاثی ہے یا تثلیث۔ اس میں کسی خاص بحر کی پابندی لازمی نہیں۔ شاعر کو آزادی ہے کہ وہ اپنے مزاج کی مناسبت سے بحر منتخب کرلے جیسے قمر اقبال نے ایک بحر میں تثلیثات کہیں تو دیپک قمر نے دوسری بحر اپنے لئے مخصوص کرلی۔ اگرچہ انہوں نے اپنی ثلاثیوں کو ماہیوں کا نام دیا ہے۔ ان کے برخلاف حمایت علی شاعر نے مختلف بحروں میں ثلاثیاں کہیں۔

ماہیوں کے لئے درمیانی مصرعے کا ایک سبب کم ہونا اور ہائیکو میں درمیانی مصرعے کا ایک سلے بل زیادہ ہونا ان اصناف کی پہچان ہے۔

ترویٰنی میں تیسرے مصرعے کے ذریعہ ابتدائی دونوں مصرعوں میں پیش کردہ خیال کو اچانک الٹ کر چونکانے کے عمل سے اس کی پہچان قائم ہوتی ہے یا پھر مصرعوں کو اک اک رکن بڑھاتے یا گھٹاتے جانے سے ان میں ترو ینیت پیدا ہوگی۔

مختصر یہ کہ تین مصرعوں کی یہ صنف اپنی مخصوص ہیئت کے فرق سے الگ الگ پہچان کی حامل ہوجاتی ہے۔ ☆☆

منور رانا

میرے بچے مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتے

مغربی بنگال میں اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کرنے والوں کی ہمیشہ ایک فوج رہی ہے مرزا غالب نے شاید کلکتے کے سفر کے دوران ہی یہ مصرع تخلیق کیا ہوگا۔ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

کیوں کہ یہ مصرع حرف بحرف اہالیانِ بنگال کے اردو شاعروں ادیبوں، صحافیوں اور دانشوروں پر صادق آتا ہے۔ مغربی بنگال کے مزاج میں پذیرائی اور مٹی میں اتنی کشش ہے کہ دنیا اسے جادوگروں کی زمین کہتی ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو زبان کی شیرینی اور بنگلہ زبان کی مٹھاس میں کوئی رشتہ ضرور ہے۔

''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ اردو کا خواب ہے اور مغربی بنگال اس کی زندہ تعبیر ہے۔ ادب میں صحافت حلفیہ بیان کا درجہ رکھتی ہے۔ اور مغربی بنگال کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اردو کا پہلا اخبار ہندوستان کی آزادی کے متوالوں کے سرہانے صبح صادق کے نمودار ہوتے ہی رکھ دیا تھا۔ پذیرائی کی عادت سے مجبور بنگال نے اپنی بندرگاہ پر انگریزوں کے قافلے کو سب سے پہلے ''خوش آمدید'' کہا تھا۔ لہٰذا کفارے کے طور پر انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بھی سب سے پہلے بلند کیا، مجاہدین اردو نے بھی سب سے پہلے قلم کو تلوار بنانے کا تجربہ بھی اسی سرزمین پر کیا۔ مولانا محمد علی جوہر کی صحافتی بیباکی نے یہیں اپنے عقابی پروں کو پھیلایا۔ مولانا آزاد نے یہیں کی ہگلی ندی کے پانی سے بنائی گئی روشنائی سے اردو ادب اور صحافت کے مستقبل کو روشن کیا۔ لیکن اس کے باوجود کلکتہ کی اردو دنیا نہ جانے کیوں ہمیشہ ایک عجیب ادبی گھٹن کا شکار رہی ہے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ مرکزی حکومتوں سے کبھی سیدھے منہ بات نہ کرنے والے بنگال کے اہالیان اردو ہمیشہ دہلی اور لکھنؤ کی طرف رخ کر کے نماز ادب ادا کرنے میں فخر محسوس کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ اہالیان لکھنؤ اور دہلی پہلے تو بادشاہوں اور نوابین کو خوش کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اب اپنے اپنے سیاسی آقاؤں کے دربار میں سجدہ ریز رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بنگال کا ادنی سے ادنی صحافی بھی اپنی قلندرانی روش، اناپسندی، فقیرانہ طرزِ حیات اور کردار کی پختگی کے سہارے بڑے سے بڑے دربار میں سر اٹھائے ہوئے داخل ہوتا ہے اور کسی بھی

برسر اقتدار شخصیت سے نظریں ملاتے ہوئے خفت محسوس نہیں کرتا ہے۔

یہ بھی غور طلب ہے کہ فورٹ ولیم کالج سے جام جہاں نما کے دفتر تک ۲ سوتر کین اسٹریٹ سے آزاد ہند کے لیتھو پریس تک، مولانا ملیح آبادی سے سالک لکھنوی اور ابراہیم ہوش تک نے متعدد بار سیاہی کی کمی کے وقت اپنی انگلیاں خونِ دل میں ڈبو لیں، لیکن ارباب اقتدار کی نگاہِ ملتفت سے محروم رہے۔ پتہ نہیں اردو والوں کی طرف دیکھتے وقت ارباب سیاست کی آنکھیں کیوں اٹھنے آجاتی ہیں۔

اگر ایمانداری سے جائزہ لیا جائے تو ہندوستانی اردو صحافت میں احسن مفتاحی کا نام موجودہ صحافیوں میں سرفہرست تحریر کیا جانا چاہیے۔ دس برس پہلے بھی ان کا شمار ملک کے دس بڑے صحافیوں میں ہونا چاہیے تھا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اردو زبان وادب کے خدمتگاروں کی اگر فہرست بنائی جائے تو اس میں دو طرح کے لوگ نظر آئیں گے۔ ایک تو وہ لوگ ملیں گے، جنہوں نے اپنے ایک ایک لفظ کی قیمت سرکاری یا غیر سرکاری طور پر وصول کر لی۔ دوسرے وہ لوگ ہیں، جنہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اردو کی بے لوث خدمت کرتے ہوئے گذار دی۔ بلکہ بیشتر صحافیوں نے تو انتقال کے بعد ترکے میں صرف آدھا لکھا ہوا کالم ہی چھوڑا ہے۔ پیری مریدی کا ایک فائدہ تو بہر حال ہے کہ اگر زندگی میں قدر نہیں ہوتی ہے تو کم از کم مرنے کے بعد تو قبر پر میلہ لگتا ہے، لیکن اردو شاعروں ادیبوں اور صحافیوں کی کچی قبریں تو ایک برسات بھی نہیں جھیل پاتی ہیں۔

حضرت احسن مفتاحی کو میں نے ساری زندگی کم سے کم بولتے اور زیادہ لکھتے دیکھا ہے۔ نوجوان شاعروں، ادیبوں کی حوصلہ افزائی میں تو ان کی مثال نہیں ملتی ہے۔ مغربی بنگال کا کوئی بھی نوجوان شاعر وادیب ایسا نہیں ہوگا، جس کی انھوں نے کسی نہ کسی طرح کی مدد نہ کی ہو۔ عموماً ایک صحافی ساری زندگی ایک پیشہ ور سیاست داں کی طرح سیاسی خبروں تک محدود رہتا ہے، لیکن اس کے برعکس مفتاحی صاحب کا دائرہ فکر، شوق مطالعہ اور ادبی فراخدلی کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہے۔

میں نے ایک بار از راہِ مذاق کسی جگہ یہ کہا تھا کہ دنیا کے سب سے اچھے ہوائی پائلٹ ہندوستان کے ہوتے ہیں۔ کسی صاحب نے میرے اس دعوے پر دلیل کی سند طلب کی تو میں نے عرض کیا کہ دنیا کے سب سے زیادہ پرانے اور خراب جہاز لیکر جو پائلٹ پرواز کرتے ہوں ان کو کسی سند کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ بالکل اسی طرح میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اردو اخبارات سے جڑے ہوئے لوگ جوتا پالش سے چندی پاٹھ تک کا سارا کام تنہا کر لیتے ہیں۔ اردو اخبارات میں ایڈیٹوریل بورڈ نہیں ہوتا مختلف موضوعات پر لکھنے کے لئے مختلف لوگ نہیں ہوتے۔ چند لوگ ہی ہوتے ہیں، جو اداریے سے لے کر اشتہار تک کا کام بخوبی انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کی فنی مہارت، علمی لیاقت،

تجربات، تحریروں اور ان کی جانفشانی کی بدولت دنیا کی کسی بھی زبان کی صحافت اردو صحافیوں کو ادب اور احترام کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اردو صحافت میں احسن مفتاحی صاحب کا نام ہمیشہ ادب اور احترام سے لیا جائے گا۔ اردو صحافت کے آسمان پر ان کی تحریروں کے چاند ستارے ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔

ان تحریروں میں بیباکی کا خمیر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ان کی فکر میں ملت کے درد کا احساس موجود رہتا ہے، ان کے بیان میں بنگال کا باغی لہجہ سر اٹھاتا ہے۔ انھوں نے اخبار مشرق کی بنیادوں میں اپنی عمر کا وہ حصہ دفن کر دیا، جو دہلی میں صرف کیا ہوتا تو ابوالفضل انکلیو میں دو سوئز کی کوٹھی موجود ہوتی اور کئی اعزاز بھی ڈرائنگ روم کی الماریوں میں سجے ہوتے۔ لیکن بنگال کی مٹی بھی بنگال کی زلف کی طرح ہوتی ہے، جسے جکڑ لیتی ہے زندہ نہیں جانے دیتی ہے۔

ان کے قلم نے تلوار سے کاٹ سیکھی ہے۔ ان کے حسن اخلاق میں بنگال جیسی اپنائیت ہے۔ ان کی صحافت میں قلندرانہ چمک ہے، ان کے تبصروں میں فقیر کی سچائی ہے ان کے مضامین میں ان کی بے پناہ لیاقت موجود ہے۔

عمر بھی جسم سے کیسے کیسے کھلواڑ کرتی ہے اپنے زمانے کے تیز طرار، بے پناہ محنت کش، بے خوف گفتگو کرنے والے، بیباک تبصرہ کرنے والے مفتاحی صاحب اب ایک مفلوج انسان کی طرح زندگی گذار رہے ہیں، لیکن آج بھی ان کا قلم میدان ادب اور رزم گاہ صحافت میں پوری جوانمردی کے ساتھ نبرد آزما ہے۔

کاش مغربی بنگال حکومت اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی ان کی بے لوث ادبی صحافتی خدمات کے احترام میں ان کو کسی باعزت تمغہ افتخار سے نواز کر اپنی سابقہ کوتاہیوں کی پردہ پوشی کر لیتی۔

عہد دار و گیر میں ہر جرم میرے نام تھا
عہد انعام و کرم میں میں ہی چھٹ کر رہ گیا

☆☆

اطہر رضوی
مسی ساگا، انٹیریو، کینیڈا

بالاکوٹ

نژادنو کی تصویریں
چمن کے ناشگفتہ پھول
فضاء میں گونجتی شوخی بھری معصوم آوازیں
جو چند لمحوں کے عرصے میں
ہمارے وقت کے اگلے مقام نیست جا پہنچیں
مجھے کوئی بتائے
گر یہ ممکن ہے
کہ آخر کیوں؟

....

سنا ہے دامن کوہ کی کسی مسحور وادی میں
زمیں زادوں کی ایک بستی
پہاڑوں اور چٹانوں اور میدانوں کے دو جانب
چنار و شاہ بلوطی سرو کے پیڑوں کے سایوں میں
کہیں بہتے ہوئے چشمے، کہیں خاموش جھیلیں تھیں
گل نسرین، گل رعنا، گل صد برگ کے کنج تھے
جمال قدرت و فطرت کی ہر سو جلوہ گاہیں تھیں
اسے کچھ لوگ ارض خاک کی جنت سمجھتے تھے
اسی خوابوں کی بستی بیچ، اک چھوٹا سا قریہ تھا
اور اس چھوٹی سی بستی کو
قریب اور دور کے سب لوگ بالاکوٹ کہتے تھے

اور اس گاؤں میں بچوں کے لئے
اک مدرسہ بھی تھا
یہ مکتب علم اور اخلاق اور مذہب کی تعلیمات
جہاں میں اچھے انساں بننے کے اسباق دیتا تھا
صبح کی ضو میں سب بچے
جو سب معصومیت کے اور تقدس کے سراپا تھے
صباحت ان کی رنگت، پھول جیسے ان کے
چہرے تھے
لئے ہاتھوں میں بستے اپنی ماؤں ساتھ آتے تھے
وہ چلتے چلتے، ہنستے، چھیڑتے اور غل مچاتے تھے
اور ان ننھے فرشتوں کے گروہ میں نام کیا کیا تھے
کوئی مہران ان میں تھا، کوئی احمد، کوئی سلمان
کوئی زینب، کوئی مریم، کوئی تو فاطمہ ہوگی
کسی کو کیا پتا، ان میں کوئی کیا بننے والا تھا
بہت ممکن ہے ان میں کوئی سید اور کوئی اقبال
کوئی نصرت، کوئی عمران، کوئی شازیہ ہوتی
کسی کو اب نہیں معلوم، ان میں کوئی کیا ہوتا؟
کہ اکتوبر کی اک صبح کو بڑا منحوس دن نکلا
صبح ہوتے ہی یہ نوخیز اپنے مدرسے پہنچے
اور اپنی اپنی جگہوں پر

بڑی تکریم سے بیٹھے
کھڑے ہو کر وہ سب حمد الٰہی پڑھنے والے تھے
کئی لمحات پھر بیتے
یہ لمحے روح فرسا تھے، یہ لمحے گونگے بہرے تھے
یکا یک ایک دقیقے میں قیامت ان پہ آ ٹوٹی
یہ بے کس اور بے بس، نیک و صادق بے ریا بچے
وہ سارے ہو گئے نذر اجل، دفن زمیں ہو کر

......

مجھے کوئی بتائے
اگر یہ ممکن ہے کہ آخر کیوں؟
سنا ہے لوگ کہتے ہیں یہ وقت آزمائش ہے
کوئی اس کو کبھی قہر الٰہی نام دیتا ہے
کوئی مجھ کو بتائے
یہ کیسی آزمائش اور یہ کیسی مشیت ہے؟
خدائے برتر و بالا
تو ہے مختار اور مالک
تو ہے رحمٰن اور عادل
تو ہی رازق تو ہی خالق
ہے میری التجا تجھ سے
مجھے تو بخش دے وہ دانش اور ادراک، فہم غیب
جو میرے ذہن میں اترے
مجھے یہ بات سمجھا دے
کہ یہ معصوم اور خاکی فرشتے، تیرے پروردہ
انہوں نے کیا خطا کی تھا؟؟؟؟

☆☆

مامون ایمن
نیویارک

رباعیات

دن رات پہ رونے کا مزہ ہے کچھ اور
بے بات پہ رونے کا مزہ ہے کچھ اور
برسات میں رونا بھی ہے اچھا، لیکن
برسات پہ رونے کا مزہ ہے کچھ اور

☆

حالات کو زنجیر بنا رکھا ہے
آفات کو تعزیر بنا رکھا ہے
زنداں میں نہیں ہم، پہ سبھی خوابوں کو
جذبات کی تعبیر بنا رکھا ہے

☆

جلوت سے کٹے، کٹ کے نظارہ دیکھا
خلوت سے ہٹے، ہٹ کے نظارہ دیکھا
منزل کے لیے ہم ہوئے کرچی کرچی
رستوں میں بٹے بٹ کے نظارہ دیکھا

☆

منزل پہ ہر اک آن نظر رکھتے ہیں
دریا میں، سمندر کی خبر رکھتے ہیں
دُنیا میں ہیں جو لوگ بھی خود سے آگاہ
زندہ ہیں کہ جینے کا ہُنر رکھتے ہیں

☆

غزلیں

اقبال مرزا
ایڈیٹر ''صدا'' لندن

ایک میں ہوں اک مرا ہمزاد ہے
میں مقید ہوں تو وہ آزاد ہے

ڈھونڈتے پھرتے ہیں سب جائے پناہ
ہر طرف فریاد ہی فریاد ہے

بس کتابوں میں ملیں گے واقعات
اب کوئی شیریں ہے نہ فرہاد ہے

شورِ دنیا نے سماعت چھین لی
تیری میری بس یہی افتاد ہے

کل تلک تہذیب کا مرکز تھا جو
آج وہ اجڑا ہوا بغداد ہے

قاتلوں کی ٹولیاں ہیں جابجا
شہر یہ آباد یا برباد ہے

پوچھیے مرزا یہ سب سے پوچھیے
آج کا انسان کیا آزاد ہے؟

خزاں موسم سے پہلے چھا گئی ہے
سیاہی روشنی کو کھا گئی ہے

میں زندہ ہوں مگر شامل نہیں ہوں
غلط ہاتھوں میں دنیا آگئی ہے

مقدر کو الہنا دینے والو
یہی تفسیر تم کو کھا گئی ہے

بنامِ عدل کب تک ظلم ہوگا
یہ دنیا اب بہت اُکتا گئی ہے

وہ کیوں جینے سے عاجز آگئے ہیں
انہیں کیوں موت اتنی بھا گئی ہے

یہی قسمت جو کل تک مہرباں تھی
نہ جانے کیوں وہ اب کترا گئی ہے

مسیحا بن کے وہ پہنچے جہاں پر
وہاں کی ہر کلی مرجھا گئی ہے

غزلیں

حصیر نوری
کراچی، پاکستان

ہاتھ منھ دھویا نہیں بال بنایا ہی نہیں
خود نمائی کا ہنر مجھ کو تو آیا ہی نہیں

چین لینے نہیں دیتی ہے طلب راحت کی
ہم نے تجھ کو غم دل اپنا بنایا ہی نہیں

کوئی رستہ ہے، نہ منزل ہے نہ رہبر کوئی
میں کدھر جاؤں کسی نے یہ بتایا ہی نہیں

میں اسی شہر کا اے دوستو باشندہ ہوں
مجھ کو اس شہر نے تو اپنا بنایا ہی نہیں

اپنی تحریر میں چاہا تھا ترا ذکر کروں
حسن تیرا مرے الفاظ میں آیا ہی نہیں

کچھ نہیں مجھ کو ملا دشت نوردی کے سوا
سوچ کے آگے قدم میں نے بڑھایا ہی نہیں

عمر بھر لڑتے رہے اپنے ہی زخموں سے حصیر
اس نے چھٹکارا غم دل سے دلایا ہی نہیں

فیاض عادل فاروقی
لندن (یو۔کے۔)

زمانے پر جو حاوی ہیں کبھی شکوہ نہیں کرتے
زمانے کو بدلتے ہیں وہ خود بدلا نہیں کرتے

عمل کے جو شناور ہیں وہ واویلا نہیں کرتے
وہ آنسو پونچھتے ہیں خود کبھی رویا نہیں کرتے

ڈراتے ہیں جو دنیا کو وہ کچھ اچھا نہیں کرتے
بہادر لوگ دھمکی سے کبھی سہما نہیں کرتے

جو اپنے شیش محلوں میں سکونِ شب کے خواہاں ہیں
کسی کے گھر پہ وہ پتھر کبھی پھینکا نہیں کرتے

شکم پر باندھ کر پتھر کمر جو سیدھی رکھتے ہیں
کبھی غیروں کے آگے ہاتھ پھیلایا نہیں کرتے

انہیں تاریخ عبرت کا نمونہ ہی بناتی ہے
جو خود تاریخ سے کوئی سبق سیکھا نہیں کرتے

غزلیں

یعقوب تصوّر
ابوظہبی

صداقت کی تگ و دو مانگتا ہے
خیال اظہار کی لو مانگتا ہے

نظامِ بدلۂ احساں تعجب
کہ دیتا ایک ہے سو مانگتا ہے

پئے تزئینِ اظہار تخیل
سخن بھی اب فنِ نو مانگتا ہے

دیارِ تیرگی سورج کا دامن
اندھیرا دودھیا پو مانگتا ہے

ہنر تکمیل و تحصیل مقاصد
زمانہ برق سی رو مانگتا ہے

مقدر چاند، سورج نے ستارے
چراغ عشق کی ضو مانگتا ہے

تصوّر زیست کا صحرا یہ ہر دم
کسی چاہت کا پرتو مانگتا ہے

نہ کوئی راستہ فہم و ذکا ادراک سے نکلا
زمیں سے میں نکل پایا نہ وہ افلاک سے نکلا

ہے کائنات تو مرہونِ لفظِ اعتبارِ کن
مگر انسان کا پیکر گلِ نمناک سے نکلا

رہے لبریز ہر لمحہ مئے حب و عقیدت سے
نہ پیالہ آج تک کوئی بھی ایسا چاک سے نکلا

مرے بھائی نے یوں تبدیلیاں کرلیں وصیت میں
مرا حصہ نہ کوئی باپ کی املاک سے نکلا

سکندر، غزنوی، چنگیز خاں، اورنگ زیب، اکبر
کہاں کوئی قضا کے پنجۂ سفاک سے نکلا

نہ اب تک کائنات حسن کی تکمیل ہو پائی
نہ اب تک آدمی ہی عشق کے پیچاک سے نکلا

زمین و آسماں کو راکھ کر ڈالے گا دم بھر میں
کوئی شعلہ جو انبارِ خس و خاشاک سے نکلا

ہیں اجرام سبع افلاک تو کارِ خداوندی
مگر یہ سلسلہ خلق شہ لولاک سے نکلا

تصوّر ہے محیطِ دائرہ نہج حیات آسا
سو جزو خاک بن جاتا ہے آخر خاک سے نکلا

نظمیں

پروین شیر
کینیڈا

آخری اسٹیشن

صبح سویرے
جیون کی اس ریل کے ڈبے میں سب رشتے
ہم سفری کا اک جھوٹا احساس دلا کر
ساتھ ساتھ چلتے جاتے ہیں
اپنی باری پر ہر رشتہ
سیٹ سے اٹھ کر
اپنے اسٹیشن پر اتر کر
اوجھل ہو جاتا ہے آنکھوں کی کھڑکی سے
شام ڈھلے جب
آخری اسٹیشن آتا ہے
ڈبا خالی رہ جاتا ہے
تنہائی میں بھیگی آنکھیں
ڈبے کی ہر کھڑکی میں سے جھانک جھانک کر
وقت کی گہری دھند میں کھوئے
سب رشتوں کو
دور سے تکنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں! ☆

شکیلہ رفیق
کینیڈا

تنہائی

جب وہ کہتے ہیں
تنہائی سے سمجھوتہ کرلو
تب
میں ہنستی ہوں
کیسے نہیں ہوتا
یہ تنہائی ہی تو ہے
جو
ہمیشہ ساتھ رہتی ہے
باقی کون ہے جو ساتھ دے
تنہائی کا ساتھ بھی چھوٹ گیا
تو کیا ہوگا؟
یہ
اس کو کون بتائے
جس کے بعد
اک سناٹا ہے
اور اک
چپ ☆

غزلیں

خادمؔ حسین خاکسار

مدینہ منورہ، سعودی عرب

کچھ زندگی میں سود و زیاں ہونا چاہیے
گر روشنی نہیں تو دھواں ہونا چاہیے

فرصت اگر ملی بھی تو سوچا نہیں کبھی
سرسبز موسموں میں کہاں ہونا چاہیے

اب سوچنے لگے ہیں یہ خانہ بدوش بھی
صحرا میں دلنشیں سا مکاں ہونا چاہیے

دل میں عداوتوں کے بجائے مرے رقیب
چشمہ محبتوں کا رواں ہونا چاہیے

دیکھے ہیں کتنے دل نے عذابوں کے سلسلے
تھوڑا بہت خوشی کا سماں ہونا چاہیے

بڑھنے لگے ہیں ظلم حریفوں کے مستقل
لختِ جگر مرا بھی جواں ہونا چاہیے

ہر آدمی غلامِ تمنا ہے آجکل
کہتا ہے دسترس میں جہاں ہونا چاہیے

خادمؔ بڑھا رہے ہیں پسینے کے دام سب
اپنا بھی خون کچھ تو گراں ہونا چاہیے

سب چپ ہیں مگر شور مچائے گا کوئی تو
ہم نیند کے ماروں کو جگائے گا کوئی تو

جو زیست اجیرن کیئے بیٹھا ہے ہماری
اُس شخص کو تہذیب سکھائے گا کوئی تو

مجذوب ہو، درویش ہو، شاعر کہ قلندر
اے شوقِ جنوں تجھ سے ملائے گا کوئی تو

حاصل ہو شرف مجھ کو یہ مقصود نہیں ہے
دھرتی کو مگر خلد بنائے گا کوئی تو

رشتے وہ محبت کے کبھی توڑ گیا ہے
احساسِ زیاں اُس کو دلائے گا کوئی تو

یکساں کبھی رہتا ہی نہیں زیست کا موسم
روتے ہوئے لوگوں کو ہنسائے گا کوئی تو

دیوار کدورت کی دلوں میں جو کھڑی ہے
گر میں نہ گرا پایا گرائے گا کوئی تو

مرجاتا ہے فنکار مگر فن نہیں مرتا
اشعار مرے تم کو سنائے گا کوئی تو

خادمؔ مری رگ رگ سے نچوڑا ہے جو اُس نے
آخر وہ لہو رنگ دکھائے گا کوئی تو

غزلیں

ماسٹر نثار فتح پوری

2788، مدینہ منورہ

مانا کہ تو اس وقت مرے پاس نہیں ہے
ہے آس مجھے تجھ سے ابھی یاس نہیں ہے

ہر وقت تری یاد میں رہتا ہوں پریشاں
لیکن مجھے اس بات کا احساس نہیں ہے

کس دل سے کروں کیسے کروں تیری تمنا
نفرت بھی تری مجھ کو یہاں راس نہیں ہے

ممکن ہے خدا تم کو کبھی مجھ سے ملا دے
ویسے تو ملاقات کی اب آس نہیں ہے

تجھ کو بھی نہیں میری محبت پہ بھروسہ
مجھ کو بھی تری باتوں کا وسواس نہیں ہے

ایسا بھی نہیں تجھ سا نہیں کوئی جہاں میں
یاں تیری طرح اور میں بو باس نہیں ہے

گلشن کھنہ

برطانیہ

روشن کیے ہوئے ہیں چراغ خودی کو ہم
بہلا رہے ہیں غم سے تری زندگی کو ہم

جو تلخیِ حیات کے سانچوں میں ڈھل سکے
لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے اُس دوستی کو ہم

شام و سحر اُداس ہیں کلیوں کی دھڑکنیں
اب زہر جانتے ہی گلوں کی ہنسی کو ہم

اس عالمِ وجود کے ہر ایک موڑ پر
محسوس کررہے ہی تمہاری کمی کو ہم

حدِ نگاہِ شوق کی وسعت کے نور میں
تکتے ہیں روز و شب تری جادو گری کو ہم

گلشن میں رقص کرتی ہیں صحرا کی آندھیاں
لے جائیں اب یہاں سے کہاں بے کلی کو ہم

دلدل میں کسی جذب کو دھنستا پایا
اشکوں کی پذیرائی میں ہنستا پایا
اُلفت کا لیا نام جو ہم نے ، دل کو
خود ساختہ اک جال میں پھنستا پایا

مامون ایمن

غزلیں

غالب ماجدی

ہانسلو، لندن

ادھر دوڑو، اُدھر جھپٹو، ادھر لوٹو، اُدھر چھینو
کہ تم قزاق و رہزن ہو، میانِ بحر و بر چھینو

نوید صبح لے آیا ہے مہرِ ذوقِ خودداری
بڑھاؤ پھر اندھیرا، آؤ، دوڑو، یہ سحر چھینو

نمو کی سمت مائل ہے پرِ تخئیلِ انساں پھر
انہیں کچھ اور الجھاؤ، بڑھو، یہ بال و پر چھینو

یہ ہے مزدور اس پر ظلم کرلو، جس قدر چاہو
اُتارو جسم سے کپڑے اگر گھر ہے تو گھر چھینو

اک اک ذرہ اس عالم کا ہراک انساں کا حصہ ہے
تمہیں کیا حق پہنچتا ہے، یہ گنجِ منتشر چھینو

دکھاتا ہے تجھے ننگا ترے اعمال کا شیشہ
نہ توڑو ایسے شیشے کو جو دیکھے وہ نظر چھینو

تمہاری شان و شوکت کا اسی میں راز ہے پنہاں
نہ دو معقول قیمت اور محنت کے ثمر چھینو

ادیبوں کے قلم روکو خطیبوں کی زباں پکڑو
صحافی کو بھی دو رشوت مبصر کی نظر چھینو

کہوں گا میں تو سچ غالبؔ جو چاہو دو سزا مجھ کو
متاعِ دین و جاں لوٹو وفائے معتبر چھینو

ڈاکٹر رحیم اللہ شاد

لندن

ہر ایک زخم تمنا پہ مسکرا کے چلے
جو غم ملا اُسے دل کی خوشی بنا کے چلے

شب الم کی سیاہی کا رنگ اُڑا کے چلے
بجھے جو ہم تو ہزاروں دیے جلا کے چلے

مٹا کے خود کو وفا پر، وفا کی راہ میں ہم
کبھی جو مٹ نہ سکے نقش وہ بنا کے چلے

غبار ہو کے یہ پایا ہے مرتبہ ہم نے
چلے جو اُڑ کے کبھی دوش پر ہوا کے چلے

خزاں کے ماروں کو ہم نے دیا پیامِ بہار
ہر ایک لب پہ تبسم کے گل کھلا کے چلے

وہ مست مست نگاہیں ہیں یا کہ میخانے
جو اک نظر انہیں دیکھے وہ ڈگمگا کے چلے

غزل پہ شادؔ ہماری وہ جھک گئیں نظریں
ہم اپنے شعر کی کچھ آج داد پا کے چلے

غزلیں

حنیف ترین

ہوں آسمان سے ٹوٹا ہوا ستارا میں
خود اپنی تاب و تبِ زندگی کا مارا میں

اُسی کو اس کے سمندر میں غرق کر آیا
کئی یگوں سے تھا جس ناخدا کا مارا میں

میں وقت ہوں مری فطرت میں ہے سفر ہی سفر
نہ رہ سکوں گا کبھی منتظر تمہارا میں

خود اپنے جذبۂ سعی و عمل کو ٹھکرا کر
بنا جمود و تعطل کا استعارا میں

اگر تو تجھ سے اُچھالے تو معجزہ ہوگا
ہوں تیرے بحر کا ٹوٹا ہوا کنارا میں

خود اپنے گھر کی ہی ریشہ دوانیوں سے حنیفؔ
زمانے بھر میں رہا روکشِ نظارا میں

وسعتِ بے کراں میں ڈھونڈ مجھے
یعنی اہلِ زباں میں ڈھونڈ مجھے

زندگی کر گئی ہے آوارہ
قریۂ عاشقاں میں ڈھونڈ مجھے

ایک فنکار کا تخیّل ہوں
تو نہ کون و مکاں میں ڈھونڈ مجھے

آگ اور خون کا ہو کھیل جہاں
ایسے بے کل جہاں میں ڈھونڈ مجھے

مجھ میں 'صرصر' کی بے ثباتی ہے
منزلِ بے نشاں میں ڈھونڈ مجھے

تیری تقدیر کا ستارہ ہوں
اے زمیں آسماں میں ڈھونڈ مجھے

اک اثاثہ تھا نفع کا کل تک
اب مسلسل زیاں میں ڈھونڈ مجھے

غزلیں

اسحاق ساجد
(جرمنی)

اندھیری رات میں جگنو بہت ہیں
ہماری آنکھ میں آنسو بہت ہیں

ذرا ٹھہرو ابھی کچھ تشنہ کامو!
کنارے پر ابھی آہو بہت ہیں

ہوائیں کشتیوں سے کہہ رہی ہیں
یہاں پر لوگ بے قابو بہت ہیں

عمل پیرا یہاں کوئی نہیں ہے
نصیحت کرنے کو سادھو بہت ہیں

انہیں تلوار و خنجر کی ضرورت
ہمارے واسطے بازو بہت ہیں

اٹھاؤ ریت سے سر اپنا ساجد
تمہارے واسطے زانو بہت ہیں

اجڑے ہوئے مکان کو آباد کر رہے ہیں
اک بار پھر سے ماضی کو یاد کر رہے ہیں

جو سچ کہیں تو دشمن ، دشمن نہیں ہمارے
ہم کو ہمارے ہمدم برباد کر رہے ہیں

حالت ہوئی ہے اپنی یہ غم گساریوں میں
ہم آج بیکسوں سے فریاد کر رہے ہیں

سمجھے ہوئے تھے جن کو مدت سے بے سہارا
وہ لوگ بھی ہماری امداد کر رہے ہیں

جن کو سمجھ رہے ہیں ہم باکمال یارو!
کوئی نیا ستم وہ ایجاد کر رہے ہیں

توڑوں جو سحر غم کو لگتا ہے ایسا ساجد
ہم قید سے کسی کو آزاد کر رہے ہیں

غزل

زاہد امین زاہد
مدینہ منورہ

جب شام اودھ آخری بار آئی تو سمجھا
بلبل چمن میں سینہ فگار آئی تو سمجھا

وہ ہاتھ میں مالا لیے کیا بانٹ رہا ہے
زخموں پہ مرہم ہما کے بہار آئی تو سمجھا

محروم تمنا بھی بہت سے تھے سفر میں
چہروں سے ہوا پردہ اُتار آئی تو سمجھا

قبلے میں نیتوں کے کوئی فرق ہے ضرور
بادِ صبا سے بوئے غبار آئی تو سمجھا

آسان تھی کس درجہ یہ تنقید کسی پر
جب عقل مری آئینہ بار آئی تو سمجھا

وقت گزر نہ جائے

وقت بدلتے رہتے ہیں
لمحے چلتے رہتے ہیں
قومیں وہی پنپتی ہیں
جن کی نیندیں ہلکی ہوں
جن کے خواب سنہرے ہوں
جن کے در پہ پہرے ہوں
ڈر ہو تو بس اس دن کا
جس دن حشر بپا ہوگا
اور مالک کا لکھا
سب کے پیش دھرا ہوگا
آؤ اس دن کی فکر کریں
سرحد اور کشمیر چلیں
جن سے ہر شے چھوٹ گئی
قسمت پل میں لوٹ گئی
ماں کی گود کے بچے بھی
بالے عمر کے بچے بھی
سر سے باپ کا سایہ بھی
بہنوں کا ماں جایا بھی
اک کی چھاتی سوکھ گئی
اک کی ماں ہی روٹھ گئی
آؤ ان سے بات کریں
کچھ کے سر پر ہاتھ رکھیں
کچھ کے اشک سنبھالیں ہم
کچھ کو گود اٹھالیں ہم
وقت گزر ہی جاتا ہے
وقت گزر ہی جائے گا
لیکن لمحہ چھوٹا تو
لمحہ ہاتھ نہ آئے گا
سب تنہا رہ جائیں گے
اور بہت پچھتائیں گے
یہی وقت ہے کچھ کر لیں
اپنے رب کی رحمت
اپنی جھولی میں بھر لیں
لمحے چلتے رہتے ہیں
وقت بدلتے رہتے ہیں

یٰسین احمد

آسان نہیں ہے موت

وہ دونوں ریلوے اسٹیشن سے دور نکل آئے تھے۔

سامنے دور تک بل کھائی ہوئی پٹریاں تھیں جو نظروں کی رسائی سے اوجھل ہونے کے بعد یوں لگ رہی تھیں جیسے خلاؤں میں روپوش ہو گئی ہوں۔ ان ہی پٹریوں پر لڑکی اپنے ایک ہاتھ سے لڑکے کے کندھے کا سہارا لے کر چل رہی تھی۔ مخصوص نپے تلے قدم اٹھانے سے اس کے بھرے بھرے کولہوں میں ایک دلاویز تھرک پیدا ہو رہی تھی جسے نظریں پھیر پھیر کر لڑکا دیکھتا اور محظوظ ہوتا۔ وہ دونوں یوں چل رہے تھے جیسے تفریح کے لئے آئے ہوں۔ حالانکہ ایک انتہا پسندانہ اقدام کا عزم لے کر ادھر نکلے تھے۔

اوپر صاف شفاف اور نیلگوں آسمان پر سورج دمک رہا تھا لیکن اس کی دھوپ میں نرمی تھی۔ گرما رخصت ہو چکا تھا لیکن برکھا رانی نے ابھی اپنا جلوہ نہیں دکھایا تھا۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ پٹریوں کے دائیں جانب، نیچے ایک بہت بڑا نالا تھا۔ جس میں گرد و نواح کے محلوں کا گندہ پانی بہتا رہتا تھا۔ نالے سے لگ کر گھنے درختوں کا جھنڈ پھیلا ہوا تھا۔ جھنڈ سے ملحقہ ایک سڑک تھی اور سڑک سے لگ کر آبادی...... پٹریوں کے بائیں جانب نالا نہیں تھا، سڑک بھی نہیں تھی، مگر درختوں کا گھنا جھنڈ تھا اور حد بندی کے لیے ریلوے والوں نے آہنی جالیاں لگا دی تھیں۔ اس جالی کے بعد گنجان مکانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

لڑکا اسی علاقے میں رہتا تھا، یہاں کے محل وقوع سے خوب واقف تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ ٹھیک گیارہ بج کر پچپن منٹ پر ایک ایکسپریس ٹرین یہاں سے گذرتی ہے جو اسٹیشن پر نہیں رکتی۔ لڑکے نے سوچ سمجھ کر اس مقام کا انتخاب کیا تھا کہ ان کے مقصد کی تکمیل کے لیے یہ نہایت ہی موزوں مقام تھا۔

گیارہ بج کر چالیس منٹ ہو گئے۔

وہ دونوں چلتے چلتے رُک گئے۔ پہلے ایک نظر اِدھر اُدھر دوڑائی اور پھر پٹریوں پر لیٹ گئے۔ پٹریوں پر اس انداز میں لیٹے تھے کہ لڑکی کے پیروں کی طرف لڑکے کا سر تھا اور لڑکے کے پاؤں کی

طرف لڑکی کا سر۔ پٹریوں پر اپنا سر رکھ کر لڑکی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لڑکے کا ایک ہاتھ اپنے ایک ہاتھ کی گرفت میں لے لیا۔ لڑکے نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ وہ غور سے لڑکی کے پیروں کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کے پاؤں انتہائی خوبصورت تھے۔ پاؤں کی گلابی جلد پر کہیں بھی ہلکا سا داغ یا سیاہی کا نشان نہیں تھا۔ بے اختیار اس کے دل میں ایک خواہش ایک بے تاب لہر کی طرح اُبھری کہ وہ لڑکی کے اس خوبصورت پاؤں کو چوم لے۔ لیکن اس نے فوراً اپنی اس خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ اب جب کہ زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ بہ لحظہ لحظہ گھٹتا جا رہا ہے وہ اپنی پاکیزہ محبت پر حرص و ہوس کے گندے چھینٹے کیوں اُڑائے۔ تاہم بے ساختگی سے بولا۔ ''تمہارے پاؤں کتنے خوبصورت ہیں!''

لڑکی اپنی آنکھیں کھولے بغیر ہنس پڑی۔ ''آج تمہیں میرے پاؤں کی خوبصورتی کا احساس ہوا ہے جب کہ ہم اتنے سالوں سے ملتے ہیں......''

ایک پل کے لیے لڑکے کا وجود اداسی کی گہرائی میں ڈوب گیا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ آج تک میں نے جی بھر کر تمہیں دیکھا ہی نہیں'' نہ تمہارے پاؤں اور نہ تمہارے ہاتھ اور نہ تمہاری آنکھیں اور نہ تمہارا چہرہ اور ...... ! یقین مانو میں نے تمہیں ایسا چاہا ہے جیسے مندر میں پجاری آنکھ بند کر کے دیوی کو پوجتا ہے۔''

لڑکی نے اپنا سر پٹری سے اٹھا کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ لڑکے نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی نہیں تھی۔ چہرے پر حزن و ملال کے ذرا بھی آثار نہیں تھے وہ دونوں ہنستے ہنستے موت کو گلے لگانا چاہتے تھے۔ لڑکے نے آج دفتر سے چھٹی لے لی تھی اور ایک چٹھی اپنی جیب میں لکھ کر چھوڑی تھی جس میں اس نے اپنی خودکشی کی وجہ محبت میں ناکامی بتائی تھی۔ لڑکی بھی آج کالج نہیں گئی تھی اس نے بھی ایک خط اپنی ماں کے نام لکھ کر کیمسٹری کی نوٹ بک میں رکھ دیا تھا اس نے دبے لفظوں میں لکھا تھا کہ باپ کی بے جا سختیوں نے اس کو زندگی سے بیزار کر دیا ہے۔

۱۱ بجکر ۵۵ منٹ ہو گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ٹرین کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ ان کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ ان کو محسوس ہوا کچھ ہی سیکنڈ میں ٹرین دندناتے ہوئے آئے گی اور اس کے آہنی پہیے ان دونوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ٹرین نہیں آئی۔ دونوں کی آنکھیں بدستور بند تھیں کہ دفعتہً ایک تیز آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟''

بوکھلا کر دونوں نے آنکھیں کھولیں اور پھر فوراً اٹھ بیٹھے۔ ان کے سامنے ریلوے کا عمر رسیدہ ملازم کھڑا ہوا تھا۔ ان دونوں کو فوراً کوئی جواب نہیں سوجھا۔

''خودکشی کا ارادہ ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ دونوں نے بکے بکے ہو کر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بولا۔ ''اگر ایسا ہے تو سمجھ لو خطرے کی گھڑی ٹل چکی ہے۔ آج یہاں سے کوئی ٹرین نہیں چلے گی۔ آگے کے ایک پل کو نکسلائٹوں نے اڑا دیا ہے۔''

دونوں کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ دفعتہً اس کے تیور بدل گئے اور غصیلے لہجے میں بولا۔ ''میں آگے کی پٹریاں چیک کرنے جا رہا ہوں۔ واپسی میں تم دونوں مجھ کو یہاں نظر نہیں آنا۔''

یہ ان دونوں کی دوسری کوشش تھی جو ناکام ہو چکی تھی۔

خودکشی کے لئے پہلا انتخاب ان دونوں نے ٹینک بینڈ کا کیا تھا۔ حالانکہ لڑکی کو پانی سے بہت ڈر لگتا تھا لیکن لڑکے نے اس کی ہمت بندھائی تھی کہ پانی کی موت بہت آسان اور پُر سکون ہوتی ہے۔ جسم گھائل نہیں ہوتا اور نہ کوئی چوٹ آتی ہے اور نہ خون کے بہنے کا احتمال۔ اپنی ناک کو ایک ہاتھ کی انگلیوں سے دباؤ اور پانی میں چھلانگ لگا دو۔ تیراکی سے عدم واقفیت کی بناء پانی اپنے سینے کی گہرائیوں میں اتار لے جائے گا۔ سانسیں رُک جائیں گی اور کچھ ہی دیر میں دم گھٹ جائے گا۔

یہ تجویز لڑکی کو پسند آئی تھی۔ چنانچہ صبح وہ دونوں ٹینک بینڈ پہنچ گئے تھے لیکن وہاں پہنچ کر ان دونوں کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔ وہاں پولس کا سخت بندوبست تھا۔ ٹرافک کو ٹینک بینڈ کی نچلی سڑک پر موڑ دیا گیا تھا۔ پتہ چلا تھا کہ کسی تلگو فلم کی شوٹنگ چل رہی ہے۔ شوٹنگ دیکھنے کے لئے لوگ امڈ پڑے تھے۔ ایسی صورت میں اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانا کہاں ممکن تھا۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکل کر یہاں آئے تھے۔ اور یہاں بھی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

وہ دونوں مضمحل قدموں سے چلتے ہوئے ریلوے اسٹیشن سے باہر آئے۔ لڑکی نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ پون بج رہا تھا۔ جب دونوں گھروں سے نکلے تھے تب انہوں نے سوچا تھا کہ آج ان کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ لیکن اب بھی وہ زندہ تھے اور جاگتی آنکھوں سے دنیا کی ہما ہمی اور رنگینی دیکھ رہے تھے۔

لڑکا بولا۔ ''میری تجاویز ناکام ہو گئیں اب تم بتاؤ کیا کیا جائے؟''

لڑکی اس وقت تک ذہنی طور پر تیار ہو چکی تھی کہ اگلا اقدام کیا ہونا چاہیے، وہ بولی۔ ''ہم چار مینار چلتے ہیں وہاں پر ہر دن سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے، ہم ان میں شامل ہو جائیں گے اور کسی مینار کی بلندی سے چھلانگ لگائیں گے۔

تجویز معقول تھی۔ لڑکی نے حامی بھر لی۔ بھرے پُرے بارونق بازار میں مرنے کا مزہ بھی کچھ اور ہوتا ہے۔ لمحاتی طور پر ہی سہی انگنت آنکھیں تاسف اور ہمدردی سے آبدیدہ ہو جاتی ہیں۔ پولس

منٹوں میں جائے واردات پر پہنچ جاتی ہے اور فوراً لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی جاتی ہے۔ میڈیا والے بھی دوڑے دوڑے چلے آتے ہیں اور متعلقین کو منٹوں میں خبر ہو جاتی ہے۔ مگر پانی میں مرنے کا منفی پہلو یہ ہے کہ لاش ۲۴ گھنٹے کے بعد پھول کر باہر آ جاتی ہے۔ کسی بھلے مانس کی نظر پڑ جائے تو ٹھیک ہے ورنہ لاش سڑتی گلتی رہتی ہے۔ ٹرین سے کٹ کر مرنے سے بھی کچھ ایسی ہی حالت ہوتی ہے ۔بھوکے کوے اور گدھ پہلے پہنچ کر منڈلاتے رہتے ہیں۔

لڑکی نے کہا۔ ''لیکن چار مینار جانے سے پہلے ہم کچھ کھا پی لیں گے۔ میں صبح صرف لیمو پانی پی کر نکلی تھی۔''

''میں نے بھی صرف ایک چائے پی تھی۔ حالانکہ ماں بہت اصرار کر رہی تھی کہ ناشتہ کر کے باہر نکلوں'' ۔لڑکا بولا۔ ''ہم راستے میں کسی ہوٹل میں کچھ کھا پی لیں گے۔''

وہ دونوں ایک آٹو رکشہ میں بیٹھ گئے۔ آٹو رکشہ کو انہوں نے سالار جنگ میوزیم جانے والی سڑک پر روکا تھا، وہیں پر واقع ایک ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل کی بالائی منزل کے گوشہ میں بیٹھ کر کھانے کا آرڈر دیا گیا۔ وہ دونوں جہاں بیٹھے تھے وہاں سے باہر نیا پل پر بھاگتی ہوئی ٹرافک دکھائی دے رہی تھی لیکن صرف متحرک لوگ اور گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ کوئی شور، کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، جیسے زندگی بے آواز ہو گئی ہو۔ دائیں جانب ہائی کورٹ کی پر شکوہ عمارت تھی اور دواخانہ عثمانیہ کی بلند و بالا عمارت۔ ان دونوں عمارتوں کے درمیان موسیٰ ندی حائل تھی جو اب خشک ہو چکی تھی۔ خود غرض سیاسی رہنماؤں نے سلطنت آصفیہ کے دور کی نشانیوں کو مسخ کر دیا تھا۔ لڑکا گلاس سے باہر کے مناظر دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں اس شہر میں ۲۶ برس کا ہو گیا ہوں لیکن نہیں جانتا کہ ہمارا شہر کتنا خوبصورت ہے، کتنا بڑا ہے!''

لڑکی کے ہونٹوں پر ایک پھیکا سا تبسم نمودار ہوا۔ ''میں نے بھی آج تک سالار جنگ میوزیم نہیں دیکھا، حالانکہ ۲۱ برس کی ہو چکی ہوں۔ اگر تم مل جاتے ساری دنیا گھومتے پھرتے اور کتنے مزے سے زندگی کرتے۔''

ان دونوں پر خاموشی چھا گئی، ایک اضطراب آمیز خاموشی ...... جس نے اداسی کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اسی لمحہ میں ویٹر نے میز پر کھانے پینے کی اشیاء رکھ دیں۔ وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ٹہلتے ہوئے چار مینار پہنچ گئے۔ اس وقت چار مینار کے اطراف حسب معمول شور و غل تھا۔ ٹھیلوں پر کاروبار کرنے والے' سائیکل' آٹو رکشہ اور بس میں سفر کرنے والے پیدل چلنے والے پولس کی بے مصرف سیٹیاں، ہارنوں کی بے ہنگم آوازیں، سیاحوں کا ہجوم، بے مقصد آوارہ پھرنے والے نوجوان، معصوم صورت بنائے پھرنے والے گداگر، ان سب سے بے نیاز اور

لاتعلق ہوکر لڑکا داخلہ ٹکٹ خریدنے کے لیے بڑھا۔

لیکن وہاں کھڑکی پر Close کی تختی لٹکی ہوئی تھی۔ لڑکے کو حیرت ہوئی اس نے ایک سیکورٹی گارڈ سے پوچھا۔ ''کیا داخلہ بند کردیا گیا ہے۔''

سیکورٹی گارڈ بولا۔ ''سیاحوں کا غیر معمولی ہجوم دیکھ کر احتیاط کے طور پر ابھی ابھی داخلہ روک دیا گیا ہے۔''

ان کی تیسری کوشش بھی رائیگاں گئی۔ ان پر خاموشی چھا گئی۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کی صورت تکتے رہے۔ کچھ لمحوں بعد لڑکی آہستگی سے بولی۔ ''موت بھی ہم کو جگہ دینا نہیں چاہتی۔''

لڑکا پرامید لہجے میں بولا۔ ''ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ زندگی ہم سے ناطہ توڑنا نہیں چاہتی۔'' ایک بیک لڑکے کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''لیکن ہم کیوں خودکشی کریں؟ ہم زندہ رہیں گے، ہم کمزور نہیں ہیں۔ ہم لڑیں گے، حالات سے، دنیا سے، دنیا والوں سے اور ان لوگوں سے جو ہماری راہ میں حائل ہورہے ہیں۔''

لڑکی اس کا چہرہ تکتی رہی اور پھر فوراً وہ چونک پڑی اس نے وقت دیکھا اور کہا۔ ''چار بج چکے ہیں میں گھر جاؤں گی، ماں رات کا کھانا جلد کھانے کی عادی ہے، کھانے سے پہلے ماں کو انسولین دینا پڑتا ہے۔''

لڑکا بولا۔ ''میں بھی گھر چلوں گا، راستے میں ATM سے پیسے نکالنا ہے۔ آج پہلی تاریخ ہے، ماں کو تنخواہ دینا ہے۔''

عمارت سے نکل کر وہ اُدھر آئے جہاں سڑک بٹ جاتی تھی۔ لڑکے نے ہولے سے لڑکی کا ایک ہاتھ دبایا ایک الوداعی نظر اس پر ڈالی اور پھر وہ دونوں اپنے اپنے راستے پر مڑ کر انسانوں کی بھیڑ میں کھو گئے۔

☆☆

مضطر انصاری

مرد خور عورت

مرد خور عورت کی اصطلاع صحیح ثابت کرنے کے لئے مجھے کافی تحریری محنت کرنا ہوگی۔ نہ جانے کتنے لفظوں اور جملوں کے جنگل سے گزرنا ہوگا۔ اپنی رہائش گاہ کا محل وقوع کا جغرافیہ بھی تفصیل سے بیان کرنا ہوگا۔ اور جائے حادثہ، یعنی واقعہ ظہور پذیر ہونے کا مقام بھی ظاہر کرنا ہوگا۔ واقعہ میں دلچسپی کا عنصر پیدا کرنے کے لیے تھوڑا بہت جھوٹ بھی تحریر کرنا ہوگا۔ اسے نمک مرچ لگانا بھی کہتے ۔مجبوری کی بات ہے افسانہ میں جب تک نمک مرچ نہ لگایا جائے تو وہ مولوی صاحب کا خالص اخلاقی لیکچر بن جاتا ہے۔

میری رہائش گاہ ایک لمبی چوڑی سڑک کے کنارے واقع ہے۔ اس کے دونوں اطراف سر بلند عمارتیں کھڑی ہیں۔ سڑک دو تین کلومیٹر شمال کی جانب گئی ہے جس کے دونوں طرف یوکیلپٹس کے لامبے لامبے درخت کھڑے ہیں۔ درختوں کا یہ سلسلہ دو کلومیٹر کی دوری تک جاری رہا ہے۔ پھر ہولناک جنگل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی جنگل کے درمیان مسلم قبرستان ہے۔ برسات کے موسم میں قبرستان خودرو پودوں سے ڈھک جاتا ہے۔ قبریں نہیں دکھائی دیتی ہیں۔ سانپ اور دوسرے کیڑے مکوڑے گھاس میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ کچھ کیڑے مکوڑے آوازیں بھی لگاتے ہیں۔ یہ آوازیں قبرستان کی دہشت میں اضافہ کرتی ہیں۔ مئی جون میں خودرو پودے غائب ہو جاتے ہیں۔ قبریں صاف دکھائی دینے لگتی ہیں۔ سڑک پر سے رات میں کوئی راہ گیر گزرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ جھاڑیوں کی آڑ میں چور ڈاکو چھپے بیٹھے رہتے ہیں اور موقع پا کر راہ گیر کو لوٹ لیتے ہیں۔ دن کی روشنی میں سڑک پر راہ گیر نظر آجاتے ہیں۔ تیز قدموں سے سڑک پار کرتے ہیں اور اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ دولت مند افراد نے اپنے مرحوم متعلقین کی قبروں کی نگہداشت کے لیے چوکیدار رکھ چھوڑے ہیں۔ ان چوکیداروں میں ضعیف عورتیں بھی شامل ہیں۔ یہ چوکیدار صرف دن کی روشنی میں قبروں کی حفاظت کرتے ہیں۔ شام ہوتے ہی اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ شیروں کے ڈر سے شام ہوتے ہی قبرستان کی فضا پر سناٹا مسلط ہو جاتا ہے۔ کوئی بھولا بھٹکا راہی سڑک پر دکھائی دے جاتا ہے ورنہ نہیں۔ قبرستان کے شروع میں یعنی قبروں کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے ہی ایک گہرا نالہ ہے یہ

نالہ قبرستان کے جنوبی حصہ سے ملحق ہے جو ندی کے ریتیلے میدان تک جاتا ہے۔ ندی قبرستان کے مغرب میں بہتی ہے اور نالہ شہر کا گندہ پانی سمیٹ کر ندی تک لے جاتا ہے۔ یہاں دن کی روشنی میں مچھلی کا شکار کھیلنے والے شوقین اکثر دکھائی دے جاتے ہیں۔ مچھیرے بھی نظر آجاتے ہیں۔ ریتیلے میدان میں فصل زائد کی کاشت کی جاتی ہے۔ اس لئے کسان بھی نالہ سے ملحقہ پگڈنڈی کے ذریعہ ریتیلے میدان آتے جاتے رہتے ہیں مگر صرف دن میں۔ احقر کی رہائش گاہ ایک منزلہ ہے۔ عمارت پختہ اور خوبصورت ہے۔ چھت پر دوسری منزل کی تعمیر کا سلسلہ زیرِ غور ہے۔ امید ہے جلد ہی دوسری منزل کی تعمیر بھی مکمل ہوجائے گی۔ رہائش گاہ میں، میں نے کلینک کھول رکھا ہے جو سڑک سے ملحقہ کمرے میں ہے۔ میں ایم. بی. ایس. ڈاکٹر ہوں۔ پڑوس کے تقریباً سارے مریض میرے کلینک میں آتے ہیں اور شفایاب ہوتے ہیں۔

میری چھت کے سامنے مغرب کی سمت میں ایک دومنزلہ مکان ہے۔ اس میں علی حسین نامی شخص رہتا ہے، اپنی فیملی کے ساتھ۔ نچلی منزل میں علی حسین اپنے بڑے لڑکے اصغر اور بہو سلطانہ کے ساتھ رہتا ہے۔ اصغر کے چار بچے ہیں جو روز ہی سڑک پر کھیلتے ہوئے نظر آجاتے ہیں یا اسکول جاتے ہوئے دکھائی دے جاتے ہیں۔

عمارت کی بالائی منزل پر نور بانو جو علی حسین کی بڑی بہو ہے، اپنے دو شریر بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ جوان ہے خوبصورت ہے، رعنائی اور جنسی کشش کی دولت اس پر خدا نے دونوں ہاتھوں سے لٹائی ہے۔ مجھے اس کی مسکراہٹ اور رعنائی دیکھنے کا شوق ہی نہیں، مرض بھی ہے۔ سچ پوچھیے تو نور بانو عورت نہیں، روایتی پری ہے۔ آپ اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں کہ میں اس پر ہزار جان سے عاشق ہوں۔ عشق سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ کیوں کہ قیس عامری کے خاندان سے نہیں ہوں۔ بس جمالیات کا شیدائی ہوں۔ جنسی تلذذ اور عشق دو الگ الگ جذبے ہیں۔ جاڑے کے موسم میں چھت پر لکھتا پڑھتا ہوں۔ نور بانو اپنے کمرے کے سامنے برآمدہ میں بیٹھتی ہے اور اپنے دونوں لڑکوں کو اسکول کی نصابی کتابیں پڑھاتی ہے۔ دھول دھپا بھی کرتی ہے۔ چوری چوری میری نقل و حرکت کا جائزہ بھی لیتی رہتی ہے۔ میں بھی اسے کسی وقت چور نظروں سے دیکھ لیتا ہوں۔ پھر لکھنے میں مصروف ہوجاتا ہوں۔

نور بانو بڑے دولت مند شخص کی بیوہ ہے۔ لاکھوں کی جائیداد کی مالکہ ہے۔ دوسرا نکاح کر کے شوہر کی دولت اور جائیداد سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتی۔ وہ جوانی کے آگ اگلتے دور میں بیوہ ہوئی ہے۔ زمین کے ایک جھگڑے میں اس کا شوہر شوکت علی چار سال پہلے مارا گیا۔ اب نور بانو ساس سسر

کے سہارے زندگی بسر کر رہی ہے۔ دونوں بچے اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔ دونوں شریر ہیں۔ نور بانو ضبط نفس کا عہد کر رکھا ہے۔ مجھے اپنے والدین کی قبروں پر جانے اور ان کی حفاظت وہ نگہداشت کرنے کا جنون ہے۔ میں صبح ہی صبح اٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں اور قبرستان کی جانب چل دیتا ہوں۔ وہاں کم سے کم آدھا گھنٹہ رکتا ہوں۔ والدین کے دوستوں، اپنے متعلقین اور واقف کاروں کی قبروں کو ضرور دیکھتا ہوں۔ دولت مند احباب کی قبروں پر نظر ضرور ڈالتا ہوں۔ انکی قبروں کی خستہ حالی سے عبرت حاصل کرتا ہوں۔ کبھی کبھار قبرستان جاتے وقت نور بانو سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر شوکت علی کی قبر دیکھنے کی عادی ہے۔ دور سڑک پر کھڑے ہوئے قبر دیکھتی ہے۔ قبرستان کے اندر جانے کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ کیوں کہ کیڑے مکوڑوں سے بہت ڈرتی ہے۔ پڑوسی عورتوں سے کہتی ہے ''اگر سانپ کاٹ لے تو عورت دو چار گھنٹوں میں زمین کے اندر سما جاتی ہے۔ اگر مرد عورت کی جوانی پر دانت مار دے تو وہ نو مہینے کے لیے بھوسا گاڑی بن جاتی ہے۔ ذہین عورتوں کو ہمیشہ اپنے پاس ایسی کوئی چیز رکھنا چاہیے جو ان کو بھوسا گاڑی بننے سے بچائے اور لطف و نشاط کے حصول میں مددگار ثابت ہو۔ زندگی عیش و عشرت کا دوسرا نام ہے۔''

راستہ طے کرتے ہوئے جب بھی نور بانو مجھے قبرستان کے سامنے والی سڑک پر ملی اس نے ایک تجزیاتی نظر میرے چہرے پر ضرور ڈالی۔ کئی بار مجھ سے بات کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ ویران سڑک پر بات کرنا مناسب نہ تھا، جو بھی معلومات حاصل ہوتی تھی، اس کے متعلقین کے ذریعہ معلوم ہوتی تھی۔

آپ خوب جانتے ہوں گے کہ مرد تنہائی میں خوبصورت عورت دیکھ لے تو اس کے اندر آگ کا سمندر ہلکورے لینے لگتا ہے۔ وہ بس ایک ہی بات سوچتا ہے، عورت پکے عام کی طرح اس کی جھولی میں آ گرے اور وہ اس کی جوانی کا سارا رس چوس لے۔ میں نور بانو کی جوانی کا رس چوسنے کے حق میں نہ تھا۔ کیوں کہ وہ بیوہ تھی۔ تجرد کی زندگی گزار رہی تھی۔ یوں بھی میری جوانی کا بیشتر حصہ پاک بازی اور ضبط نفس کی پابندی کرتے گزرا تھا۔ پڑوسی میری بلند کرداری کے معترف تھے۔ میری عزت کرتے تھے۔ بہر کیف اتنی بات ضرور تھی کہ پھولوں میں رہتا تھا اور خوشبو سے دامن بچاتا تھا۔ یہ آسان کام نہ تھا۔

ایک دن کی بات ہے۔ والدین کی قبروں کے قریب سے گزرتا ہوا سڑک پر آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت سڑک پر کھڑی ہے۔ ایک ڈنڈا ہاتھ میں تھامے۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ قبروں کی نگہداشت کرنے والی چوکیدار عورت تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے جمپر کی جیب میں

ہاتھ ڈالا وہاں سے ایک پرچہ نکالا۔ پرچہ میں نے پڑھا۔ اس پر جواب لکھا۔ ''نور بانو، تمہارے لیے زردوھ سے اچھی کوئی چیز نہیں۔ بیوہ عورتوں اور کنواری لڑکیوں کی عزت محفوظ رکھتا ہے۔''

میرا جواب بوڑھی عورت پڑھ نہ سکی۔ اس نے پرچہ جیب میں رکھ لیا اور واپس چلی گئی۔ میں کلینک واپس آ گیا۔ ناشتہ کیا اور مریض دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

اس دن موسم خوشگوار تھا۔ مچھلی کے کباب کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ کلینک بند تھا۔

میں نے شکار کا تھیلا اٹھایا۔ معمولی لباس پہنا۔ بندوق بازو میں لٹکائی۔ چھاتا لیا اور پیدل ہی قبرستان کی طرف چل دیا۔ کیوں کہ دل ہی دل میں ندی جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ بندوق ساتھ رکھنا ضروری تھا۔ خطرناک اور بدنام ترین علاقہ میں جا رہا تھا۔ جب میں قبرستان کے سامنے والی سڑک پر پہنچا تو خودرو پودوں کی سربلندی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میرے دونوں طرف ہرے بھرے پودوں کی باڑھ سی آئی ہوئی تھی۔ یوکیلپٹس کے درخت بھی ہرے بھرے دکھائی دے رہے تھے۔ مانسونی ہوا کے جھونکے خوشی کا سرور دل و دماغ میں پیدا کر رہے تھے۔ چلتے چلتے میں نالے کی طرف بڑھا، ندی کنارے پہنچنے کے لیے میں نے دیکھا ہرے بھرے درختوں کے نیچے ایک عورت جا رہی تھی۔ شلوار اور جمپر پہنے۔ وہ نالہ کے کنارے کنارے چوڑی پگڈنڈی پر چل رہی تھی۔ پشت میری جانب تھی۔ چال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ نور بانو ہے۔ شاید وہ ڈر رہی تھی۔ کیوں کہ بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو کھڑی ہو گئی۔ زور سے گڈ مارننگ کہا اور بلاضرورت مسکرا دی۔ سر ہلا کے میں نے اس کا سلام قبول کیا اور آگے بڑھنے لگا۔

اس نے ناز سے گردن جھٹکی اور کہا ''اگر زحمت نہ ہو تو مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے چلیے۔ ندی کی سیر کروں گی۔ کہاں تک ڈروں اس کے جسم کے گدازوں سے آگ برس رہی تھی۔ پہلی بار آج میں نے اسے اتنے قریب سے دیکھا تو میری پاکبازی کا شیش محل ڈگمگا سا گیا۔ میرے اندر ہلچل سی پیدا ہوئی۔ میں تو مرنے جا رہا ہوں۔ تم فی الحال مرنے کا خیال مسترد کر دو کیوں کہ دو بچوں کی ماں ہو۔ میں نے نور بانو سے کہا۔

''میں مرنے کو قطعی تیار نہیں ہوں۔ زندگی سے لذتیں حاصل کرنے کی متمنی ہوں۔ عمدہ کھانا، اچھا لباس اور عیش و عشرت، بس یہی خواہشات ہیں میری۔''

میں ہنس دیا۔ سوچنے لگا۔ اس نے جنسی بھوک کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ اگلے ہی پل ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اس کے جسم کی خوبصورت اور پرکشش گداز میرے ذہن میں پہاڑی، ندی کی سی

ہلچل پیدا کر رہے تھے۔ بہتا ہوا گہرا نالہ، ہرے بھرے خودرو پودے، سربلند درختوں کے سائے اور چوڑی پگڈنڈی پر ہری گھاس کا دلکش فرش، فطرت کے یہ نظارے میری روح کو سرشار کر رہے تھے اور مردانہ حیثیت کے پھول برسا رہے تھے۔

ندی کنارے پہنچتے ہی میں نے ریتیلے میدان کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ دور دور تک کسی چرندے یا پرندے کا پتہ نہ تھا۔ ریتیلے میدان سے دور مغرب کی سمت میں ہرے بھرے کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ دھندلے دھندلے سے۔

میں نے شکاری ڈوروں کے سرے ندی کی گہرائی میں اچھال دیئے اور اس جھونپڑی کی طرف دیکھنے لگا جو کسی کسان نے فصل زائد کی نگہداشت کے لیے بنائی ہوگی۔

نور بانو دونوں گھٹنے سینہ سے لگائے میرے پہلو میں بیٹھی تھی اور پانی کی سرکش لہروں کو دیکھ رہی تھی جو ندی کے کنارے سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں خاموش تھا۔ عورت ذات کی حفاظت کا احساس میرے ذہن میں ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ اس وقت بھی تابناک اور ضوفشاں تھا۔

موسم کی خشک ہواؤں نے ستم ڈھایا۔ بوندا باندی شروع ہوگئی۔ میں بدحواس ہوگیا۔ نور بانو گہرے سیاہ بادلوں کو دیکھنے لگی اور بڑبڑانے لگی۔ میں بدحواس ہوگیا تھا۔ شکار کا تھیلا ساتھ لیا۔ بندوق بازو میں لٹکائی اور کسان کی جھونپڑی کی طرف بھاگنے لگا۔ نور بانو بھی بھاگنے لگی۔ بھاگتے ہوئے وہ تین بار ریتیلی زمین پر گری۔ فوراً اٹھی۔ کپڑے جھاڑے، بالوں پر ہاتھ پھیرا، پھر میرے پیچھے بھاگنے لگی۔ میں ہنس رہا تھا۔ اپنی حماقت پر۔ آخر برسات میں شکار کا شغل کیوں اپنایا تھا۔

میں چند ہی لمحوں میں جھونپڑی کے اندر پہنچ گیا۔ بعد میں نور بانو بھی آگئی۔ اپنی جوانی اور گدازوں کا حشر ساماں منظر لیے۔ وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ ہوائیں تیز جھکڑ جھونپڑی سے ٹکرا رہے تھے۔ ریت اڑ رہی تھی جو ہوا کا ساتھ دے رہی تھی۔ بوندوں کی آوازیں شور کی ہلچل میں دبی دبی سی نکل رہی تھیں۔ نور بانوں کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ نمایاں تھی۔ میں نور بانو کی آنکھوں میں جھانکنے لگا اور سوچا کہیں نور بانو تنہائی سے پریشان تو نہیں ہے۔ وہ کوئی غلط مطلب تو نہیں نکال رہی ہے۔ ابھی تک میری نیت درست تھی۔ عورت کی آبرو کی حفاظت کا خیال اب بھی میرے ذہن میں مضبوط تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے نور بانو سے پوچھا ''اب کیا کیا جائے نور بانو؟''

''کبڈی کھیلنا شروع کر دیجئے''۔ نور بانو ہنس پڑی۔ انداز طنزیہ نہیں برمزاح تھا۔

کسان کی جھونپڑی کئی جگہ سے ٹپک رہی تھی۔ نور بانو بھیگنے لگی۔ میری خوش قسمتی

دیکھئے۔ مجھ پر پانی نہیں ٹپک رہا تھا۔

نور بانو پُر معنی انداز میں مسکرائی۔ کھسک کر میرے قریب آگئی۔ اس قدر میرے نزدیک بیٹھی کہ اس کی سانسیں میری سانسوں سے ٹکرانے لگیں۔ عجیب سی کشمکش کی لکیریں اس کی آنکھوں میں جھلک رہی تھیں۔ دوسرے لحہ یہ لکیریں ہلکی سی مسکراہٹ میں بدل گئیں۔ چہرے پر شرم کے نقوش ابھر آئے۔ اس نے اپنی صندلی باہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں۔ میں الاؤ میں دہکتے ہوئے انگاروں کی مانند جل اٹھا۔ آگ تو آگ ہی ہے۔ جسم کی آگ بھی شعلوں سے زیادہ اثر انگیز اور تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ چند ہی لمحوں میں نور بانو کے آگ اگلتے ہوئے جسم نے میرے کردار کی عظمت مٹی میں ملا دی۔ میں اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ قصوروار میں بھی تھا۔ کچھ عمل مجبوری میں کیے جاتے ہیں جو گناہ گار بنا جاتے ہیں۔ ہوش وحواس اور عقل کو دیمک لگا جاتے ہیں۔ بیس پچیس منٹ کے بعد میں نے زمین پر پڑے ہوئے استعمال شدہ نرودھ کو دیکھا۔ نور بانو کے چہرے پر نظر ڈالی وہاں ناگواری کے کانٹے نہیں، خوشی اور جسمانی تسکین کے خوبصورت گلاب جھول رہے تھے۔

نور بانو سے میں نے مسکرا کے کہا ''بیگم صاحبہ اس نعمت کو جو زمین پر پڑی ہوئی ہے اور ہمارے چہروں پر کالک پوت رہی ہے، فوراً اسے اٹھالو اور گندے نالہ میں پھینک آؤ۔''

نور بانو شوخی سے مسکرائی۔ اپنی نظریں میری نظروں میں اتاریں، بولی '' پیارے ڈاکٹر، ابھی نہیں آپ دوبارہ ناپاک ہونے کے لیے بضد ہوئے تو مجھے بھی مجبور ہونا پڑے گا۔ ابتدائی محبت کا تقاضا بھی ایسا ہی ہے۔ دونوں بار کی دونوں نعمتیں ایک ساتھ نالہ میں پھینک آؤں گی۔ جلدی نہ کیجئے۔ دلکش موسم کی خاموش طلب پر نظر رکھئے!''
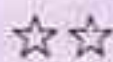
☆☆

دیپک کنولؔ

فاصلے

حاکم دین کا ڈھوکا لائن آف کنٹرول سے چار ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ لائن آف کنٹرول وہ سرحد ہے جو کشمیر کو دو حصوں میں بانٹتی ہے۔ ایک حصہ اس طرف ہے، جس میں جموں اور لداخ بھی شامل ہے اور ایک حصہ اُس طرف جو پاکستان کے کنٹرول میں ہے۔ اُدھر والے حصے کو وہ لوگ آزاد کشمیر کہتے ہیں اور ہم اسے مقبوضہ کشمیر کے نام سے جانتے ہیں۔ حالات کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اس ریاست کی طرح ہی دلوں کے بھی کئی ٹکڑے ہوگئے۔ ایک ٹکڑا ادھر گرا تو ایک ٹکڑا اُدھر۔ سن سنتالیس کے قبائلی حملے کے بدسینکڑوں خاندان دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک بھائی اس طرف رہ گیا تو دوسرا بھائی اس طرف۔ بس رہ گیا اوڑی کا یہ پُل جو ان دونوں حصول کو ملاتا ہے۔ اس پُل کا نام لال پُل ہے جو برسوں سے کسی راہ گیر کے قدم چومنے کے لیے ترس رہا ہے۔ برسوں سے یہ پُل دل میں یہ حسرت لیے ویران اور اُداس آنکھوں سے کبھی اس طرف کے باسیوں کو دیکھتا رہتا ہے تو کبھی اُس طرف کے لوگوں کو نہارتا رہتا ہے۔ اس پُل کی دیکھ بھال کرنے والا اگر کوئی ہے تو وہ اس سے لگی ایک آرمی پوسٹ ہے جس کا نام امن سیتو ہے۔

حاکم دین اُوڑی کی ان ہی پہاڑیوں پر رہتا تھا جہاں سے وہ اُس طرف کے لوگوں کی نقل و حرکت کو دیکھ تو سکتا تھا مگر اُن سے مل نہیں سکتا تھا۔ بیچ میں جو ندی ایک لکیر کی شکل میں بہتی تھی اس کا پانی دونوں اطراف کو میسر تھا مگر کنارے جدا جدا تھے۔ ایک کنارے پر پاکستانی رینجروں کا قبضہ تھا اور دوسرے کنارے پر ہندوستانی افواج کا۔ بیچ میں یہ جو ندی بہتی تھی وہ آزاد تھی۔ آج تک کوئی بھی ملک نہ اس کی روانی پر روک لگا پایا تھا اور نہ ہی اس کی سرکشی کو دبا پایا تھا۔ یہ شوریدہ سرندی کبھی شاندار بہتی تھی تو کبھی بے قابو ہو جاتی تھی۔ یہی حال پرندوں اور چرندوں کا تھا۔ وہ جب چاہتے تھے اُدھر سے ادھر چلے آتے تھے۔ کوئی انہیں روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ ان کے لیے نہ یہ سرحد کوئی معنی رکھتی تھی نہ اس سرحد پر پہرہ دینے والے۔ آزاد پنچھی جو ٹھہرے۔ بس اگر ممانعت تھی تو وہ تھی صرف انسانوں پر۔ شاید اسلئے کہ ہر فساد کی جڑ انسان ہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ جس قوم کا ہو یا جس ملک کا، تعمیر کے ساتھ ساتھ تخریب بھی

اس کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔

حاکم دین اوڑی کا باسی تھا۔ اس کے پاس کئی بھینسیں تھیں جن کا دودھ، مکھن بیچ کر وہ اپنا گزارہ چلاتا تھا۔ وہ صبح صبح دودھ بیچنے سلام آباد چلا جاتا تھا۔ وہاں سے لوٹ کر آتا تھا پھر وہ دودھ مکن امن سیتو پر دینے چلا جاتا تھا۔ امن سیتو کی پوسٹ پر جتنے بھی فوجی طعینات تھے ان کو حاکم دین کے دودھ اور مکھن کا ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ وہ رات کی شراب قربان کر سکتے تھے مگر حاکم دین کا دودھ یا مکھن سے بنا پراٹھا لینا کبھی نہیں بھولتے تھے۔ حاکم دین کا شدھ اور گاڑھا دودھ پی کر آدمی ماں کے تھن سے پئے ہوئے دودھ کی لذت بھی بھول جاتا تھا۔ اتنا بڑھیا اور لذیز دودھ ہوا کرتا تھا اس کا۔ اس کی صبح اور شام فوجیوں کے ساتھ ہی گزرتی تھی۔ اس لئے وہ ان سے بڑا مانوس ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ اسے خوش کرنے کے لئے وہ اسے گرم کپڑے اور گرم کمبلیں اسٹاک سے نکال کر دے جاتے تھے۔ حاکم دین انہیں دعائیں دے کر چلا جاتا تھا۔

حاکم دین جب بھی امن سیتو پر دودھ دینے جایا کرتا تھا تو دودھ دے کر وہ لال پل پر جا کر بیٹھ جاتا تھا اور پھر گھنٹوں پل کے اس اور دیکھنے لگتا تھا جہاں اس کا بڑا بھائی جمال دین جا کے بس گیا تھا۔ بھائی کی یاد آتے ہی اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ کتنا چاہتا تھا وہ اپنے بڑے بھائی کو۔ افسوس کہ ذرا سی غلط فہمی میں برسوں کا پیار، ایسی کڑواہٹ سے بھر گیا کہ جمال دین، حاکم دین کا نام لینے کا بھی روادار نہ رہا۔ وہ اسے اپنا چھوٹا بھائی نہیں بلکہ اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرنے لگا۔

ہوا یوں کہ سن نوے کی شورش سے پہلے گوجر اپنے ڈنگر لے کر سرحد کے اس پار غلطی سے چلے جاتے تھے تو ادھر کے فوجی زیادہ باز پرس نہیں کیا کرتے تھے۔ بس تھوڑا سا ڈانٹا اور جانے دیا۔ جمال دین بھی اپنے ڈھور ڈنگر لیکر کبھی پاکستان والے کشمیر میں گھس جاتا تھا۔ رات کو اپنے ڈنگر لیکر واپس چلا آتا تھا۔ کبھی حاکم دین یہ غلطی کر بیٹھتا تھا تو کبھی وہ۔ رات کو دونوں بھائی زیتون کا ہاتھ بٹاتے تھے جو اکیلی ہیں بھینسوں کا دودھ دوہ لیتی تھی۔ زیتون جمال دین کی بیوی تھی۔ بڑی ہی خوبصورت اور وضع دار عورت تھی وہ۔ اس کے آنے سے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ پہلے باندی خانہ کی صفائی ہفتہ میں ایک بار ہو جایا کرتی تھی لیکن جب سے زیتون گھر میں آگئی تھی، باندی خانہ کی صفائی روز ہوا کرتی تھی۔ زیتون کے آنے سے ڈنگروں کا ہی بھلا نہیں ہوا تھا بلکہ گھر میں بھی برکت آنے لگی تھی۔ پہلے چالیس کلو دودھ نکلتا تھا۔ اب ستر کلو دودھ بازار میں پہنچ جایا کرتا تھا۔ یہ سب زیتون کے ہاتھوں کی کرامات تھی۔ کہنے والے کتنا سچ کہہ گئے ہیں کہ عورت کے ہاتھوں میں جادو ہوتا ہے۔ وہ پیتل کو ہاتھ لگا دے تو وہ بھی سونا ہو جاتا تھا۔ اسی بیچ اس پار کے کشمیر میں حالات بد سے بدتر ہونے لگے۔ جنگ تو

نہیں چھڑ گئی تھی لیکن حالات جنگ کے ماحول سے بھی بدتر تھے۔ سرحد پر چوکسی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ سرحد پار کرنا پل صراط پار کرنے سے کم نہ تھا۔ اب سرحد پر پرندہ بھی پر مارتا تھا تو فوجیوں کو خبر لگ جاتی تھی۔ ایک جمال دین اپنے ڈنگر لے کے غلطی سے اس پار چلا گیا، ڈنگر تو شام کو لوٹ آئے مگر وہ نہیں لوٹا۔ حاکم دین ادھر بھاگا اُدھر بھاگا۔ فوجیوں کے سامنے فریاد کی۔ پولس میں رپٹ درج کرائی مگر جمال کا کوئی پتہ نہ چلا۔ حاکم دین نے بھائی کی تلاش میں بستی کا چپہ چپہ چھان مارا مگر جمال کا کوئی سراغ نہ ملا۔ خدا جانے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ایک طرف وہ اس کی اچانک گمشدگی سے پریشان تھا تو دوسری طرف زیتون نے رو رو کے اپنا برا حال کر دیا تھا۔ وہ اپنا غم بھول کر زیتون کو سنبھالنے لگا۔

ایک سال بیت گیا جمال کے لوٹ آنے کی ساری امیدیں ایک ایک کر کے دم توڑنے لگیں۔ زیتون اس کی جدائی کے غم میں آدھی ہو گئی تھی۔ وہ بس آنے والے کا منہ دیکھتی تھی اور جانے والوں کی پیٹھ۔ اسی بیچ ایک دن مقدم دلنواز خان حاکم دین کا حال چال پوچھنے آیا۔ حاکم دین تو کسی حد تک بھائی کی جدائی کے غم کو بھول چکا تھا مگر زیتون سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی۔ زیتون کی حالت دیکھ کر چودھری کے دل کو بڑا گہرا دھکا لگا۔ چودھری جہاں دیدہ آدمی تھا۔ اس نے بڑی دنیا دیکھی تھی۔ زیتون کی بھرپور جوانی اسے ایک نظر میں بہت کچھ کہہ گئی۔ اس نے حاکم دین کو پاس بٹھایا اور پھر تحکمانہ انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''یا تنے کے ہویا ہے تنے کچھ دکھائی نہیں دیتو؟''

حاکم دین چودھری کی بات سن کر پہلے چونکا اور پھر اسنے ہمت کر کے پوچھا۔

''منے سے کے بے ادبی ہو گئیو چودھری؟''

''بے ادبی نہیں یہ پوچھ تنے سے کے گناہ ہو گئیو ہے۔ یہ توں کے حال کر چھڑیا ہے زیتون دا۔ کدی تو نے سوچو کہ اس کو کے بنے گو؟''

حاکم دین کا کلیجہ اچھل کر حلق میں جا کے اٹک گیا۔ چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ بدقت تمام بولا۔

''گل کے ہے۔ صاف صاف دس دونا۔؟''

''گل اے ہے کہ جمال نواتوں تے ٹرپیو تین سال ہو گئیو۔ منے تو لگ رہیو ہو کہ جمال زندہ نہیں مر گئیو ہے۔ چیہڑ و وے زندہ ہوتا تو اتنو دن کدی دور نہ رہتو۔ منے تو پکو یقین ہے کہ وے ہون کدی نہیں آنوں گو۔ جمال کو آس امید میں بیٹھین رہن کی اب کوئی لوڑ نہیں۔ توں جمال نو چھڑ کے

جمال دی بوٹی دا کچھ خیال کر۔ کے حال بد ہو گئیو ہے بیچاری دا۔ رب دے واسطیو یا تے سوچ یاہ اکیلو کے کرے گی۔ ہن ماری ایک صلاح مان۔ زیتون نو اپنو امان میں لے لیو۔ رب تنے اس نیک کم کو اجر ضرور دیو گو۔ زیتون کو بھلو بھی ہو جاوے گو اور تھارو ٹبر بھی بن جاؤ یگو۔''

بھائی کی موت کے خیال سے حاکم دین کے کلیجے پر چھریاں چلنے لگیں۔ آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگ گئی۔ اسے خود اس بات کا اعتراف تھا کہ اب جمال کی آس میں بیٹھے رہنا عبث تھا۔ وہ اگر زندہ ہوتا تو تین سال تک اس طرح روپوش نہ رہتا۔ کہیں کسی آفت مصیبت میں پھنس بھی گیا ہوتا تو بھی کسی کے ہاتھ خیر خبر بھیجنے میں کوتاہی نہ کرتا۔ سچ تو یہی تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں تھا، سو اس کی راہ دیکھنا بیکار تھا۔ بستی کے سب لوگوں کو یہی خیال تھا کہ اب جمال کے انتظار میں بیٹھے رہنا زیتون کے ساتھ سراسر ظلم اور ناانصافی تھی۔ آخر وہ کب تک انگاروں پر لوٹتی رہے گی؟ کب تک وہ اپنی جوانی کو اکیلے پن کی صلیب پر چڑھاتی جائے گی؟ کب تک وہ اپنے سلگتے ارمانوں کو تنہائیوں کا کفن پہناتی رہے گی؟ یہ وہ سوال تھے جو چودھری کے من میں بار بار اٹھتے تھے۔ ان سارے سوالوں کا ایک ہی جواب تھا کہ حاکم دین زیتون سے نکاح کر لے۔ زیتون کو سہارا مل جاتا اور حاکم دین کا گھر بھی بس جاتا۔

حاکم دین کو اس سجھاؤ میں کوئی کھوٹ خرابی نظر نہ آئی۔ گھر کی چیز گھر میں ہی رہ جائے تو گھر بھی صحیح سلامت رہے گا اور گھر والا بھی۔ پر وہ جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ کیوں کہ یہ ایک زندگی کا نہیں بلکہ اس فیصلے کے ساتھ دو زندگیاں جڑی ہوئی تھیں۔ اسلئے اس نے چودھری سے دو دن کی مہلت مانگی۔ چودھری تو خوشی خوشی چلا گیا مگر حاکم دین عجیب مخمصے میں پھنس کر رہ گیا۔ وہ زیتون سے بات کرنا چاہتا تھا پر ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اس نے ایک بار کوشش کی، دو بار کوشش کی پر کامیابی نہ ملی۔ آخر تیسری بار اس نے ہمت جٹا ہی لی۔ اس نے زیتون کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا اور پھر اسے بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''منے ایک گل دس۔ تنے کے لگدا، جمال زندو ہے؟''

جمال کا ذکر چھڑتے ہی زیتون کی آنکھوں کے سوتے اُبل پڑے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

''زندو ہوتو تو منے یوں بھل نہ جاتو۔ کدی خیر خبر لین واسطیو آ جاتو!''

حاکم دین نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

''چودھری یا ہی گل بات کرن واسطیو آ گئیو تھو۔ آخر توں لوکاں کا طعناں کد تک جھلے گو۔ کدی کوئے اونچ نیچ ہو گئیو تو رب سانو دوزخ ما جلائے گو سو چودھری کو حکم ہے کہ ما تھارے نال نکاح

کرلوں۔ تو دس تیرو کے مرضی؟''

زیتون نے پہلے چونک کر حاکم دین کی طرف دیکھا، پھر وہ شرما گئی۔ اس کا شرمانا اس بات کا مظہر تھا کہ اسے اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ حاکم دین نے چودھری کو فوراً جا کر خبر دی۔ چودھری بھی اس خبر سے باغ باغ ہوا۔ انہوں نے قاضی کو بلاوا بھیجا۔ قاضی نے دو بول پڑھ کر حاکم دین اور زیتون کو ازدواجی رشتے میں باندھ لیا۔

مرد کی قربت پا کر زیتون کی مرجھائی ہوئی زندگی میں پھر سے بہار آ گئی۔ اس کی کھوئی ہوئی خوشی پھر سے چہرے پر کھل اٹھی۔ حاکم دین کی زندگی کو بھی ایک نیا عنوان اور نیا مفہوم مل گیا۔ اب جب بھی وہ دودھ دینے باہر جاتا تھا تو زیادہ دیر تک باہر رک نہیں پاتا تھا۔ اسے باہر جاتے ہی زیتون کی یاد ستانے لگتی تھی۔ زیتون بھی اتنا بھرپور پیار پا کر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اسی بیچ زیتون نے ایک گول مٹول سے بیٹے کو جنم دیا۔ حاکم دین کو لگا جیسے اس کے دونوں جہاں روشن ہو گئے۔ وہ بیٹا پا کر خوشی سے پاگل ہو اٹھا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام جمال ہی رکھ دیا تاکہ وہ اس بچے کے بہانے اپنے بھائی کو یاد کرتا رہے۔

اچانک ایک دن ایسا زلزلہ آ گیا جس نے حاکم دین اور زیتون کی دنیا ہلا کر رکھ دی۔ جمال زندہ تھا اور وہ غیر قانونی طور پر بوڈر کراس کرنے کے جرم میں دو سال مظفر آباد کی ایک جیل میں بند رہا۔ رہا ہوا تو ایک سال تک وہ اس تگ و دو میں لگا رہا کہ وہ کسی نہ کسی طرح سرحد پار کر کے اپنے عیال تک پہنچ سکے۔ آخر ایک دن وہ بورڈر کراس کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

جب اس نے اپنی بستی میں قدم رکھا تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے بلکہ ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اپنے گھر والوں سے ملنے کی خوشی ایک انجانا سا نشہ اور سرور بن کر اس پر حاوی ہو رہی تھی۔ وہ دل میں ہزاروں خواب سجائے جب گھر میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اسے یہ روح فرسا خبر سننے کو ملی کہ زیتون نے حاکم دین سے نکاح کر ڈالا ہے۔ یہ خبر سن کے اسے لگا جیسے اس پر سات آسمان ایک ساتھ ٹوٹ پڑے ہوں۔ اسے لگا جیسے اسکے بھائی نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ اس صدمے نے اسے اس قدر گھائل کر دیا کہ حاکم دین کی کوئی بھی دلیل، زیتون کی کوئی بھی صفائی اسے جھوٹ اور مکاری لگی۔ وہ غصے سے اس قدر پاگل ہو گیا کہ اس نے کلہاڑی اٹھا کر زیتون پر وار کرنے کی کوشش کی مگر پڑوسیوں کی بروقت مداخلت سے زیتون کی جان بچ گئی۔ حاکم دین قسمت کے اس مذاق پر اپنا ماتھا پیٹ کر رہ گیا۔ جمال دین یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ تبھی واپس آئے گا جب زیتون پھر سے اس کی ہو جائے گی۔ اسے زیتون واپس چاہیے کسی بھی قیمت پر......!

جمال سرحد پار چلا گیا پر جاتے جاتے وہ حاکم دین اور زیتون کو ایسا درد دے گیا جس کی کسک انہیں رات دن تڑپاتی رہی۔ یہ ایسا درد تھا جس کی نہ دوا تھی نہ کوئی درماں تھا۔ آخر قدرت ان کے ساتھ یہ کیسا کھیل کھیل گئی تھی کہ وہ گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گار ٹھہرائے گئے تھے۔ جمال انہیں ایسا شراپ دے کے چلا گیا تھا کہ ان کی اچھی خاصی گھرہستی تحس نحس ہو کے رہ گئی تھی۔ حاکم دین سب کچھ سہہ سکتا تھا البتہ اپنے بھائی کی نفرت اور بدگمانی کو وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ایک دن اس نے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر زیتون کو اپنی زندگی سے الگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ لیتے وقت اسے جس قدر تکلیف ہوئی وہ ناقابل بیان تھی مگر ایسا فیصلہ لینا ضروری تھا۔ اگر ایک پھوڑا بہت زیادہ تکلیف دے تو اس پر نشتر چلانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ حاکم دین بھی اس پھوڑے کی پیڑا سے نجات پانا چاہتا تھا جس کا درد اب اسکی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ جمال کی بات اسے بار بار کچوکے مارتی رہتی تھی۔ زیتون کو ایک دن اس بات کی ذرا سی بھنک لگ گئی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اور وہ دوڑی دوڑی چھودھری کے پاس گئی اور اسے رو رو کر اپنا دکھڑا سنا ڈالا۔ چودھری نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اسے یقین دلایا کہ وہ حاکم دین کو ایسا قدم اٹھانے کی ہرگز اجازت نہیں دے گا چاہے اس کے لیے اسے سختی سے کام کیوں نہ لینا پڑے۔ چودھری کی اس یقین دہانی سے زیتون کے کچھ آنسو پچھ گئے اور وہ خوشی خوشی گھر لوٹ گئی۔

اس سے پہلے کہ چودھری حاکم دین کو کوئی بھی قدم اٹھانے سے باز رکھ پاتا اسنے زیتون کو ایک دن غصے میں آ کر طلاق دے ڈالی۔ زیتون کے وجود پر جیسے بجلی گری، جس نے پل بھر میں اس کا سب کچھ راکھ کر دیا۔ وہ ایک پل میں سب کچھ گنوا چکی تھی۔ بستی میں جب یہ خبر پھیل گئی تو سبھی لوگ حاکم دین کے اس فیصلے سے سکتے میں رہ گئے۔ حاکم دین کے اس قدم پر سبھی کو دکھ اور افسوس ہو رہا تھا۔ حاکم دین کی اپنی ایک دلیل تھی۔ وہ اپنے روٹھے ہوئے بھائی کے آگے زیتون کو چارہ بنا کر ڈالنا چاہتا تھا۔ اور اسے منا کر گھر لے آنا چاہتا تھا۔ اس کھیل میں دونوں بھائیوں کا کچھ نہیں بگڑا۔ اگر کسی کا کچھ بگڑا تو وہ زیتون تھی جس کی تو دنیا ہی لٹ چکی تھی۔ وہ تو ایک کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔ چند دن بڑا بھائی اس کھلونے سے کھیلتا رہا اور پھر چند دن دوسرا بھائی۔ اب یہ کھلونا پھر سے بڑے بھائی کے پاس جانے والا تھا۔ کہیں اگر اس کا دل اس کھلونے سے بھر گیا تو اس کا کیا ہوگا۔ کیا وہ اسی طرح ایک ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھ میں جاتی رہے گی؟ کیا اس کی اپنی کوئی ہستی نہیں ہے؟ کیا اس کا اپنا کوئی وجود نہیں؟

حاکم دین اپنے ارادے کا اٹل اور ضد کا پکا تھا۔ اس نے یہ طے کر لیا کہ وہ زیتون کو لے کر اس پار چلا جائے گا اور اسے جمال کو سونپ کر واپس چلا آئے گا۔ وہ زیتون کو اپنے بھائی کو سونپ کر

اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے جینے کے لیے اس کے بچے کا سہارا کافی تھا۔ وہ باقی کی زندگی اسی کے سہارے کاٹنے کے لیے تیار تھا۔ زیتون حالانکہ ابھی تک اسی کے گھر میں رہ رہی تھی مگر وہ اس کے تئیں ایسی لاپرواہی اور بے رخی دکھا رہا تھا جیسے وہ اسے جانتا تک نہ ہو۔ دونوں ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر بھی ایک دوسرے سے کتنے دور چلے گئے تھے۔ جیسے دو اجنبی ایک جگہ آ کے رکے ہوں۔ جمال کے نازل ہونے سے ان کی زندگی کا ڈھرہ ہی بدل چکا تھا۔ ایک طوفان، ایک تلاطم ان کی خاموش زندگی میں اٹھا تھا جس نے سب کچھ بدل کے رکھ دیا تھا اور وہ اس طوفان میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے تھے۔

اسی دوران سیاسی فضا میں ایک طوفانی بدلاؤ آنے لگا۔ اوڑی کا لال پل جو برسوں سے ویران اور اداس دکھائی دے رہا تھا اس پر نیا رنگ و روغن چڑھنے لگا۔ کاروانِ امن کے نام سے ایک بس شروع ہو گئی جو بچھڑے دلوں کو جوڑنے کا کام کرنے لگی۔ حاکم دین بھی زیتون کو لے کر اس پار جانے کے کاغذات حاصل کرنے میں جٹ گیا۔ زیتون رو رو کر ایک ایک کو اپنا دکھڑا سناتی جا رہی تھی کہ آخر اسے یہ کس جرم کی پاداش میں اپنے لختِ جگر سے الگ کیا جا رہا ہے؟ کسی کے پاس اس کے درد کا مداوا نہ تھا۔ تھک ہار کے وہ ایک دن چودھری کے گھر پر چلی گئی اور اس کے آگے اپنے بچے کو رکھ کے بولی۔

''تم اتے جیسو ہو اور اتوں ماری دنیا ویرانو ہو گئیو۔ توں دس کے گناہ ہے میرو؟۔ یا توں تھو جس وی صلاح من کے یاہ نکاح ہو گئیو۔ حاکم جمال سے ڈر کے مینو چھڑ گئیو۔ اب تو دس میرو گھر کت ہے؟ میرو گھر آلا کون ہے؟ میں توں اتوں مر جاؤں گی پر جاتاں جاتاں ایں سوال کا جواب مینوں دس۔ اس پوت کو کے بنے گو؟ کے ما اس کو دو ٹکڑو کر کے جاوں یا اسے مار چھڑ دو؟''

چودھری منہ میں گھگھیاں بھر کر بیٹھ گیا۔ پہلی بار اسے لگا کہ اس کے پاس زیتون کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔ پہلی بار اس نے اپنے آپ کو بڑا بے بس اور لاچار پایا۔ کبھی کبھی حالات اس طرح کے ہو جاتے ہیں کہ منصف خود سوالی بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت چودھری دلنواز خان کا تھا۔ وہ زیتون کے سامنے ایسے بیٹھا تھا جیسے وہ منصف نہیں بلکہ خود مجرم ہو اور انصاف کے کٹہرے میں کھڑا فیصلہ سننے کا انتظار کر رہا ہو۔

وہ گھڑی قریب آ رہی تھی جب زیتون کو حاکم دین کے ساتھ اس پار جانا تھا اور اپنے روٹھے ہوئے شوہر کو منا کر لے آنا تھا۔ وہ اپنے لختِ جگر کو اپنے سے الگ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ الگ کہاں تھا

باقی صفحہ ۸۸ پر.....

انور شیخ

خطیب

جونہی انگلستان میں دہشت گروں کی سرگرمیاں بڑھنے لگیں حکومت برطانیہ کو اس بات کا احساس ہوا کہ اس دیس میں دہشت پھیلانے کی ذمہ داری امام مسجدوں پر عائد ہوتی ہے۔ جو دینی خطبات اور پنجابی، ہندی، گجراتی وغیرہ میں دیتے ہیں۔ لوگ ان کی باتوں میں آکر مچل جاتے ہیں اور اس طرح غیر قانونی حرکات کا موجب بن جاتے ہیں۔ ابھی اگلے ہی دن بریڈفورڈ کے ایک سنی مولوی نے اردو زبان میں ایسا خطبہ دیا کہ شیعہ حضرات مشتعل ہو گئے اور معاملہ فساد کی صورت اختیار کر گیا۔ ممکنہ بدامنی کو روکنے کے لیے ہوم آفس نے ہدایات دیں کہ امام مسجد دینی خطبے صرف انگریزی زبان میں دیا کریں۔ اور دوسری زبان میں ایسا کرنے سے اجتناب کریں۔

یہ ایک تجویز تھی۔ قانون نہیں تھا لیکن مولوی لوگوں کو یہ بات پسند نہ آئی اور انہوں نے اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہا ''یہ بات دین کے خلاف ہے۔ جس کی اجازت تو انگریزی آئین بھی نہیں دیتا ہے۔ بھلا اسلام جیسا مقدس خدائی ضابطہ حیات ایسی بکواس کا کیسے متحمل ہو سکتا ہے؟

وہی مولوی جو عورتوں کی قدر جوتے کے برابر سمجھتے تھے انہوں نے اپنے احتجاج میں گرمی پیدا کرنے کے لیے ناموس زن کو استعمال کیا اور اس طرح عورتوں کو بھڑکانا شروع کیا۔ خواتین نے اس تجویز کے خلاف جلوسوں اور ریڈیائی نشریات کے ذریعہ ''اسلام خطرے میں ہے'' کا پروپگنڈہ کر کے مولویوں کی آزادئ خطبہ کو بچانے کی کوشش کی لیکن سبھی عورتیں ایک جیسی نہیں تھیں۔ ساجدہ بانو کا انداز کچھ اور ہی تھا۔ وہ اپنے خاوند مولانا عبدالحفیظ کی کھلی مخالفت پر اتر آئیں جو انگریزی زبان سے نابلد ہونے کی بنا پر ہی نہیں بلکہ کئی اور وجوہات کے باعث بھی خطبہ اردو، عربی وغیرہ میں دینے کے سلسلے میں پیش پیش تھا۔

اس کی اور کیا وجوہات ہو سکتی تھیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ عبدالحفیظ آزادئ نسواں کا قائل نہیں تھا۔ وہ اردو میں یہ تبلیغ کرتا تھا کہ ''جو بیویاں اپنے خاوندوں کا حکم نہ مانیں ان کو مارو، خوب مارو۔ حتیٰ کہ وہ تمہارے حکم کی تعمیل کرنے لگیں۔'' نیز وہ پردے کا سخت حامی تھا اور چاہتا تھا کہ جیسے عورتیں عرب شریف میں حجاب پہنتی ہیں اسی طرح انگلستان میں بھی مسلمان عورتیں حجاب یا جلباب

پہن کر اپنی قوت ایمانیہ کا ثبوت دیں۔

اس پرچار سے مولوی عبدالحفیظ اور ساجدہ بانو کی آپس میں ٹھن گئی اور وہ سرِ عام اپنے خاوند کی مخالفت پر اتر آئی۔ اس کی وجہ دینی کم اور ذاتی زیادہ تھی اور وہ یہ کہ مولوی عبدالحفیظ اپنی بیوی ساجدہ بانو سے عمر میں کم از کم بیس برس بڑا تھا۔ ساجدہ بانو کا باپ حاجی شفیق اللہ سخت پرہیزگار انسان تھا جب ساجدہ بی۔اے۔ میں پڑھتی تھی تو اسے اس بات کا احساس ہوا کہ اگر ساجدہ کو دینی علم نہ سکھایا گیا تو وہ دنیوی تعلیم حاصل کرکے گمراہ ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے مولوی عبدالحفیظ کی خدمات تدریس حاصل کی جو دیوبند پاس اور ایک وجیہہ انسان تھا۔ وہ ابھی بوڑھا نہیں تھا اور اس کی علمیت اور شرافت نفس کی داستانیں کچھ ایسی تھیں جنہیں سن کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ جس شہر میں عبدالحفیظ رہتا ہو وہاں شیطان کا رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ سب ظاہریت تھی اور اس پراپگنڈہ کا نتیجہ تھا جو عبدالحفیظ نے اپنی طہارت کا سکہ جمانے کے لیے کر رکھا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ شیطان عبدالحفیظ کا اس قدر گرویدہ تھا کہ اسے خوش کرنے کیلئے اپنی ماں کا کفن تک بیچ ڈالے۔

ساجدہ بانو کو سادگی اپنے باپ سے ورثہ میں ملی تھی۔ نہ وہ صرف ذہین اور بھولی بھالی تھی بلکہ حسن و جمال کی برکات سے بھی مالا مال تھی۔ جب عبدالحفیظ نے ساجدہ کو قرآن کا ترجمہ اور تفسیر پڑھانا شروع کیا تو ساجدہ کو یہ ذہن نشین کرانا نہ بھولا کہ وہ عورتیں جو علمائے کرام اور اپنے خاوندوں یا ہونے والے خاوند کی عزت کریں گی انہیں اگلے جہان میں حوریں بنا دیا جائے گا اور ان کا جنتی مردوں کے ساتھ نکاح اس لیے کیا جائے گا کہ وہ اطاعت گذاری میں بے مثال ہوں گی۔

ساجدہ پر عبدالحفیظ کے پند و نصائح کا بڑا اثر ہوا اور وہ اس کے دام محبت میں گرفتار ہو گئی۔ یہ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ کر انگلستان چلی آئی۔ یہ فرار اس لیے آسان ہو گیا کہ ان کے محلے کا ایک معمولی فرد شریف نظامی انگلستان کے شہر بریڈفورڈ میں ایک متمول انسان بن چکا تھا۔ وہ اپنے شہر کی کونسل کا ممبر بننا چاہتا تھا۔ یہ کام اظہار مسلمانی سے آسانی کے ساتھ ہو سکتا تھا کیوں کہ بریڈ فورڈ کے نئے آبادکار اکثر سیدھے سادھے ان پڑھ مسلمان تھے۔ نئی مسجد بنوا کر اسے ایک آتش بیان خطیب سے مزین کرنا دینی پاکیزگی اور مسلمانی کی انتہا تھی۔ ایسے شخص کو ووٹ دینا توجہ کرنے کا دوسرا نام تھا۔ شریف نظامی نے اس بنا پر عبدالحفیظ اور ساجدہ کا داخلہ انگلستان میں ممکن بنا دیا تھا کہ اس نے برطانوی حکومت کو یقین دلایا تھا کہ یہاں مسلم عوام کو دینی رہنمائی کی سخت ضرورت ہے۔ اس نے یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ اسے ایک ایسے امام مسجد کی ضرورت ہے جو اپنے خطبات سے عوام کو اتنا متاثر کر سکے کہ وہ اسے ووٹ دینے کے لیے اس کے مخالفین کو کافر سمجھنے لگیں۔ عبدالحفیظ اور ساجدہ کا سفر خرچ اور

ضمانت وغیرہ شریف نظامی ہی نے دی تھی۔ کمال تو یہ ہے کہ بریڈفورڈ میں کئی سال رہنے کے باوجود عبدالحفیظ اور ساجدہ کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ غیر منکوحہ امام مسجد بغیر ڈکار لیے فرائض امامت ادا کر رہا تھا۔ اور اللہ میاں نے بھی اس کی رسی دراز کر رکھی تھی۔ جسے خدا چھٹی دے اس کی باز پرس کوئی انسان کیسے کر سکتا ہے؟

ساجدہ نوجوان تھی لیکن عبدالحفیظ پر میانہ عمری کے بادل منڈلا رہے تھے۔ عبدالحفیظ نے اس کی گیدڑ بھبکیوں اور دھونسوں سے ڈھانکنے کی کوشش کی تو ساجدہ جو کہ ایک پڑھی لکھی اور صاحب ضمیر عورت تھی مرعوب نہ ہو سکی۔ اسے یقین نہیں ہوتا تھا کہ شریف نظامی نے اپنا سیاسی ڈھونگ رچانے کے لیے مسجد بنوا رکھی ہے اور غیر شادی حرام کار مولوی عبدالحفیظ امامت کے بھیس میں خدا کو دھوکا دے رہا ہے۔۔۔۔ پر یہ سوچ کر کہ وہ بھی اس گناہ میں برابر کی شریک ہے۔ بغاوت پر اتر آئی اور اس نے عبدالحفیظ کو نوٹس دیا کہ ایک مہینہ کے اندر اس سے شادی کرے ورنہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ رہنا شروع کر دے گی۔

یہ سن کر عبدالحفیظ کا نشہ امامت ہرن ہونے لگا اور اس نے ایک مہینہ کے بجائے چودہ ہی دن میں ساجدہ کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی جس نے ساجدہ کے حوصلے بڑھا دیئے اور اس نے عبدالحفیظ کے رعب سے آزاد ہونے کی ٹھان لی۔

بی اے۔ پاس ہونے کے باوجود برقعہ پہننا کوئی آسان کام نہیں اور وہ بھی انگلستان جیسے ترقی یافتہ دیس میں۔ چنانچہ جب ساجدہ نے پردے سے انکار کیا تو اس نے ساجدہ کا دینی علاج کرنے کی کوشش کی۔ اسے سخت بیدردی سے مارا اور اپنے خطبے میں ڈینگیں مارتے ہوئے کہا ''دوستو! قرآن میں ہر مشکل کا حل موجود ہے۔ میری نادان بیوی نے کل گستاخی سے کام لیا تو میں نے قرآن کے مطابق سالی کی وہ جم کر دھلائی کی کہ ابھی تک درد سے کراہ رہی ہے۔ واہ سبحان اللہ۔ قرآن بھی کیا حکمتوں کا خزانہ ہے۔''

نمازیوں نے ''واہ واہ۔۔۔۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ'' کہہ کر اس کی ستائش کی لیکن دوسرے دن جب وہ امامت کے لیے آیا تو اس کی داڑھی غائب تھی۔ نمازیوں نے اس کی تاب نہ لاتے ہوئے ''لعنت اللہ۔ لعنت اللہ'' کے آوازے کسنے شروع کر دیئے۔ یہ کیسا امام مسجد تھا جو داڑھی منڈوا کر فرائض امامت ادا کرے۔ یہ عمل تو سنت نبوی کی کھلی توہین تھی۔۔۔۔ آخر اس تبدیلی کا سبب کیا تھا؟

اس کا سبب ساجدہ کی بغاوت تھی۔ جونہی وہ رات کو خراٹے بھرنے لگا اس نے بڑی چابکدستی سے اس کے چہرے کی دائیں جانب کی داڑھی کا قینچی سے صفایا کر دیا۔ جب وہ غضبناک

ہو کر اٹھا اور اسے مارنے کیلئے غل مچانے لگا تو وہ بڑی پھرتی سے بھاگ کر تھانے چلی گئی۔ پولس سارجنگ نے اسے رات بھر حراست میں رکھا اور اگلے دن بڑی مشکل سے اس کی رہائی ہوئی۔

شریف نظامی عبدالحفیظ کے پراپگنڈے کی بدولت کونسل کا ممبر بن گیا لیکن اب پھر مقامی انتخابات کا زمانہ آچکا تھا۔ اور اس کے لیے اسے اپنی نمک حلالی کا ثبوت دینا ضروری ہو گیا تھا جو وہ شریف نظامی کی مدحت سرائی ہی سے کر سکتا تھا۔ اس کیلئے لازم تھا کہ وہ شریف نظامی کے مخالف امیدوار امام الدین قریشی کی مخالفت کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے خطبوں میں امام الدین قریشی کے خلاف ہرزہ سرائی شروع کر دی۔ اس طرح اس کی ذاتی زندگی پر کیچڑ اچھالنا اس کا معمول بن گیا جس سے یہ بتانا مشکل ہو گیا کہ جمعہ کا خطبہ خدا کی حمد کے لیے ہوتا ہے یا شریف نظامی کے مخالفین کی تضحیک کی لئے...... ایک دن جمعہ کے روز نمازیوں سے کہنے لگا:

"اے ایمان والو!

کیا تم ماموں قصائی کو جانتے ہو؟ شاید نہیں۔ وہ اس لیے کہ وہ اس دیس میں ماموں قصائی کے نام سے نہیں امام الدین قریشی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ترقی ہو تو ایسی ہی ہو جس سے نام اور ذات دونوں چمکیں۔ دولت میں بھی کیا نشہ ہے۔ ماموں سے امام الدین بننا تو قابلِ قبول ہے کیوں کہ جاہل اور الو کے پٹھے لوگ امام الدین کو بگاڑ کر ماموں کہتے ہیں۔ اگر اس نے اپنی دولت کی ڈھینگ مارنے کیلئے اپنا نام سیدھا کر لیا تو یہ کوئی بری بات نہیں لیکن اس کا قصائی سے قریشی بننا تو حضور نبی کریم کی توہین ہے کیونکہ وہ قریشی تھے۔ نبی کو قصائیوں کے گروہ میں کوئی کافر ہی شمار کر سکتا ہے۔ یہ کسی مومن کا شیوا نہیں ہو سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ ماموں قصائی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اب وہ کونسل کا ممبر بننا چاہتا ہے۔ ایسے کافر کو ووٹ دینا نہ صرف کفر ہے بلکہ اسلام کی توہین بھی ہے۔ مومنو! اگر اس سلسلہ میں میری رائے پوچھو تو وہ یہ ہے کہ جب وہ کل تمہاری سیاسی میٹنگ میں ووٹ مانگنے کے لیے آئے تو اس کو کھل کر جوتے مارو اور کہو جو شخص رسول پاک کی توہین کر سکتا ہے وہ ہماری کیا آبرو کرے گا؟

اتنا ہی نہیں یہ مسجد جس میں تم نماز پڑھتے ہو یہ کس کی دین ہے؟ یہ شریف نظامی کے جذبۂ ایمانی ہی کا اعجاز ہے اور اس کی داستان سننے کے قابل ہے۔ جب شریف نظامی صاحب حج کیلئے مکہ شریف گئے تو وہاں انہیں ایک رات نبی کریم خواب میں ملے اور اس سے فرمایا "نظامی! ہم چاہتے ہیں کہ تم میں ایک ولی اللہ کی معجزانہ قوت پیدا ہو۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تمہارے شہر میں عیسائیوں کا جو گرجا بند پڑا ہے اسے خرید کر مسجد میں تبدیل کر دو۔ وہاں جب مومن نماز پڑھنے آئیں گے تو

تمہیں ان کی عبادت گزاری کے ثواب کا دس فیصدی حصہ ملے گا۔ نظامی صاحب نے بالکل ایسا ہی کیا۔ اب نتیجہ یہ ہے کہ اس ثواب کے باعث یہ آدمی در پردہ ولی اللہ بن چکا ہے۔ اس کی سادگی اور عجز کا یہ حال ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ کسی کو کانوں کان اس کی ولیت کی خبر ہو۔ ولی اللہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی شخص اپنی ولیت کو نمائش کے طور پر استعمال نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ شریف نظامی صاحب اپنی اصلیت پر پردہ ڈالنے کیلئے ابھی تک کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ بغیر سر ڈھانپے نماز پڑھتے ہیں۔ کبھی کبھی سوغات جنت سمجھ کر شراب کی چند بوتلیں بڑے انکسار کے ساتھ اپنے شکم میں انڈیل لیتے ہیں اور جب ان کی بیوہ بیمار ہو تو وعظ کرنے کے لیے بازار حسن چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی طوائفیں پرہیز گار بنتی جارہی ہیں۔ اور لاہور، پشاور اور کراچی کے تمام درویش صفت لوگ جب یہاں آتے ہیں تو ان سے شادی کرنے کی گڑگڑا کر التجا کرتے ہیں لیکن وہ انہیں نظر انداز کر دیتی ہیں۔ کیوں کہ ان کے مداحوں میں کئی عرب شہزادے اور شیخ بھی شامل ہیں۔ جو ان خدا رسیدہ طوائفوں کے کہیں زیادہ قدردان ہیں۔

اب تم ہی کہو ان حالات میں شہر کی کونسل کا ممبر بننے کا زیادہ حقدار کون ہے۔ شریف نظامی یا ماموں قصائی؟ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ماموں قصائی کافر ہے۔ اگر تم نے اسے ووٹ دیا تو تمہاری بیویوں کے نکاح ٹوٹ جائیں گے۔ تم حرام کار بن جاؤ گے اور دوزخ کے سانپ اور بچھو تمہارا انتظار کرنے لگیں گے...... میں کہتا ہوں کہ اپنی آخرت کا خیال کرتے ہوئے رد کر دو اس ماموں قصائی کو اور اپنا ووٹ شریف نظامی کو دو۔

ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ ماموں قصائی انگریزوں کا پٹھو ہے جو کہ ایک کافر قوم ہیں۔ اسلام کفر پروری کی نہیں بلکہ کفر کی بیخ کنی کی تبلیغ کرتا ہے۔ اس لئے کوئی مومن بھی کسی کافر کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی برطانیہ دارالحرب ہے۔ ایسے ملک کی بربادی کے بیج بونا تو ہر مومن کا فرض ہے۔ لہٰذا جو لوگ کافروں کے طرفدار ہوں وہ اس عیسائی ملک کو عملاً دارالسلام مانتے ہیں یہ کفر عظیم ہے کیوں کہ اس سے اسلام کے اصول جہاد کا انکار لازم آتا ہے۔

مومنو! یہ دیکھ کر مجھے رونا آتا ہے کہ آجکل انگلستان میں مرزائیوں کا اقتدار بڑھتا جارہا ہے۔ یہ لوگ دشمن رسالت ہیں جو غلام احمد مرزا جیسے انسان کو نبی مان کر اصول اسلام میں رخنہ اندازی کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو پاکستان سے اسی بدعت کی وجہ سے نکالا گیا تھا۔ اب انہوں نے انگلستان میں اپنا ہیڈ کوارٹر تعمیر کر لیا ہے جسے ایسکس (Essex) میں ایک عظیم الشان مسجد کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ مسجد نہ صرف بیک وقت پچاس ہزار عبادت گذاروں کیلئے کافی ہے بلکہ اس میں مرزائی

ہیڈ کوارٹرز کی عمارتیں بھی ہیں جہاں سے یہ بے دینی سرگرمیوں سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں انہیں انگلستان میں ایک ٹیلی ویژن چینل کے اجرا کی اجازت بھی ملی ہوئی ہے جہاں یہ دن رات ہرزہ سرائی کرتے ہیں اور اس طرح اسلام کے نام پر ہی اسلام کی جڑیں کاٹتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ برطانیہ ایک اسلام دشمن ہے۔ اس سے وفا کرنا اسلام کے ساتھ غداری کے برابر ہے۔ مومنو! تمہیں میری باتوں پر سوچنا ہوگا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو ناموس قصائی کو ووٹ نہیں دے سکو گے۔"

مولوی عبدالحفیظ کا ذریعہ خطابت اردو زبان اور عربی کا آمیزہ تھا جسے پاکستانی اور ہندی مسلمان تو سمجھ لیتے تھے لیکن چند ایک نومسلم انگریز اسے سمجھنے کے اہل نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ امام صاحب انگریزی میں خطبہ دیا کریں تاکہ ان کے دل بھی ضیائے اسلام سے منور ہوں لیکن ایسا کرنے سے مولوی صاحب کا پول کھلتا تھا۔ ان کی خطابت دینی نہیں بلکہ سیاسی نوعیت کی تھی جس کی بنا چچہ گری پر تھی۔

آخر نومسلم گوروں کو یہ خبر ہوگئی کہ مولوی عبدالحفیظ کوکین کے دھندے میں بھی ملوث ہیں۔ پشاور کے چند منچلے یہ کاروبار کرتے تھے۔ اگرچہ پولیس کو ان پر شک تھا۔ وہ مسجد میں گھس کر امام مسجد کے گھر کی تلاشی لینے کے لیے تیار نہیں تھے ورنہ یہ دھندا جو قوم کے نوجوانوں کی صحت کیلئے سخت مضر تھا کبھی کا پکڑا گیا ہوتا۔ کہتے ہیں کہ خدا گنہگاروں کو بڑی ڈھیل دیتا ہے لیکن وہ آخرکار ان سے باز پرس ضرور کرتا ہے۔

عبدالحفیظ ایک چالاک انسان تھا۔ کوکین کے دھندے سے اس کے پاس دولت کی فراوانی ہونے لگی۔ اسے اپنے مال و زر کو محفوظ کرنے کی فکر تو لاحق تھی لیکن اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ جن نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو اس نشے کی لت پڑ چکی تھی ان پر کیا بیت رہی تھی۔ وہ خود تو جسمانی طور پر ناکارہ ہو ہی رہے تھے۔ ان کے والدین کی نفسیاتی خستگی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ لوگ بھاڑ میں جائیں عبدالحفیظ کو صرف دولت کمانے اور بچانے میں دلچسپی تھی۔ اس کیلئے اسے ایک عجیب تجویز سوجھی اور وہ یہ کہ وہ اپنی آمدنی برطانوی بنکوں میں جمع نہیں کراتے تھے بلکہ جو آمدنی ہوتی اسے پاکستان بھجوا دیتے تھے جو وہاں کے بنکوں میں جمع کرائی جاتی تھی تاکہ برطانوی پولیس کو اس کی خبر ہی نہ ہو سکے۔ وہ آہستہ آہستہ اس رقم سے پاکستان ہی میں جائیداد خریدتا تھا جو زمینوں، مکانوں اور دوکانوں پر مشتمل تھی۔

البتہ مولوی عبدالحفیظ حوروں کا بڑا دلدادہ تھا جو صرف نیکوکاروں کو ملیں گی۔ عرف عام میں جسے "عورت بازی" کہتے ہیں۔ وہ اسے "تلاش حور" کے مقدس نام سے یاد کرتا تھا اور اس کام کو نیکی اور صراط مستقیم سمجھتا تھا..... جو حوروں کو برا کہے وہ خود نیک کیسے ہوسکتا ہے۔ جس چیز کو قرآن نے رحمت

خداوندی قرار دیا ہوا سے سوقیت سے منسوب کرنا کفر نہیں تو اور کیا ہے۔

عبدالحفیظ نے چرب زبانی سے لوگوں کے منہ تو بند کر دیئے لیکن ان کے دل مطمئن نہیں تھے۔ حوروں کی جستجو کے سلسلہ میں اس سے ایک لغزش ہوگئی تھی اور وہ یہ کہ وہ جب چھٹیوں پر پاکستان گیا تو اس کی ملاقات ایک حسینہ گلاب جان سے ہوگئی۔ وہ اگرچہ مطلقہ تھی لیکن بڑی چنچل ادا تھی اور اس کی زبان ایسی تھی جیسے شہد کی بنی ہوئی ہو۔ وہ حسن و جمال اور جوانی میں مثال حور تو تھی لیکن بیک وقت چالاک اور بیوقوف تھی۔ چالاک اس لیئے کہ بڑی ذہین تھی۔ بیوقوف اس وجہ سے کہ بڑی سادہ لوح تھی اور آسانی سے دوسروں کے جھانسے میں آجاتی تھی۔ عبدالحفیظ کا اس کے ساتھ نکاح کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اسے اپنے کاروبار میں پھنسانے کے لیے اور تنہائی کی راتیں عیش سے گذارنے کیلئے اس سے شادی کا وعدہ کر بیٹھا اور ساتھ ہی یہ بھی ڈھینگ ماردی کہ وہ ابھی تک اس لئے غیر شادی شدہ ہے کہ آج تک کوئی عورت اس کی آنکھوں میں جچی ہی نہیں۔ اسلئے وہ ابھی تک سو فیصدی کنوارا ہے۔ اسے نہ صرف گلاب جان سے پیار ہے بلکہ وہ بچوں کا بھی بڑا شوقین ہے۔ اس بیان میں اتنی سچائی ضرور تھی کہ اس کے ساجدہ سے کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ بچوں کا بڑا آرزومند تھا۔ اس پر ایزاد یہ کہ اس نے گلاب جان کو بتایا کہ وہ برطانیہ میں کوئی معمولی امام مسجد نہیں بلکہ شمالی انگلستان کی ایک بڑی انجمن مساجد کا صدر ہے جس میں ایک سو عبادت گاہیں شامل ہیں۔

عبدالحفیظ گلاب جان کے پیار میں اس قدر الجھ گیا کہ اسے ''گلاب جامن'' کہنے لگا۔ اس نے پشاور کے اتنے چکر کاٹنے شروع کر دیئے کہ ساجدہ کو اس کے چلن پر شک ہونے لگا۔ جب برے دن آجائیں تو اپنی قسمت بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ جب عبدالحفیظ کو پشاور کا چکر لگانے میں دیر ہوگئی تو گلاب جان نے اسے ایک خوشبودار خط بھیجا۔ عبدالحفیظ کے جتنے بھی خطوط پشاور سے آتے تھے وہ ایک دوست سراج الدین نامی کے توسط سے موصول ہوتے تھے جنہیں عبدالحفیظ خود لینے جایا کرتا تھا۔ یہ خط اس وقت آیا جبکہ وہ سفر پشاور جا چکا تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ شائد خط میں کوئی ضروری بات ہو جس کا علم عبدالحفیظ کو جلد ہونا چاہیے وہ یہ خط خود ہی لے کر ساجدہ کے پاس چلا آیا۔

خط کی خوشبو سے ساجدہ کو شبہ پڑ گیا کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔ کسی زمانے میں وہ بھی عبدالحفیظ کو خوشبودار خطوط لکھا کرتی تھی۔ اب یہ کون ناگن ہے جو اس سے اس کا خاوند چھین لینا چاہتی ہے۔ جب اس نے لفافہ کھولا تو اسے پڑھ کر اس کا دماغ چکرانے لگا۔ اگرچہ یہ مکتوب ایک محبت نامہ تھا لیکن گلاب جان کا انداز تحریر مذاحیہ تھا۔ اس میں لکھا تھا:

''او گھنی داڑھی والے بانکے چھیلے! تیری داڑھی پر قربان جس پر ریشم کی لطافت

بھی فدا ہونا اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔ اگر تمام جنتی مردوں کی داڑھیاں اسی طرح نرم، بجلی اور چمکیلی ہوتیں تو عورتوں کے بھاگ جاگ اٹھیں گے۔ ایسی داڑھیوں کو چومنا اور سینے سے لگانا تو اونچی قسمت کا نشان ہے۔ میرا دل تمہاری داڑھی کے لمس کی خاطر اس طرح تیزی سے دھک دھک کر رہا ہے جیسے سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے اور تمہاری تلاش میں دیوانہ وار نکل پڑے۔''

''آخر مجھ سے کیا خطا ہوئی جو مجھے یوں تڑپا رہے ہو۔ میں نے پچھلے سوموار کو تمہاری آمد کا شدت سے انتظار کیا۔ راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ کئی بار ایئرپورٹ کے چکر کاٹے۔ پیر دستگیر کے نام پر سینکڑوں روپے خیرات کئے لیکن ابھی تک تمہاری صورت نظر نہیں آئی۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟''

میں جانتی ہوں کہ عورتیں تم جیسے بانکے چھیلوں کی پرچھائیں سے بھی شادی کرنے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ تم چڑیل کے دام محبت میں تو نہیں پھنس گئے۔ اگر بات ایسی ہی نکلی تو میں یا تو اسے ختم کر دوں گی یا اپنی جان دے دوں گی...... خدا جانے میں اتنی بدظن کیوں ہو گئی ہوں۔ شائد محبت اسی کو کہتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم خاندانی کنوارے ہو اور بیک وقت دو کشتیوں میں سواری نہیں کر سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اب زیادہ دیر کیلئے کنوارا رہنا نہیں چاہو گے۔ تمہارے سینے میں محبت کی آگ ویسے ہی بھڑک رہی ہوگی جیسے میرے سینے میں۔ جس طرح منفی کو منفی کے ساتھ ضرب دینے سے نتیجہ مثبت نکلتا ہے اگر تم میرے آتشیں سینے سے اپنا آتشی سینا ملاؤ تو نتیجہ یقیناً ٹھنڈک کی صورت میں نمودار ہوگا۔

ہاں تو افغانستان والا تاجر مجھے دو کلو ''سفید سونا'' دے گیا ہے۔ جس کی قیمت لاکھوں پونڈ ہے۔ میں اسے کسی کے حوالے نہیں کر سکتی۔ اگر خود آجاؤ تو میں برقعہ پہن کر اسے اپنی حفاظت میں لا سکتی ہوں خواہ اس میں جان ہی کا خطرہ کیوں نہ ہو۔ تمہارے لئے میں کیا نہیں کر سکتی؟ آخر میں زندہ کس کیلئے ہوں۔ صرف تمہارے لئے۔ کاش کہ میں تمہیں اپنا دل چیر کے دکھا سکوں۔ اپنی داستاں بیان کرنے کے لئے چند اشعار عرض حال کے طور پر پیش خدمت ہیں۔

عرض حال

تمہاری یاد آتی ہے تو دل میرا مچلتا ہے
دھڑکتا ہے، سسکتا ہے، لپکتا ہے، اچھلتا ہے

تمہاری یاد کیا؟ یہ ایک جھونکا ہے مسرت کا
اندھیری رات میں جیسے کہ اک جگنو ہو عشرت کا

بتا تیرے تصور میں ستمگر! میں بھی آتی ہوں؟
ترے سنگین دل کی دھڑکنوں میں چہچہاتی ہوں؟

محبت میں تڑپنا تو سعادت ہے، رفاقت ہے
دیارِ عشق میں سب سے بڑی طرزِ ریاضت ہے

نہ دل ہی جس کے سینے میں ہو کیا میں اس کو بتلاؤں؟
نہ جانے پیار کے معنی اسے کیسے میں سمجھاؤں؟

محبت ناگ ہے کیوں راگ میں اس کو سمجھ بیٹھی؟
جو بدبختی ہے کیسے بھاگ میں اس کو سمجھ بیٹھی؟

مرے اجڑے ہوئے دل کی جو رونق یاد ہے تیری
کہوں کچھ ہائے لیکن تو کبھی سنتا نہیں میری

•کتابِ عشق پڑھ بیٹھی، کہو اس میں برا کیا ہے
نہیں اب دل جو قابو میں، بتا میری خطا کیا ہے؟

نہ کرتا خیر اب آجا کہ میں ہوں تیری دیوانی
بنا تیرے یوں لگتا ہے، نہیں زندہ، ہوں زندانی

تمہاری
''گلاب جامن''

یہ پڑھ کر کہ عبدالحفیظ گلاب جان کے ساتھ عشق فرما رہا ہے اور کوکین کا بیوپاری ہے جس

سے ہزاروں جوانوں کی زندگی برباد ہو رہی ہے۔ ساجدہ غصہ سے پاگل ہو گئی۔ اس کی پولس کو اطلاع کر دی۔ اور بتایا کہ یہ شخص اردو میں خطبے دیتا ہے۔ اس کا رحمانیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ان کی نوعیت سیاسی ہے اور وہ برطانوی وقار کے بھی خلاف ہیں۔

جب عبدالحفیظ واپس لوٹا تو اس بار لندن ایرپورٹ پر ساجدہ نہیں بلکہ پولس اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی کوکین پکڑی گئی۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اسے سات سال کی قید ہوگئی۔ لیکن اس کا نتیجہ صرف عبدالحفیظ تک محدود نہ رہا۔ ہوم سیکریٹری نے ارادہ کرلیا کہ آئندہ مساجد کے خطیب اپنے خطاب مختلف بھاشاؤں کے بجائے صرف انگریزی زبان میں دیا کریں تاکہ انگریزی حکام ان کے مقاصد اور کارروائیوں کا اندازہ لگا سکیں۔

☆☆
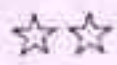
....صفحہ ۷۸ کا بقیہ

وہ تو اس کے وجود کا ایک حصہ تھا جس کے بنا وہ جی نہیں پاتی۔ ایک شام وہ گھر سے ننگے پاؤں اور ننگے سر نکلی اور پوری رات کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ کر اپنے مالک سے یہ پوچھتی رہی کہ آخر اسے کس خطا کی سزا مل رہی ہے۔ وہ فریاد بھی کرتی رہی اور ساتھ ہی اپنی آنکھوں سے اشکوں کے دریا بہاتی رہی۔ بے کس اور مظلوم کے پاس تو بس مولا کا ہی سہارا ہوتا ہے۔ اس نے بھی اسی کا دامن تھام لیا تھا۔

دن جتنا قریب آرہا تھا زیتون کے دل کی دھڑکنیں اتنی تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ وہ اپنے بچے کو سینے سے لگاتی اور پھر پھپھک کے روتی۔ اچانک ایک رات ایسا بھونچال آ گیا جس نے ساری دھرتی کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کے ڈھوکے تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر رہ گئے۔ اس بار تو زلزلہ اتنا شدید نہ تھا مگر اس بار تو قہر مچ گیا تھا۔ اس آفات سماوی نے ایک جھٹکے میں لاکھوں انسانی جانیں نگل ڈالیں تھیں۔ زلزلے نے ایسی بھاری تباہی مچائی تھی کہ لاکھوں گھر ریت کے گھروندوں کی طرح مسمار ہو کر رہ گئے تھے۔ بہت کم لوگ پاکستان والے کشمیر کے پہاڑی علاقے میں بچے تھے۔

ایک دن یہ خبر آگئی کہ جمال دین کو بھی اس زلزلے نے نگل ڈالا تھا۔ حاکم دین تو اپنا سر پیٹنے لگا مگر زیتون بت بنی کھڑی رہی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس خبر پر روئے یا خوشی منائے کیونکہ وہ ایک بار پھر ایک عجب دوراہے پر آکے کھڑی ہو گئی تھی۔

☆☆

حامدی کاشمیری

سری نگر

غزل

غلط انداز بادل ہوگئے ہیں
سلگتے دشت جل تھل ہوگئے ہیں

سر صحرا بہاریں جھومتی ہیں
گھروں میں لوگ پاگل ہوگئے ہیں

گلوں کو کھلنے میں کیوں ہے تامل
پرندے کتنے بے کل ہوگئے ہیں

نزول نور حق ہوتا تھا ان پر
یہ نیلے کالے دلدل ہوگئے ہیں

اسی بازار زر کا ہے کرشمہ
جو ارزل تھے وہ افضل ہوگئے ہیں

کہاں جاؤں میں برفیلی ہوا میں
وہ دروازے مقفل ہوگئے ہیں

خلیل تنویر

اودے پور، راجستھان

نظم

بہت کم ظرف ہیں اے دوست
ایسے لوگ دنیا میں
جنھیں ہر حال میں جینا نہیں آتا
ذرا سی کامرانی پر
ہوا میں اڑنے لگتے ہیں
غموں کی جب چلے آندھی
لرز کر ٹوٹ جاتے ہیں
خباثت سے جنھیں رغبت
لطافت سے جنھیں نفرت
حسد کی آگ میں جلنا
فنا کی سمت بڑھنا ہے
غرور بے خبر
دنیا میں رہتے ہیں تنہا

ظہیر غازی پوری

غزلیں

خار بن کر کبھی خود اپنی نظر میں رہنا
کتنا دشوار ہے جلتے ہوئے گھر میں رہنا

فکر و معنی کی طرح، پھول کی خوشبو کی طرح
"اپنی تقدیر میں لکھا ہے سفر میں رہنا"

یہی احساس وراثت میں ملا ہے ہم کو
جرم ہے سب سے بڑا چین سے گھر میں رہنا

خون سے لکھے اک اک لفظ صدا دیتے ہیں
باعثِ فخر ہے زندانِ ہنر میں رہنا

رنگ و خوشبو ہی ہمیشہ رہے منظور نظر
کس نے چاہا کبھی شعلوں کے اثر میں رہنا

زندگی کو جو نہ ہر رُخ سے کبھی دیکھ سکا
کیسے جانے گا وہ پتھر کے جگر میں رہنا

اچھے لگتے ہیں مجھے دشت بھی صحرا بھی ظہیرؔ
جب سے میں سیکھ گیا خوف و خطر میں رہنا

کرب ہی کرب نظر آتا ہے چہرا چہرا
اس طرح وقت نے انسان کا بدلا چہرا

جب ہواؤں میں بھی رچ بس گیا انساں کا لہو
کیسے پہچانوں یہاں کون ہے اچھا چہرا

کچھ فراغت مجھے دیتے جو مسائل میرے
اک ذرا غور سے میں لوگوں کا پڑھتا چہرا

کتنے ہی رنگ سمیٹے ہوئے دیکھا اس کو
کبھی جنگل نظر آیا کبھی صحرا چہرا

دفعتہً ٹوٹ پڑے لوگ اسی کی جانب
میں نے لفظوں سے نیا جب بھی تراشا چہرا

بات یہ سچ کی طرح لگتی ہے اب مجھ کو بھی
تیرے چہرے سے نہیں ملتا کسی کا چہرا

اک قیامت کا سماں ہوگا زمانے میں ظہیرؔ
جب چبھوئے گا اک اک آنکھ میں کانٹا چہرا

کرشن پرویز

کھرڑ

اردو

لوگ پھیلا کے جال اردو کا
روز کھاتے ہیں مال اردو کا
پیدا کرکے زبان کے جھگڑے
جینا کرتے محال اردو کا
منہ پہ تالے ہیں سب کے لگ جاتے
جب بھی آتا سوال اردو کا
ہر زباں کی وہ بات کرتے ہیں
نام لیں کیا مجال اردو کا
ہیں جڑیں کاٹنے میں سب مصروف
کیا بنے خد و خال اردو کا
سب تلے ہیں اِسے مٹانے پر
چند کرتے خیال اردو کا
کاش پوچھے کوئی زمانے میں
حال کیا، خستہ حال اردو کا
ہم نہ غلطی کریں گنوانے کی
ورنہ ہوگا حال اردو کا
لوگ بھی کیا کمال کرتے ہیں
نام ہندی کا مال اردو کا
کوئی شاید اُسے بھلا پائے
کام ہے بے مثال اردو کا
اک لڑی میں پرو دیا سب کو
سب نے دیکھا کمال اردو کا
یوں تو باتیں ہزار کرتے ہیں
کچھ بدل تو نکال اردو کا
اُٹ کے پرویز اب بھی قائم ہے
دیکھو جاہ و جلال اردو کا

اسحاق ملک

حیدرآباد، (اے۔ پی۔)

غزل

جاگے تو محبت کا زمانہ ہی نہیں تھا
سوئے تو زمانے کا ٹھکانہ ہی نہیں تھا

کردار شجاعت کے تھے ہر باب میں روشن
تاریخ میں الفت کا فسانہ ہی نہیں تھا

اک سانس فقط سینۂ نازک میں رواں تھی
کوئی مرے جینے کا بہانہ ہی نہیں تھا

جو تیر بھی نکلا وہ ہواؤں میں ہوا گم
کیا ٹھیک سے بیٹھے کہ نشانہ ہی نہیں تھا

میری نگہ و فکر کی دنیا ہی الگ تھی
میرے لئے ماحول سہانا ہی نہیں تھا

گونجا بھی تو خود بن گیا اک ڈوبتی آواز
جس گیت میں آہنگِ ترانہ ہی نہیں تھا

سر پر سے ملکؔ سارے طیور اڑ گئے آخر
چگنے کو کوئی جال میں دانہ ہی نہیں تھا

شاہد عزیز
اودے پور، راجستھان

عارضہ قلب

یہ درد وہ نہیں ہے
جسے جانتا ہوں میں
یہ درد میرے سینے میں
پہلی دفعہ ہوا
محسوس ہو رہا ہے
کہ جیسے نسوں میں اب
اک خون بہہ رہا ہے
کہیں خون کی جگہ
سارا تناؤ کھینچ کے
میرے دل میں آگیا
یہ درد وہ نہیں ہے
جو تم نے دیا مجھے
اب دیکھنا ہے درد کی
شدت ہے کون سی
کیوں بہتا ہوا خون
مرے دل میں جم گیا
کیوں سانس میرے سینے میں
پھنسنے لگی ہے اب
یہ درد میرے جسم کی
نبض نہ پھاڑ دے
اک کیل درد کی
مرے سینے گاڑ دے

محمد شاہد پٹھان
جے پور، راجستھان

غزل

بیاباں میں مبدل ہو رہی ہے
یہ دنیا پھول، خوشبو کھو رہی ہے

ستارے بھی ہیں گردش میں ازل سے
زمیں بھی بوجھ اپنا ڈھو رہی ہے

اُگیں گے خار جن سے نفرتوں کے
''سیاست'' بیج ایسے بو رہی ہے

لگا کر زخم میری زندگی کو
ندامت دوستوں کو ہو رہی ہے

کہیں پر ہے قیامت خیز گرمی
کہیں پر تیز بارش ہو رہی ہے

کسی کے قرب کی خوشبو سے شاہدؔ
غزل میری معطر ہو رہی ہے

غزلیں

یوگیندر بہل تشنہ

تنکا یہاں تنکا وہاں
بکھرا گیا ہے آشیاں

گمشدہ پنچھی کی صورت
اڑ رہا ہے یہاں وہاں

سائے ڈھلنے سے پیشتر
ڈھونڈتا ہے جائے اماں

فکر فردا نہ ذکر کل
جئے جاتا ہے بے گماں

ناتمامی و تشنگی
حرص و ہوس کا ہے امتحاں

دل ہے تمنا میں نہیں
تشنگی کا کوئی نشاں

کرتا پھرتا ہے زندگی
تشنہ وہ صورت گماں

صلاح الدین نیر

یہ فصل گل ہے تو پھر انتشار کیسا ہے
خزاں کی زد میں یہ جشن بہار کیسا ہے

وہ جس کی چھاؤں میں اپنی تھکن اترتی تھی
شجر وہ گاؤں کا اب سایہ دار کیسا ہے

عجیب لگتا ہے یہ بے بسی کا جینا بھی
ہیں خالی ہاتھ تو یہ اختیار کیسا ہے

وہ آرہا ہے کفن اپنے سر پہ باندھے ہوئے
ہمیں بتایئے وہ جاں نثار کیسا ہے

تم اپنے پاؤں بہت سوچ کر بڑھاتے ہو
اک اجنبی پہ بھی یہ اعتبار کیسا ہے

معمہ کیا ہے یہ ایسا سمجھ میں آ نہ سکا
یہیں پہ ہم ہیں تو پھر انتظار کیسا ہے

کوثر صدیقی

بھوپال

رباعی نما

پژمردہ مرے غنچۂ جاں کو مہکا
مصروف رہوں تیری ثناخوانی میں
اللہ ! مرے طائرِ جاں کو چہکا

☆

دنیا جسے کہتے ہیں وہ ہے ریگستان
دوشِ شترِ تشنہ لبی پر بیٹھا
تا عمر میں ڈھونڈا ہی کیا نخلستان

☆

بہتے ہوئے دریا میں اُتر کر دیکھا
اک آگ سی تھی میرے قدم کے نیچے
ریگِ تہِ دریا کا بھی منظر دیکھا

☆

مچھلی کو سمجھتا تھا کہ ہوگی سیراب
دریا میں مگر غوطہ لگا کے دیکھا
ہر سمت نظر آیا مجھے دشتِ سراب

☆

پائل تری چھنکے تو عنادل چہکیں
ہے موسمِ گل تیرے بدن سے منسوب
زلفوں کو تو لہرائے تو بادل مہکیں

☆

نظام ہاتف

مرادآباد (یو. پی.)

غزل

سفر نہ خشک تھا نہ سرخ پانیوں کا تھا
کہ پہلا ہی قدم دھواں دھواں روانیوں کا تھا

ہمارے یخ بدن پہ لکھ حرارتوں کی آیتیں
سقوطِ دل کو شوق تیز تر روانیوں کا تھا

وہ چاہتا تھا اس کی حمد اور ثنا بیان ہو
وہ دور ہمنواؤں کی غلط بیانیوں کا تھا

فصیل جسم پر چراغ طاق طاق جل اٹھے
ہنسی بھی جیسے ایک حصہ میزبانیوں کا تھا

ہمارے راستے میں فرش بھی گلوں کے تھے
کہ وقت کامیابیوں کا کامرانیوں کا تھا

نظر میں چہرے بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور میں
شکار جانے کیسی کیسی خوش گمانیوں کا تھا

کبھی اکیلے لگ رہے تھے مجھ کو لوگ بھیڑ میں
کہ ذکر اجنبیوں کا آنجہانیوں کا تھا

غزلیں

رونق شہری
دھنباد، جھارکھنڈ

عدوئے خاص کا سارا ہی دھیان مجھ پر ہے
کوئی جواز ہے وہ مہربان مجھ پر ہے

کئی ستون لہو رنگ ہیں مجھی سے ہی
جھکا ہوا یہ شکستہ مکان مجھ پر ہے

حواس مجتمع ہوں تو سناؤں صورتِ حال
سرکنے والی وہ بھاری چٹان مجھ پر ہے

ہوائے وقت چلی تو مٹا کے رکھ دے گی
ابھی تو زخم کا باقی نشان مجھ پر ہے

مجھی پہ کرتی ہے منحصر عافیت سب ہے
ٹکا ہوا یہ مرا خاندان مجھ پر ہے

اُگے ہوئے ہیں طبیعت میں ہی ببول بہت
نظر کا بوجھ یہ باغِ جہان مجھ پر ہے

فائزالہاشمی
بھوپال

یہ صبح گرفتار کہاں آکے رُکے ہیں
اُف رقصِ شبِ تار کہاں آکے رُکے ہیں

روشن ہی نہیں ذہن میں افکار کی قندیل
یہ صاحبِ گفتار کہاں آکے رُکے ہیں

ہر سانس تہہِ دام ہے، ہر دوست تہہِ سنگ
یارانِ قدح خوار کہاں آکے رُکے ہیں

ہر سمت نظر آتی ہے پتھر کی خدائی
یہ قافلہ سالار کہاں آکے رُکے ہیں

سوکھی ہوئی آنکھیں لیے بیٹھے ہیں گھروں میں
دیکھو تو مرے یار کہاں آکے رُکے ہیں

کھلتا ہی نہیں رنگِ غزل شوخیٔ لب سے
فائز ترے افکار کہاں آکے رُکے ہیں

اقبال مسعود

بھوپال

انفاس کا اسیر

(۱)

مرغ شب آویز
شاہ بلوط پر ایک پاؤں سے لٹکا
حق حق کرتا
منتظر یم خانہ میں
کبھی آدم
کبھی ہاروت، کبھی ماروت
کہلاتا
جنت کا مہروب
گھر خانہ اصلی کا متمنی
مہرہ زر ششدر بودن
مہر خم لگائے
پیان پُر شدن کو پہنچا
مگر اب بھی
شاہ بلوط پر ایک پاؤں لٹکائے
حق، حق
کرتا جاتا ہے☆

(۲)

مرغ زیرک ساز
تیز گردانی میں مصروف
تیغ بجانب گردن
غائب اوقات میں
تیری رضا کا متمنی
دامن شب میں
تنزیل کی قرأت کرتا ہوا
حق، حق
حق، حق

(۳)

مرغ زیرک
انفاس کا اسیر
علم سے انفراس
انصرام کا منتظر
حق، حق
حق، حق

نجیب رامش

"دستکیں"

(۱)

جھٹ پٹا ہر سمت پھیلاتا ہوا
پھر ہوا کا نرم آنچل اڑ چلا
شام کی آنکھوں میں کاجل ڈال کر
سرمئی رنگوں کا بادل اڑ چلا
دن کے ہنگاموں کی اک اک راگنی
دور کی آواز بن کر رہ گئی
آسماں پر ٹوٹے تارے کی لکیر
رات کا آغاز بن کر رہ گئی
چاند کے چہرے پہ لہرانے لگا
ابر کی اُڑتی ہوئی زلفوں کا خم
دستکیں - یہ دھیمی دھیمی دستکیں
واہمہ - در واہمہ -!

(۲)

قلب کی گہرائیاں خاموش ہیں
چپ لگی ہے ذہن پر افکار پر
اور یہ ماحول کچھ بیمار سا
اک تھکن سی ہے یہ در و دیوار پر
بے زباں سی جرأتِ اظہارِ درد
ان دنوں اشعار کچھ ویران سے
اک حسیں بیوہ کی آنکھوں کی طرح
خواب کے بازار کچھ ویران سے
گھر میں چکراتا ہے نیلا سا دھواں
بجھ گئی ہے شام ہی سے چشم نم
دستکیں - یہ دھیمی دھیمی دستکیں
واہمہ در واہمہ -!

(۳)

کوئی دھوکا دینے بھی کیوں آئے گا
کس کو راس آئیں گے تیرے صبح و شام
کون دوڑے گا سرابوں کی طرف
کون رہ پائے گا اتنا تشنہ کام
تیرا جیون بے شجر اک ریگ زار
اس کی جیسی خاصیت ویسا ہی نام
تیرا ہی دم ہے کہ تو اس زہر میں
زندگی کے گیت گا لیتا تو ہے
آس کی کلیاں اُگا لیتا تو ہے
روک کر پلکوں پہ اکثر سلک اشک
مسکرا لیتا تو ہے تو کم سے کم
دستکیں - یہ دھیمی دھیمی دستکیں
دستکوں پر چونک پڑنا چھوڑ یار
تیز ہے باہر ہوا - بجتا ہے در

☆☆

غزلیں

احمد سراج فاروقی
کوئٹہ

جاں نثاری کا یہ صلہ دے گا
میرے زخموں کو وہ ہوا دے گا

اس کے منہ سے بھی بد دعا نکلی
میں یہ سمجھا تھا وہ دعا دے گا

اس کے آنگن میں خود اندھیرا ہے
دوسروں کو وہ کیا ضیا دے گا

''وقت سو منصفوں کا منصف ہے''
وقت مجرم کو خود سزا دے گا

آؤ پوچھیں اسی مسیحا سے
دل کے زخموں کی کب دوا دے گا

تم بھی اب اس کو بھول جاؤ سراجؔ
وہ بھی اک دن تمہیں بھلا دے گا

پریتا واجپئی
لکھنؤ

دشمنی سورج سے کچھ ایسی ہوئی
دھوپ گھر میں آئی تو بدلی ہوئی

کیا بتائیں ملک کے حالات ہم
زندہ لاشیں ہیں مگر جلتی ہوئی

مجھ کو سمجھایا تھا اک درویش نے
جب بلندی بڑھ گئی پستی ہوئی

ہو بھلا لوگو! نئی تہذیب کا
موت مہنگی زندگی سستی ہوئی

فرش سے پہنچے گی فوراً عرش پر
ماں کے دل کی ہر دعا نکلی ہوئی

حق بیانی مصلحت کے دور میں
سر پہ اک تلوار ہے لٹکی ہوئی

کیا پریتاؔ مسکراتا ہے کوئی
ہر طرف ہے روشنی پھیلی ہوئی

رفیق شاہین

علی گڈھ

بے خود مجھے بنائے جب تیری یاد آئے
دنیا کے غم بھلائے جب تیری یاد آئے

گم ہے کہاں پہ دھرتی اور آسماں کہاں پر
کچھ بھی نہ سوجھ پائے جب تیری یاد آئے

میں پھر سے خود کو پاؤں پہلو میں تیرے جانم
دل جھوم جھوم جائے جب تیری یاد آئے

سانسیں مہک اٹھیں اور ہو روح بھی معطر
یوں مجھ میں تو سمائے جب تیری یاد آئے

پھر سازِ دل کو چھیڑیں نغمات سرخوشی کے
مجھ کو غزل سنائے جب تیری یاد آئے

مٹی لگے یہ دولت دھوکہ لگے یہ شہرت
بس تو ہی دل کو بھائے جب تیری یاد آئے

شاہینؔ کی نہ ہو کر منسوب غیر سے کیوں
یہ غم بہت ستائے جب تیری یاد آئے

نغمانہ

بڑا ہی سہانا بڑا مسکرانا
پہ پلکیں جھکانا یہ نظریں ملانا

یہ دفتر کو جانا عبث ہے کمانا
ترا یاد آنا ہے بڑھ کر خزانہ

میں دو دن تو دیکھوں بہاریں چمن کی
ابھی مت جلانا مرا آشیانہ

نہیں ہو سکوں گا تمہارا مجھے اب
نظر بھی نہ آنا مجھے بھول جانا

چلا میں تو جانم مری یاد میں تم
نہ جی کو جلانا نہ آنسو بہانا

بدلتے ہی موسم جدا ہوگئے ہم
نہیں اب سہانا وہ رنگیں زمانہ

سکھایا ہے انورؔ نے شاہینؔ تم بھی
نئے سُر دِکھانا نئے گیت گانا

غزلیں

محسن عرفی

تانڈور، آندھرا پردیش

اس نے کہی جو ہاں — میں ہوگیا جواں
ہے رقص میں زمیں — گاتا ہے آسماں
کس نے سجائی ہے — خوابوں کی کہکشاں
دم بھر میں آگیا — منزل پہ کارواں
معشوق مل گیا — یا مل گیا جہاں
رندانہ دعوتیں — یہ دلنوازیاں
چشم کرم تری — بندہ نوازیاں
قائم رہے سدا — یہ فیض بیکراں
تعریف یار کی — کیا کرسکے زباں
توصیف کے لئے — الفاظ ہیں کہاں
ممنون ہوں ترا — اے میرے مہرباں
کیا بن گیا ہوں میں — تصویر جانِ جاں
لو جگمگا اُٹھا
عرفی ترا مکاں

خدا سے مانگ کے عین الیقین لائے ہیں
حق اپنا وقت کے ہاتھوں سے چھین لائے ہیں

جلا نہ پائے گی تا حشر آتشِ نمرود
ہم اپنے ساتھ براہیمی دین لائے ہیں

کرے گی سجدہ جسے ایمی توانائی
خدا کے ہاتھوں بنی وہ مشین لائے ہیں

یہاں بھی حور و ملائک کی محفلیں ہوں گی
"ہم آسماں سے غزل کی زمین لائے ہیں"

ہر ایک سمت اسی رُخ کی روشنی ہوگی
مٹے گی تیرگی زہرہ جبین لائے ہیں

کیا جو وعدہ نبھانا ہے آپ سے عرفی
چلے بھی آؤ کہ تحفہ حسین لائے ہیں

معنی ہوں تو الفاظ کا پیکر بھی بنا
چھا جاؤں میں آکاش پہ بادل کی طرح
قطرہ ہوں اگر میں تو سمندر بھی بنا

☆

مفہوم و معانی کا خزانہ دیکھا
غالب کا صحیفہ وہ کہ دیوانِ میر
کوزے میں سمایا ہوا دریا دیکھا

کوثر صدیقی

غزلیں

تلک راج پارسؔ
جبلپور

ظاہر میں ہے طواف مگر باندھ رہی ہے
لہروں کو مرے تن سے بھنور باندھ رہی ہے

آئی تھی رُت سیاہ لبادے کو اوڑھ کر
جاتے ہوئے نویدِ سحر باندھ رہی ہے

میرے ہی تن سے کاٹ کے ناراض زندگی
دستِ طلب میں کاسۂ سر باندھ رہی ہے

اک دن زمیں کی حد سے نکل جائے گی حیات
صدیوں سے اپنا رختِ سفر باندھ رہی ہے

اڑنے کا جب ارادہ کیا ہے تو زندگی
اب ریشمی احساس سے پر باندھ رہی ہے

اپنے کئے پہ ہوگی پشیماں مگر ابھی
زخموں پہ آنسوؤں کے شرر باندھ رہی ہے

پارسؔ جو آکے ذہن میں فن کو سنوار دے
ایسا ہر اک خیال نظر باندھ رہی ہے

ڈاکٹر شمیم ہاشمی
ہزاری باغ، جھارکھنڈ

جو میرے دل میں ہے ملنے کی آس رہنے دو
کسی کی دید کی آنکھوں میں پیاس رہنے دو

یقیں کی بات کرو اب قیاس رہنے دو
نظر میں ضوفشاں سچ کا لباس رہنے دو

ہمارے باغ کے سب پھول پھل تمہارے ہیں
ہمارے واسطے بس خشک گھاس رہنے دو

نظر جھکائے شجر ہیں کہ بے لباس ہوئے
خزاں کی ضد ہے انہیں بے لباس رہنے دو

تمہارے جسم کی خوشبو مری غزل میں رہے
مجھے ہوا کی طرح اپنے پاس رہنے دو

جو درد دل میں چھپائے ہوئے تھے برسوں سے
وہ بے لباس ہے اب، بے لباس رہنے دو

شمیمؔ ہم کو مسرت تو ہے عزیز مگر
بضد ہے دل کہ پھر اس کو اداس رہنے دو

غزلیں

ڈاکٹر تسیم اعظمی
مئوناتھ بھنجن (یو. پی.)

ممنوعہ ذائقے کا طلبگار ہے بہت
اندر سے پارسا بھی گنہگار ہے بہت

یہ زندگی بھی یارو! طرحدار ہے بہت
معصوم ہے کبھی، کبھی عیار ہے بہت

رسوا تھا گاؤں گاؤں بہت جس کا بانجھ پن
اب کے برس وہ پیڑ ثمردار ہے بہت

کن گل رخوں کے شہر سے آئے ہوئے ہیں آپ
چہرہ مرے حضور کا گلنار ہے بہت

کل تک جو دشمنوں کے مقابل تھا سرخرو
اب اس پہ دوستوں کی بھی یلغار ہے بہت

خوشبو بھلا رہے گی کیا پھولوں کی قید میں
آزاد جس کی گرمیٔ رفتار ہے بہت

وہ پی گیا ہے سارے زمانے کی تلخیاں
جس آدمی میں نرمیٔ گفتار ہے بہت

ملت وہ کیا چلے گی زمانے کے ہم رکاب
فرسودہ جس کے علم کا معیار ہے بہت

خوگر جہاں پہ زرد صحافت کے لوگ ہیں
بیباکیٔ قلم وہاں آزار ہے بہت

وہ مصلحت گزیدہ سیاست زدہ نہیں
جس میں نسیم جرأتِ اظہار ہے بہت

ضیا فاروقی
نواب گنج، کانپور

پہلے کچھ آئینے بنائے گئے
سنگ پھر ان پہ آزمائے گئے

صرف اک دشت کی خصومت میں
شہر کتنے یہاں بسائے گئے

جتنے حربے تھے دوستوں کے پاس
سب کے سب ہم پہ آزمائے گئے

راستے سب وہی پرانے ہیں
صرف پتھر نئے لگائے گئے

جس کے نیچے ہیں زلزلے آباد
ہم اسی خاک پر بسائے گئے

وہ جہاں عقل بھی نہیں پہنچی
مدتوں ہم وہاں بھی آئے گئے

عشق پسپا ہوا نہ آخر تک
قلعۂ دل ہزار ڈھائے گئے

پہلے حق گوئی پر کیا مامور
اور پھر دار پر چڑھائے گئے

کون اٹھاتا ہمیں یہاں سے ضیا
اپنے ہاتھوں ہی ہم اٹھائے گئے

غزلیں

منیر سیفی

سمن پورہ، پٹنہ

کلی، گل، صبا، تتلیاں اور بھی ہیں
ہماری طرح بے زباں اور بھی ہیں
مساجد دکان و مکاں اور بھی ہیں
جلائی گئی بستیاں اور بھی ہیں
کہ بچوں کو نوکِ سناں پر اٹھالو
ابھی ظلم کی داستاں اور بھی ہیں
ہواؤں سے کہہ دو کہ خنجر اٹھالیں
درختوں پہ کچھ پتیاں اور بھی ہیں
نئی طاقتیں ہیں مرے بال و پر میں
نظر میں کھلے آسماں اور بھی ہیں

کمل شبنم کپور

ممبئی

چلے تھے گاؤں سے تو کچھ نشانیاں رکھ لیں
بڑے جتن سے کتابوں میں تتلیاں رکھ لیں
سبق سکھا تو گیا تیرگی کا بنجارہ
جلا کے صبح سے لوگوں نے تتلیاں رکھ لیں
وہ سر چھپانے کا اک آخری سہارا تھا
درخت جس کی پڑوسی نے ڈالیاں رکھ لیں
تمہارے تاج کے موتی کہاں سے آئیں گے
اگر چھپا کے سمندر نے سیپیاں رکھ لیں
فضا کا روپ سجانے کو کس نے اے شبنم
دھنک کے رنگ سے بھر کر پیالیاں رکھ لیں

راشد جمال فاروقی

دیر بھدرا، ضلع دہرہ دون

بھلے دن آئیں تو آنے والے بُرے دنوں کا خیال رکھنا
تمام خوشیوں کے جمگھٹے میں بھی تھوڑا تھوڑا خیال رکھنا
وہ جارہا ہو تو واپسی کے تمام امکان جان لینا
جو لوٹ آئے تو کیسے گزری یہ اُس سے پہلا سوال رکھنا
اگر کبھی یوں لگے کہ سب کچھ اندھیری راتوں کے داؤں پر ہے
تو ایسی راتوں میں ڈر نہ جانا، تو چاند یادیں اُجال رکھنا
فقط تصنع فقط تکلف تمام رشتے تمام ناتے
تو کیا کسی کا خیال رکھنا تو کیا روابط بحال رکھنا
یونہی اکیلے رہا کئے تو اداس ہوگے نڈھال ہوگے
جو عافیت چاہتے ہو راشد تو چند رشتے سنبھال رکھنا

مضطر نشاطی

چھبڑہ

دوہا غزل

لگتا ہے گھبرا گئے اسواتی سے آپ
ورنہ منہ نہ موڑتے سچائی سے آپ

صاحب اوروں کو بھلا بخشیں گے کیا عزم
خود ہی جبکہ ڈر گئے پرچھائی سے آپ

میرے جیسے لاکھ ہیں یا گنتی کے چند
میرے حق میں سوچیے گہرائی سے آپ

لینا دینا گھوس کا جب تک نہ ہو بند
لڑتے رہتے دیس میں مہنگائی سے آپ

کچھ دن تنہا بھی رہو آخر اتنی جلد
مضطر جی گھبرا گئے تنہائی سے آپ

فرسودہ روایات کی دلدل سے نکل
افکار کی مہکی ہوئی دنیا میں آ
کانٹوں بھرے خود ساختہ جنگل سے نکل
کوثر صدیقی

درد جاپدانوی

کانپور

غزل

درد انگیز کہانی تیری
برگِ گل پر ہے نشانی تیری

پھول مہکا تو خزاں نے یہ کہا
چند ساعت ہے جوانی تیری

منحصر تند ہواؤں پہ ہے
ہستی اے برگِ خزانی تیری

تیرے افسانے میں رنگ آجائے
گر سنا جائے زبانی تیری

دلِ بے تاب سے کہتا ہے کوئی
رات ہے دشمنِ جانی تیری

محفلِ ناز میں کام آئے گی
دردؔ آشفتہ بیانی تیری

محمد ایوب واقف

منگل آشیش 'بی'، فلیٹ نمبر 43،

سیکٹر نمبر 12، کوپر کھیرانے، نئی ممبئی 709 400

لیلائے اردو کا عاشقِ صادق - گوپی چند نارنگ

اردو زبان اور اس کے رسم الخط سے مجھے بے پایاں اور والہانہ لگاؤ ہے۔ اس زبان سے رغبت اور محبت میرے خون میں شامل ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں دوسروں کی زبانوں سے نفرت کرتا ہوں۔ زبانوں کے تعلق سے عصبیت اور تعصب کو میں گناہ سمجھتا ہوں اور قومی زبان ہندی سے تو میں لاتعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اردو اور ہندی جڑواں اور سگی بہنیں ہیں۔ شاعرِ مشرق حضرت شفیق جونپوری نے بالکل درست کہا تھا کہ:

اک خالدہ خانم ہے اک راجکماری ہے
اردو بھی ہماری ہے ہندی بھی ہماری ہے

لیکن جب کوئی بر بنائے نفرت وحقارت اور بہ زعم باطل (Conceit) اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے سلسلے میں دروغ بیانی اور دشنام طرازی سے کام لیتا ہے تو میں انتشارِ ذہنی کا شکار ہو جاتا ہوں اور میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ چنانچہ ادھر جب برصغیر ہندو پاک کے نامور محقق اور ادیب ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' چھپ کر منظرِ عام پر آئی تو میں شدید قسم کی ایذا دہی (Excruciation) میں مبتلا ہو گیا۔ کیونکہ گیان چند جین کا یہ ایک افسوس ناک کام تھا۔ میرے ذہن میں انگنت بار یہ سوال اٹھا کہ آخر وہ کون سی ضرورت آن پڑی تھی کہ صریح فتنہ انگیزی پر مشتمل ایسی کتاب انھوں نے لکھ ڈالی؟ اردو کے خلاف یہ جال انھوں نے کیوں پھیلایا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے گیان چند جین صاحب ایک والا تبار اور عالی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے خاندان کے متعدد افراد اردو زبان اور اردو شعر و شاعری سے براہ راست وابستہ رہے ہیں۔ ایسی صورت میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ اتنے مضبوط اور طویل رشتے کو انھوں نے آنِ واحد میں کیوں توڑ دیا۔

گیان چند جین کا شخصی کردار اٹلی کے اُسقفِ اعظم (پوپ بینڈکٹ) جیسا نظر آتا ہے۔ لارڈ بشپ (پاپائے روم) کے لیے مناسب تو یہ تھا کہ وہ خود پیغمبرِ اسلامؐ کے بارے میں گیرائی و گہرائی

سے مطالعہ کرتے اس کے بعد حقائق کی روشنی میں قابلِ وثوق اور قرینِ عقل بیان دیتے۔ اس سے ان کے بیان کی معقولیت اور رجائیت مستند سمجھی جاتی۔ لیکن مصلحتاً ایسا نہ کر کے انھوں نے صلیبی جنگ کے زمانے کے ایک عیسائی شہنشاہ کے متناقص، متخاصم اور شر انگیز بیان کو دہرا دیا، گیان چند جین نے اردو، اردو رسم الخط، اسلام اور مسلم بادشاہوں کے بارے میں اپنی تحقیق اور چھان بین کو بالائے طاق رکھ کر امرت رائے کی کتاب "A House Divided" کے صفحات پر پھیلے ہوئے زہر کو پیا اور پھر اسے اپنی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' کے صفحات پر اگل دیا۔ جین صاحب نے اپنی اس کتاب کا انتساب پسر پریم چند امرت رائے اور گوپی چند نارنگ کے نام کیا ہے۔ امرت رائے کے نام اس قابل باز پرس (Chargeable) کتاب کو معنون یا منسوب کیا گیا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوتی کیونکہ ان کی اردو دشمنی تو جگ ظاہر ہے لیکن گوپی چند نارنگ کے نام اس کتاب کو منسوب کر کے گیان چند جین نے وہ گمراہ کن حرکت کی ہے کہ جسے کسی بھی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا۔ گیان چند جین کی اس نادانی اور ناسمجھی سے نارنگ صاحب کے متعلق اردو کے ایک مخصوص حلقے میں بدظنی پیدا ہوئی۔ اردو دنیا میں گوپی چند نارنگ صاحب کا یقین اور اعتبار (Credence) ان کی صداقت اور جاں سپاری مسلم الثبوت حقائق ہیں۔ ان حقائق کو ہم مجروح ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ گوپی چند نارنگ صاحب کو شک و شبہے کے دائرے میں لانے کا مطلب اردو کے چمن زار کو خزاں دیدہ کرنے کے مترادف ہے۔

گیان چند جین صاحب کی مذکورہ کتاب چھپ کر جب منظرِ عام پر آئی تو روزنامہ انقلاب ممبئی کی فرمائش پر راقم الحروف نے ایک مختصر سا مضمون قلمبند کیا۔ میرے مضمون سے قبل شمس الرحمن فاروقی صاحب کا مفصل اور وقیع تبصرہ اس کتاب پر شائع ہو چکا تھا۔ ان دونوں تحریروں کو سامنے رکھ کر انگریزی کے مشہور اور نامی (Celebrated) اخبار ٹائمز آف انڈیا کے 10 مئی 2006 کے شمارے میں ایک مضمون بعنوان "Scholar's diatribe angers Urdu press" اس مضمون کو سپردِ قلم کرنے والے "Times of India" کے سینئر صحافی جناب وجیہہ الدین تھے۔ میرے مضمون کے تعلق سے وجیہہ الدین صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون میں لکھا تھا کہ:

> Interestingly, Jain has dedicated his book to two writers — the late Amrit Rai, a known anti-Urdu activist and Gopi Chand Narang, President of the Sahitya Akademi and a celebrated Urdu scholar. "One can understand Jain's soft corner for Rai, but

Narang is our beloved writer and an ambassador of Urdu," said Ayyub Waqif in a piece in Urdu daily Inquilab."

میں اپنے ناچیز نوکِ خامہ پر یہ حرفِ حقیقت پھر بہت صاف اور واضح انداز کے ساتھ لا رہا ہوں کہ جناب گوپی چند نارنگ صاحب اردو زبان و ادب اور ہم اردو والوں کے لیے ایک ایسے متبرک اور عطیۂ خداوندی ہیں کہ جس کی مثال نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ وہ دو چار سال سے نہیں بلکہ گزشتہ پچاس سال سے عالمی سطح پر اردو کے ایسے معرکۃ الآرا، عظیم الشان اور پائیدار سفیر ہیں کہ جس کی زبان پر ترانۂ اردو کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ وہ اردو کی شان و عظمت کے نشان اور اس کی علامت (Insignia) ہیں۔ ان پر یہ شک کرنا کہ وہ اردو زبان اور مسلم قوم کے لیے دشنام آمیز (Opprobrium) کلمات استعمال کرنے والے کسی شخص کے حامی و طرفدار ہوں گے محلِ نظر ہے۔ ہم ایسے تمام شکوک و شبہات کو بیک قلم خارج کرتے ہیں۔ ہم یہ بھی صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں کہ جناب گوپی چند نارنگ اپنی زندگی کے ہر دور میں اردو زبان، اس کے رسم الخط اور اس کے شاندار ادب کے ترجمان اور نگہبان رہے ہیں۔ اور ان کی اس نگہبانی نے اردو زبان اور اس کے لسانی، تحقیقی اور تنقیدی مزاج اور اطوار کو عالمی سطح پر عزت و وقار بخشا ہے۔ اردو کا ایسا بے لوث خادم، مربی اور بہی خواہ ہمیں ہمیشہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ آج ہمیں ایسا جلیل القدر اور فی زمانہ محبوب شخص حاصل ہے تو پھر ہمیں اس کی قدر و منزلت اور اعتراف و احترام میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ وقت کی ضرورت ہے اور وقت کی اس ضرورت کو سمجھنے میں ہم سے بھول نہیں ہونی چاہیے۔

26 اگست 2006 کو بوقت شام تقریباً ساڑھے سات بجے بھوپال کے اولڈ رفیقیہ اسکول کے ہال میں دبستانِ بھوپال اور سہ ماہی 'کاروانِ ادب' کی جانب سے گوپی چند نارنگ کو پرتپاک استقبالیہ دیا گیا۔ اس اعزازی جلسے میں خاکسار بھی موجود تھا۔ منتظمین جلسہ کی نوازشیں اسے بھی حاصل ہوئیں۔ بھوپال کے ادیبوں، شاعروں اور شائقینِ ادب کا یہ خاصا بڑا مجمع تھا۔ اس مجمع کے سامنے گوپی چند نارنگ نے جو تقریر کی اسے تاریخی تقریر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں رام پور رضا لائبریری نے نارنگ صاحب کے کچھ بہت ہی اہم اور قیمتی مضامین کا مجموعہ 'اردو زبان اور لسانیات' کے نام سے شائع کرنے کا شرف اور فخر حاصل کیا ہے۔ اپنی تقریر کے دوران اس کتاب کے دیباچے کے کچھ حصے انھوں نے پڑھ کر حاضرینِ جلسہ کو سنائے۔ اہلِ بھوپال کو میں بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے انھوں نے ہی اس بیش قیمت کتاب یعنی 'اردو زبان اور لسانیات' کا بہ چشم خود دیدار کیا اور اس کے

دیباچے کے وافر حصے کو بہ زبانِ مصنف سننے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھیے کہ بھوپال کے مشہور روزنامہ 'ندیم' نے دوسرے روز یعنی 27 اگست کو مذکورہ جلسے کی روداد نہایت خوبصورتی سے شائع کی، اس وقت گوپی چند نارنگ صاحب کے بارے میں جب میں مضمون لکھنے بیٹھا ہوں تو ان کی وہ کتاب میرے سامنے ہے، میں چاہتا ہوں کہ مذکورہ کتاب کے جن حصوں کو انھوں نے بھوپال کی اپنی تقریر میں پیش کیا تھا میں اس مضمون میں شامل کروں تاکہ میری اس تحریر کے قارئین نارنگ صاحب کے وضاحتی دیباچے سے اچھی طرح لطف اندوز ہوسکیں اور اردو اور اردو کے رسم الخط سے انھیں جو عقیدت اور محبت ہے اس سے بھی واقف ہوسکیں۔ تو آیئے اقتباسات پر نظر ڈالیں:

''یہ بات بتانے یا جتانے کی نہیں کہ اردو سے میری وابستگی دیوانگی کی حد تک ہے۔ جب لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اردو کی خدمت کر رہے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بڑی زبان جس کے ذریعہ کروڑوں اپنی زندگی کو بامعنی بناتے یا اپنے وجود کی شناخت کراتے ہیں وہ کسی فردِ واحد کی خدمت کی محتاج کیسے ہوسکتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اردو ہماری صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے، یہ ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا وہ ہاتھ ہے جس نے ہمیں گڑھا، بنایا اور سنوارا ہے، یہ ہماری ثقافتی شناخت ہے جس کے بغیر نہ صرف ہم گونگے بہرے ہیں بلکہ بے ادب بھی۔ میں نے بارہا کہا ہے کہ اردو کو محض ایک زبان کہنا اردو کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے، یہ ایک طرزِ حیات، ایک اسلوبِ زیست، ایک اندازِ نظر یا جینے کا ایک سلیقہ و طریقہ بھی ہے، اس لیے کہ اردو صدیوں کے تاریخی ربط و ارتباط سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایسا روشن استعارہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برصغیر کی زبانوں میں نہیں۔''

اسی دیباچے میں گوپی چند نارنگ صاحب نے آگے چل کر اردو زبان کے تعلق سے اپنے دلی جذبات، احساسات اور دوٹوک اور فیصلہ کن خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انتہائی واضح اور بیباکانہ انداز کے ساتھ یوں لکھا ہے کہ:

''یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اترتی چلی گئی، یقیناً کچھ تو جادو ہوگا۔ تاج محل کا کرشمہ مثالی ہے، میں اردو کو 'زبانوں کا تاج محل' کہتا ہوں اور اکثر اس لذت کو اپنے خون کی روانی میں سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے خبر و بے خبری میں محسوس کرتا ہوں۔ زبان میرے لیے رازوں بھرا

بستہ ہے۔ کیسے ہند آریائی کے بستے میں عربی فارسی ترکی کے رنگ گھلتے چلے
گئے اور کیسے ایک رنگا رنگ دھنک بنتی چلی گئی کہ جنوبی ایشیا کے اکثر ممالک کے
طول و عرض میں وہ آج 'لنگوا فرینکا' بھی ہے اور ایک ایسا ادبی اظہار بھی جس
کے رس اور بالیدگی کو دوسری زبانیں رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔''

'اردو زبان اور لسانیات' کے مختصر دیباچے سے جب میں گوپی چند نارنگ کے زرّیں، جلیل القدر اور رفیع الشان خیالات و احساسات پر مشتمل اقتباسات کو نقل کر رہا تھا تو بے اختیار میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بھیگی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کے کچھ قطرے کاغذ پر بھی آ گرے۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ واقعی خدا نے اردو کا ایسا عاشقِ صادق پیدا کر کے اردو پر احسان عظیم کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اردو سے فرضی لگاؤ اور طرفداری کا شور اور ہنگامہ پیدا کر کے بازار ہست و بود میں سستی شہرت اور مقبولیت تو حاصل کی جا سکتی ہے لیکن اردو سے محبت کا جواز ڈھونڈنا اور اس جواز کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لینا تو گوپی چند نارنگ جیسے خاصانِ کمال کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ یہ دل لگی نہیں مبنی بر حقیقت بات ہے کہ گوپی چند نارنگ کا سینہ چاک کر کے دیکھیے تو اس کے خون کے قطرے قطرے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی محبتِ اردو کی دمک اور مہک ملے گی۔ قربان جایئے ایسے فنافی الاردو پر۔

گوپی چند نارنگ کی کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' ایسے وقت میں شائع ہوئی ہے جب گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' کی اشاعت نے ماحول کو حد درجہ پراگندہ کر دیا تھا۔ اس کتاب نے بعض متوازن اذہان کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو بھی بدگمانیوں کا شکار کرنے میں خاصا کردار ادا کیا۔ ایسے شورش زدہ اور مسموم ماحول میں گوپی چند نارنگ کی زیرِ نظر کتاب شکوک و شبہات کے داغ دھبوں کو دھونے کا نیک اور تعمیری کام بھی کر سکتی ہے اور زخموں کا پھاہا بھی بن سکتی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلی اچھی بات تو یہ ہوگی کہ گیان چند جین نے اپنی نزاعی اور متنازعہ فیہ (Controversial) کتاب کو گوپی چند نارنگ کے نام نامی سے منسوب یا معنون کر کے ان کے تعلق سے کچھ ذہنوں میں جو وسوسہ پیدا کر دیا تھا اور لوگ یہ سوچنے لگے تھے کہ کہیں نارنگ صاحب گیان چند جین کے ہم خیال تو نہیں ہو گئے ہیں، اب یہ شک اس کتاب کے مطالعہ سے کلی طور پر رفع ہو جائے گا۔ دوسرا فائدہ گوپی چند نارنگ صاحب کی تازہ کتاب کی اشاعت سے یہ ہوگا کہ اس سے گیان چند جین کی جملہ خام خیالیوں اور اردو اور مسلمانوں پر ان کی الزام تراشیوں کی تردید و تغلیط ہو جائے گی۔ ان امور کی روشنی میں یہ کہنا شاید غلط نہیں ہوگا کہ گوپی چند نارنگ کی کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' کی کلیتہً نفی کرتی ہے

اور حقیقتاً نارنگ صاحب کی یہ کتاب اس بات کا کھلا اعلان ہے کہ حقیقت وہ نہیں ہے جس کا اظہار جین صاحب نے اپنی کتاب میں کیا ہے بلکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اور حقیقت وہ ہے جس کا اظہار نارنگ صاحب نے کیا ہے۔ اس بات کے بھی امکانات ہیں کہ گوپی چند نارنگ کی یہ کتاب گیان چند جین اور اردو کے برافروختہ لوگوں کے درمیان صلح، ارتباط اور مصالحت (Conciliation) کا کام انجام دے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ایک اور نیک اور تعمیری کام ہوگا۔ گیان چند جین صاحب بہر حال اردو کے ایک بزرگ اور برتر محقق اور ادیب ہیں۔ شرط یہ ہے کہ انھیں اپنی غلطیوں کا احساس ہو جائے۔

گیان چند جین کی کتاب کا نام 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' ہے اگر اس نام کا تجزیہ کیا جائے تو گیان چند جین کی نیت، ان کی مراد اور ان کا مدعا (Intent) سمجھ میں آ جائے گا۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہندی اور اردو دونوں ایک ہی زبان ہیں اور جب دونوں ایک ہی زبان ہیں تو پھر دونوں کے لیے الگ الگ رسم الخط کا استعمال چہ معنی دارد؟ گیان چند جین صاحب لسانی اصولوں کے ماہر ہونے کے باوجود اس کی باریکیوں سے کتنے لاعلم ہیں ہم ان سے یہ توقع تو نہیں کرتے کہ وہ واقعی لاعلم ہیں بہت ممکن ہے وہ بر بنائے مصلحت لاعلم ہو گئے ہوں، بہر حال حقیقت جو بھی ہو کہنا ہمیں یہ ہے کہ ہندی اور اردو اب قطعاً ایک زبان نہیں ہیں۔ ایک والدین کے دو بیٹوں میں مماثلت اور یکسانیت تو کبھی کبھی نظر آ سکتی ہے لیکن کیا طبعاً اور مزاجاً بھی دونوں ایک جیسے ہو سکتے ہیں، جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ یہ بات علاحدہ ہے کہ دونوں کے وجود کا منبع و مخرج ایک ہے۔ گوپی چند نارنگ صاحب نے اپنی کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' کے ایک مضمون 'اردو رسم الخط — ایک تاریخی بحث' میں بڑے مدلل، مکمل اور سائنٹفک انداز میں یہ بتایا ہے کہ اگر چہ ہندی اور اردو کی بنیاد ایک ہے لیکن اپنے ارتقائی سفر میں ان دونوں زبانوں نے اپنے اندازِ سفر کو جداگانہ رکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ صدیوں کے سفر کے دوران ان دونوں زبانوں نے اپنی الگ الگ شناختوں (Identities) کو اتنی محکم بنیادوں پر قائم کر لیا ہے اب ان کو ایک سمجھنا صریح اور بے مہار غلطی ہوگی۔ دونوں زبانوں کی ایک بنیاد کے مفروضے اور اس مفروضے کے تحت اردو زبان اور اس کے رسم الخط کو ہندی میں ضم کرنے کی سازش کا بھانڈا پھوڑ کرتے ہوئے انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ:

> ''بنیاد کو ایک تسلیم کرنے سے یہ قطعاً لازم نہیں آتا کہ دونوں کا رسم الخط ایک ہو۔ اگر یہ بات ضروری ہوتی تو آج اڑیا، بنگالی اور آسامی زبانوں کا رسم الخط ایک ہی ہوتا۔ کیونکہ یہ تینوں ماگدھی پراکرت کی جانشین ہیں لیکن اس کے باوصف ان کا رسم خط ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس مثال کو سنسکرت تک

لے جائیے تو معلوم ہوگا کہ سنسکرت تمام ہند آریائی زبانوں کی بنیاد ہے یعنی بنگالی، اڑیا، آسامی، اودھی، مگھی، میتھلی، بھوج پوری، برج، کھڑی، ہریانی، گجراتی، راجستھانی، پنجابی وغیرہ سبھی زبانوں کا سلسلہ سنسکرت تک پہنچتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان سب کا رسم الخط ایک نہیں ہے۔ یہی ہندی اور اردو کا معاملہ ہے۔ دونوں آریائی ہیں لیکن اپنے ارتقائی سفر میں یہ دونوں زبانیں اتنی آگے بڑھ چکی ہیں کہ اب ان کے لیے ایک ہی رسم الخط کا تجویز کرنا دونوں کے حق میں مُضر ہوگا۔''

(مضمون 'اردو رسم الخط — ایک تاریخی بحث'، ص 109)

ہم نے جس مضمون سے مندرجہ حوالہ پیش کیا ہے اپنے اس مضمون کو گوپی چند نارنگ نے خواجہ احمد عباس کے ایک مضمون کے جواب میں 1961 میں لکھا تھا۔ خواجہ احمد عباس نے بقول نارنگ اردو والوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اردو رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کردیں۔

1982 میں روزنامہ 'قومی آواز' ممبئی کے ہفت روزہ کے لیے میں نے خواجہ احمد عباس سے ایک طویل و بسیط انٹرویو لیا تھا۔ اس انٹرویو کے دوران میں نے اردو رسم الخط کے سلسلے میں جب ان سے سوال کیا تو انھوں نے صاف صاف کہا کہ وہ اب اردو رسم الخط تبدیل کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ میں نے جب بہت پہلے دھرم یگ میں 1961 میں چھپے ان کے مضمون کا حوالہ دیا اور ان سے جاننا چاہا کہ اپنے اس مضمون میں انھوں نے اردو والوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اردو رسم الخط کو دیوناگری رسم الخط میں تبدیل کردیں تو میرے اس سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ ''ہاں پہلے میں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ اردو والے اردو رسم الخط کو ہندی رسم الخط میں تبدیل کردیں لیکن جب میں نے گوپی چند نارنگ کے مدلل سائنسی مضمون کو پڑھا تو مجھ پر اردو اور ہندی رسم الخطوں کی بنیادی حقیقت واضح ہوگئی، اب میں اردو والوں کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ وہ اپنے رسم الخط سے دست بردار ہوجائیں بلکہ اب ان کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنے موجودہ رسم الخط پر جمے رہیں۔'' قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اردو رسم الخط کے سلسلے میں گوپی چند نارنگ کے معقول دلائل نے عصمت چغتائی جیسی اردو رسم الخط کی بدترین دشمن کے نظریات و خیالات کو بھی تبدیل کیا۔ گوپی چند نارنگ کی یہ دلیل عصمت چغتائی کو بہت پسند آئی تھی کہ اردو رسم الخط کے ذریعے زیادہ سے زیادہ بات کو کم سے کم حروف اور جگہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی کی طرح ہزاروں لاکھوں افراد کو اردو رسم الخط کا حامی

اور طرفدار بنانے کا جو گرانقدر اور مستحسن کام گوپی چند نارنگ نے انجام دیا وہ ایسا کام ہے جس کی تعریف و ستائش کے لیے ہمارے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ کیا گوپی چند نارنگ کی ایسی سنہری حروف میں لکھی جانے کے قابل خدمات جلیلہ محض اس بنیاد پر طاقِ نسیاں ہوسکتی ہیں کہ 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' کے مصنف نے ناسمجھی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب کو ان کے نام معنون کر دیا۔ میں نے اپنے مضمون مطبوعہ روزنامہ انقلاب میں بربنائے خلوص و عقیدت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اس بات کا اعلان کر دیں کہ ان کا گیان چند جین کی بداندیشانہ، بے معنی اور مہمل کتاب سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ لیکن اب جبکہ ان کی کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' منظرِ عام پر آچکی ہے کسی طرح کی وضاحت اور تردید کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کی کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' آفتاب آمد دلیلِ آفتاب کے مصداق ہے۔

اردو ہندوستان کی زبان ہے اس کا وجود امیر خسرو اور قلی قطب شاہ کی ژاد و بوم سے وابستہ ہے۔ اس کی بزم میں ہندو اور مسلم دونوں برابر کے شریک ہیں، لیکن جب آسمانِ ہند پر آزادی کا سورج طلوع ہوا تو اسی آسمان پر اردو کا سورج غروب ہوتا نظر آیا۔ آزاد ہندوستان میں فرقہ پرست ذہنیت رکھنے والوں کی نظروں میں اردو کانٹے کی طرح چبھنے لگی۔ گزشتہ پچاس سالوں سے یا یوں کہیے کہ آزادی کے بعد لگاتار یہ جھوٹ پھیلایا جا رہا ہے کہ اردو ہندوستان کی نہیں بلکہ بدیسی زبان ہے، اب اس صریح جھوٹ کو اردو کے مشہور محقق گیان چند جین نے بھی دہرانا شروع کر دیا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں دلی تکلیف ہو رہی ہے کہ گیان چند جین فرقہ پرستوں کے ترجمان بن گئے ہیں۔ گوپی چند نارنگ صاحب نے یہاں بھی دشمنانِ اردو کی زبان پر قفل لگایا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جناب نارنگ نے اپنی توجیہات و دلائل کو کس پختہ عقیدے اور عزم کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی توجیہات و دلائل کی بنیادیں اتنی محکم اور مضبوط ہیں کہ ان پر ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا ہے۔ 'اردو زبان اور لسانیات' میں شامل اپنے مضمون 'اردو کی ہندستانی بنیاد' کے اختتام پر وہ اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''یہ واقعہ ہے کہ اردو ہندوستان کی انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں سے ہے۔ اگر ایک طرف اس کا دامن سامی اور ایرانی زبانوں سے بندھا ہوا ہے تو دوسری طرف اس کی بنیاد آریائی ہے۔ اس کا رسم الخط ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ کے بیسیوں ملکوں میں قدرے اختلاف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اردو کے تقریباً ساٹھ ہزار الفاظ میں سے دو تہائی الفاظ یعنی چالیس

ہزار الفاظ سنسکرت اور پراکرتوں کے ماخذ سے آئے ہیں۔ جس زبان کی جڑیں اپنے ملک کے لسانی ذخیرے اور اس کی تہذیبی سرزمین میں اتنی گہری ہوں، جس کا دامن اتنا وسیع ہو، جس کے لہجے میں ایک خاص کشش اور کھنک ہو، جس کے انداز میں ایک خاص شگفتگی اور شائستگی ہو، جس کی قومی خدمات ایسی وقیع ہوں اور جس کا ادبی سرمایہ بشمول میر، نظیر، غالب، انیس، اقبال، فراق، فیض اتنا شاندار ہو، وہ زبان کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اس زبان پر ہندوستان کا ایسا حق ہے جو کبھی ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ اور اردو کا بھی ہندوستان پر ایسا حق ہے جو ضرور وصول ہونا چاہیے۔'' (مضمون 'اردو کی ہندستانی بنیاد' ص 55)

ہم نے یہ عرض کیا ہے کہ جناب گوپی چند نارنگ کی اردو نوازی اور اردو زبان کی ان کی ادبی، لسانی اور تنقیدی خدمات کا زمانہ پچاس سال سے زیادہ وسیع و عریض عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس عرصے میں جب جب اردو زبان اور اس کی تہذیبی و ثقافتی قدروں پر دشمنانِ اردو کی طرف سے حملے ہوئے ہیں۔ نارنگ صاحب اپنے قلم و قرطاس کے ساتھ میدان میں اتر آئے ہیں اور اپنی تحریروں اور تقریروں سے اردو کے بدخواہوں اور کور باطنوں کو دندان شکن جواب دیا ہے۔ انجمن ترقی اردو کی کل ہند اردو کانفرنس منعقدہ مارچ 1979 انھوں نے بہ بانگِ دہل کہا تھا:

''ہم پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ اردو ایک غیر ملکی زبان ہے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ اردو پر غیر ملکی زبان کا الزام لگانے والے اُسی سانس میں یہ بات بھی کہتے ہیں کہ اردو دراصل ہندی ہی کی شیلی ہے۔ منطقی طور پر اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندی بھی غیر ملکی زبان ہے؟ ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو والے اپنا رسم الخط بدل دیں کیونکہ یہ غیر ملکی ہے۔ اس سلسلے میں عرض کروں گا کہ اردو کی تیس بتیس آوازوں میں سے چودہ آوازیں ایسی ہیں جو نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں مثلاً ٹ، ڈ، ڑ یا بھ، پھ، تھ، دھ، جھ، چھ، کھ، گھ ٹھ، ڈھ اور ڑھ۔ یہ آوازیں سو فیصد ہندستانی ہیں۔ ان آوازوں کے اظہار کے لیے ہم نے اپنے رسم خط کو 'ہندوستانیا' ہے (میں یہاں ہندیایا نہیں کہوں گا) اب یہ رسم خط عربی اور فارسی رسم خط سے بنیادی طور پر مختلف ہے اور اسے ہمیں اردو رسم خط کہنا چاہیے۔'' (اردو زبان اور لسانیات، ص 271)

اردو زبان، اردو لسانیات اور اس کے رسم الخط کی مدافعت میں گزشتہ پچاس برسوں میں

اردو کے دوسرے ماہرین لسانیات اور مورخین نے بھی دفتر کے دفتر تیار کیے ہیں لیکن حقائق و تجزیہ کی روشنی میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ زبان اردو اور اس کے رسم الخط کے پروان چڑھنے کے علت و معلول کی نشاندہی جس شرح و بسط کے ساتھ جناب گوپی چند نارنگ نے کی ہے اس کی مثال دوسروں کے یہاں مفقود ہے۔ بیسویں صدی ان کے کلکِ قلم کی گہر افشانیوں سے پر افشاں تو ہے ہی قدرت نے اکیسویں صدی میں بھی ان کے قدم کو داخل کر کے اس کی قدر و قیمت میں چار چاند لگا دیا ہے۔ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے خلاف محاذ آرائیاں ابھی متوقع ہیں ایسے میں گوپی چند نارنگ صاحب کے ذہن و فکر اور ان کے قلم پرتمکین کی ضرورت بہر حال باقی رہے گی۔ کیونکہ ان کے جیسے نکتہ داں اور دقیقہ رس اہلِ قلم کا قحط ہے۔

گیان چند جین صاحب نے اردو والوں پر بلکہ یہ کہیے کہ مسلمانوں پر یہ بے بنیاد الزام بھی عائد کیا ہے کہ وہ ہندی زبان سے نفرت کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے بڑا جھوٹ کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ ہندوستان گیر سطح پر مسلمان گھرانوں کا مجمل جائزہ لیا جائے تو شاید ہی کوئی ایسا گھر ملے گا جہاں ہندی کا اثر و رسوخ نہ ہو۔ گیان چند جین صاحب کی دور اندیشی نے ان کا اتنا بھی ساتھ نہیں دیا کہ وہ اتر پردیش کی لسانی صورتِ حال پر ایک نگاہ ڈالتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کی سمجھ میں یہ بات آجاتی کہ وہاں مسلمانوں کی چار نسلیں اردو سے نابلد ہوگئیں۔ اتر پردیش کے مسلمانوں نے ہندی کو سینے سے لگایا اور اردو کو بڑی بے رحمی سے تج دیا۔ گوپی چند نارنگ صاحب نے دشمنانِ اردو کی اس خام خیالی کو برسوں پہلے بھانپ لیا تھا۔ شاید اسی بنیاد پر انھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ:

> ''یہ حقیقت ہے کہ اردو والوں نے ہندی کو تسلیم کرلیا ہے وہ ہندی کو اپنی قومی زبان تسلیم کرتے ہیں اور ہندی پڑھنا لکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔''
>
> (اردو زبان اور لسانیات، مضمون 'بہار کا تاریخی اقدام')

گزشتہ پچپن چھپن برسوں میں ہندوستان میں اردو زبان کا مسئلہ جتنا سنگینی اور الجھاؤ کا شکار ہوا ہے اتنا الجھاؤ اور سنگینی کا شکار یہاں کی کوئی اور زبان نہیں ہوئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اردو کے مسئلے کی سنگینی کی جتنی ذمہ دار یہاں کی مختلف حکومتیں رہی ہیں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ اردو کی بدحالی کے ذمہ دار خود اردو والے بھی ہیں۔ اردو والوں پر اردو کی ترویج و اشاعت کے جو فرائض منصبی تھے انھیں انھوں نے اپنے اوپر سے ہٹا کر سرکار پر ڈال دیے اور یہ سوچ کر خاموش بیٹھ رہے کہ اردو کی تشکیل و ترقی کی ساری ذمہ داری حکومت پر ہے لہٰذا سرکار ہی یہ کام انجام دے گی۔ گوپی چند نارنگ نے اس مسئلے کو بھی تشنۂ فکر نہیں چھوڑا۔ انھوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ:

''کسی جمہوریت میں کوئی ناانصافی ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتی اس کا حل ایک نہ ایک دن نکلنا ہی ہے لیکن اگر ہم ہمت ہار دیں یا اگر اردو سے ہماری محبت اور وابستگی میں فرق آنے لگے تو اس سے دہرا نقصان ہوگا اور اردو کے زوال کے ذمّے دار ہم بھی ہوں گے۔ اردو کی بقا کے مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قطع نظر اس کے کہ حکومت اردو کے لیے کیا کرتی ہے اور کیا نہیں کرتی، ہم خود اردو کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں ضرور کریں۔ اس کے لیے کسی آسمانی حکم کا انتظار نہ کرتے رہیں۔ اس بات کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی بھی زبان صرف حکومت کی مدد سے زندہ نہیں رہتی۔ حکومت کی مدد کی اہمیت ہے اور ضرور ہے لیکن زیادہ اہمیت زبان بولنے والوں کے ولولے، ان کی لگن اور اپنی زبان سے ان کی محبت کی ہے۔ اگر حکومت متوجہ نہیں ہوتی تو کچھ نہ کچھ نقصان تو ہوتا ہی ہے، لیکن اگر ہم ہی اپنی زبان کو بھولنے لگیں تو سمجھئے کہ نقصان پورا ہوا۔'' (اردو زبان اور لسانیات، ص 274)

اردو زبان سے یہ محبت اور اس کی خدمت کا یہ جذبہ گوپی چند نارنگ کو عظمت اور بلندی کے کس مقام پر کھڑا کرتا ہے اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں ہے۔ اردو کے تعلق سے ان کے خلوص کو دیکھنے کے لیے ہمیں خود خلوص کی نگاہ رکھنی ہوگی۔ ان کے ذہن وفکر کی طہارت اور پاکیزگی پر اگر ہم ایمان نہیں رکھتے تو اس سے بڑی بے ایمانی کوئی دوسری ہو ہی نہیں سکتی۔ گوپی چند نارنگ کی شخصیت کی رنگارنگی اور ان کے فکر و خیال کی تہداریوں کو سمجھنے کے لیے ان کی تازہ ترین کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' کا سنجیدہ مطالعہ موجودہ حالات میں انتہائی ضروری ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین اردو کے کسی نہ کسی اہم ادبی ولسانی مسئلے پر ایسی روشنی ڈالتے ہیں کہ جس سے ہماری نگاہیں خیرہ ہو اٹھتی ہیں۔ اس کے مضامین اگرچہ نئے نہیں ہیں لیکن کتابی شکل میں ان کی اشاعت بالکل تازہ بہ تازہ ہے۔ لہٰذا اس کی ہر بات کو اس کے ہر نکتے کو ہم آج کے مسائل کی روشنی میں اور آج کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ اس کتاب کے ہر مضمون کو شگفتگی اور انشاپردازی کا جو آئینہ دکھایا گیا ہے اس کی دلکشی بے پایاں ہے۔ پوری کتاب پڑھ جایئے کسی مقام پر بے قاعدگی یا تحریف لفظی کا کوئی ہلکا سا گمان بھی نہیں گزرتا۔ ہنرمندی اور دانش وتدبّر کے شوکت وجزالت کی ایسی انوکھی مثال بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

گوپی چند نارنگ صاحب کے مضامین اور ان کی کتابیں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی میں بھی ہیں۔ انگریزی اور ہندی میں ان کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سے غیر اردو داں

طبقوں میں اردو تحریک کو تحکیم و تائید بھی حاصل ہوتی اور اردو زبان کو مقبولیت کا تحفۂ جانفزا بھی ملا۔ "Urdu — Readings in Literary Urdu Prose" اس سلسلے میں ایک کامیاب ترین کتاب کہی جاسکتی ہے۔ اسی طرح "Let's Learn Urdu" شائقین اردو کے لیے چراغ راہ کا کام کرتی ہے۔ ان کی ہندی میں چھپی کتاب ''उर्दू पर खुलता दरीचा'' ہندی سماج میں اردو کی نشر و اشاعت (Dissemination) کی مشکلیں آسان کرتی ہے۔ یہ ایسی پختہ بنیادیں ہیں جن کے پیش نظر ہم نے جناب گوپی چند نارنگ کو اردو کا سفیر قرار دیا ہے۔

تقریباً دو سال قبل گوپی چند نارنگ کے منتخب تنقیدی مضامین کا خوبصورت اور معنی خیز مجموعہ ایڈشاٹ پبلی کیشنز، ممبئی کی جانب سے شائع ہوا۔ مضامین کے اس مجموعے کا نام 'ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت' ہے۔ اس میں زیادہ تر مضامین اردو کے نامور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کے بارے میں ہیں۔ نارنگ صاحب کا عقیدہ ہے کہ ''ادب سود و زیاں کا کھیل نہیں ہے'' اور اپنے اسی عقیدے کے تحت انھوں نے ہمیشہ لکھا ہے۔ نارنگ صاحب کے بارے میں یہ بات بلاتکلف کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے زندگی کے کسی دور میں بھی تعصب، تنگ نظری اور جانب داری سے کام نہیں لیا ہے اور ایک سچے نقاد کا یہ کام بھی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے میر و انیس و اقبال اور منشی پریم چند سے لے کر فیض، بیدی، منٹو، جمیل الدین عالی، محمد علوی، انتظار حسین، افتخار عارف، شہریار اور بانی وغیرہ کے فن پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور استدراک و استدلال کی کسوٹی پر کھرے اور کھوٹے کا فرق واضح کیا ہے۔ ان کی دقت نظری اور تجزیاتی بحث انھیں فن اور فنکار کے مطالعے کے دوران مثبت نتائج تک پہنچانے میں پوری مدد کرتی ہے۔ اس طرح حق بحق دار رسید کے بہ مصداق انھوں نے ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کو انصاف کے ترازو پر تولا ہے اور سچ اور جھوٹ کو سامنے رکھ دیا ہے، اس اعتبار سے تنقیدات نارنگ بے حد قیمتی ہیں۔

گوپی چند نارنگ صاحب نے مابعد جدیدیت کی تحریک کی قیادت بھی کی ہے، اس تحریک کے روح رواں کی حیثیت سے اس کی نشو و نما کے راستے ہموار کرنے میں ان کی فکری کوششوں کو یاد رکھا جائے گا۔ مابعد جدیدیت سے متعلق کئی بیش قیمت مضامین 'ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت' میں شامل ہیں۔ ان کی یہ کتاب وسیع تر مفہوم اور معنی خیز تنقید کی خوبصورت مثال کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گی۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت کے ساتھ ہی شہزاد انجم کی ترتیب دی ہوئی کتاب 'دیدہ ور نقاد' شائع ہوئی۔ یہ بہت ضخیم کتاب ہے۔ اس میں ہندوستان اور پاکستان کے نامور اور معتبر ادیبوں کے تین درجن سے زائد ایسے مضامین شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً جناب گوپی چند

نارنگ کے بارے میں سپردِ قلم کیے گئے ہیں۔ ان مضامین کے بارے میں اولاً تو یہ کہہ دوں کہ انھیں طوعاً وکرہاً یا پھر پاسِ خاطر اور پاسِ ادب کی غرض سے نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ انھیں ذمہ دارانِ ادب نے پوری ذمہ داری، دلچسپی، پیش بینی اور پیش بندی کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے۔ کئی سو صفحات پر پھیلی ہوئی ان تحریروں کے مطالعہ سے گوپی چند نارنگ کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے وہ بقائے دوام، ثبات اور استمرار کی حامل ہے۔ لیکن یہ تصویر گوشت پوست کے انسان کی تصویر نہیں بلکہ خوبصورت اور حیات بخش افکار وخیالات کے تانے بانے سے تزئین پذیر ہونے والی تصویر ہے۔ اس تصویر کی روشن پیشانی سے جو کرنیں پھوٹتی ہیں ان سے ادب وتنقید کا منظر نامہ ضیا بار ہوتا ہے۔

'دیدہ ور نقاد' میں گوپی چند نارنگ کے چند نمائندہ مضامین بھی شامل ہیں۔ ان مضامین کی شمولیت نے کتاب کی افادیت واہمیت کو صد چند (Centuple) کر دیا ہے۔ ان مضامین میں گوپی چند نارنگ کا تنقیدی رویہ بھلے ہی اسلوبیاتی رنگ وآہنگ کا کیوں نہ ہو لیکن ان میں شعری وافسانوی تناظر کی افہام وتفہیم کا کس بل فوقیت پاتا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اس ہنر کو منظرِ عام پر لانے کے لیے سر کے بل چلنا پڑتا ہے۔ یہاں یہ کہنے کی بھی ضرورت ہے کہ رسائل کے خصوصی نمبروں اور گوشوں کی شکل میں یا پھر مستقل کتابوں کی صورت میں اب تک گوپی چند نارنگ کے بارے میں سات آٹھ کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ناکافی اور نامکمل ہے۔ گوپی چند نارنگ کی شخصیت کثیرالجہات نوعیت کی ہے ایسی ہمہ گیر شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ہمارے ذمہ دار اہلِ قلم اس کسر کو حتی المقدور پورا کریں گے۔

عین اختتام پر اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے جناب گوپی چند نارنگ کے بارے میں یہ کہوں گا کہ اردو ادب میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ اردو زبان کا لسانی وتنقیدی مطالعہ تو ان کی تحریروں سے استفادہ کے بغیر ادھورا رہے گا ہی، اردو کے فروغ کی کوئی بھی تحریک ان کی کوششوں کو بروئے کار لائے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک جگمگاتی شخصیت کے مالک ہیں ان کی ایسی شخصیت سے اکتسابِ فیض کرنا وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ وہ ایک جہاں دیدہ، جہاں بیں، مردم شناس اور لائق وفائق انسان ہیں۔ ایسے انسان خدا کی زمین پر لائقِ تعظیم اور واجب الاحترام ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے احترام اور ان کی تعظیم کا حق ہمیں بہرحال ادا کرنا چاہیے۔ نارنگ صاحب بے تعصب (Unprejudiced) اور بے ضرر (Unoffending) قسم کے انسان ہیں۔ ایسے انسان کو قیادت اور رہنمائی کا پورا حق ہے۔ اگر اپنی پیاری زبان اور اپنی اس زبان کے رسم الخط کو ہم زندہ و

باقی صفحہ ۱۲۸ پر.....

ڈاکٹر مشتاق صدف

'اردو زبان اور لسانیات'
گوپی چند نارنگ کا موقف

پروفیسر گوپی چند نارنگ گزشتہ پچاس برسوں سے تنقیدی و تحقیقی اور لسانیاتی مضامین لکھتے رہے ہیں۔ چھٹی دہائی میں ان کی تین کتابیں 'اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو'، 'اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی' اور "ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں' شائع ہوئیں جبکہ وسکانسن میں قیام کے زمانے میں Readings in Literary Urdu Prose پر کام کیا۔ پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دور میں 'املانامہ'، 'پرانوں کی کہانیاں' اور راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور بلونت سنگھ پر انتھالوجی تیار کیں نیز یک موضوعی بین الاقوامی سیمیناروں پر خصوصی توجہ دی۔ اسی عرصے میں ان کی قابل قدر کتابیں 'اردو افسانہ: روایت اور مسائل'، 'انیس شناسی'، 'اقبال کا فن' اور 'لغت نویسی کے مسائل' منظر عام پر آئیں۔ آٹھویں دہائی میں 'امیر خسرو کا ہندوی کلام'، 'سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ' اور 'اسلوبیات میر' کا ڈنکا بجا۔ بعد ازیں 'ادبی تنقید اور اسلوبیات' اور 'قاری اساس تنقید' نے اردو تنقید کو ایک نئی جہت بخشی۔ نویں دہائی میں 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' اور 'اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ' نے ایک بار پھر اردو ادب کو نئی کشادگی عطا کی۔ اسی طرح ان کی انگریزی کتاب Urdu Language & Literature : Critical Perspectives جو اسٹرلنگ سے چھپی، نے نئی سوچ کو فروزاں کیا۔ یہی نہیں بلکہ بیسویں صدی کے جاتے جاتے Let's Learn Urdu کے نام سے انگریزی اور ہندی میں ان کی چار کتابوں کے سیٹ کی اشاعت اہل زبان و ادب کے لیے محیر العقول ثابت ہوئی اور 'اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب'، 'ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری' اور جدیدیت کے بعد' نے تو شائقین ادب کی تشنگی بجھادی۔

اب گوپی چند نارنگ کی تازہ تصنیف 'اردو زبان اور لسانیات' رضا لائبریری رامپور کے زیر اہتمام اشاعت پذیر ہوئی ہے جو لسانیاتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ درحقیقت یہ پروفیسر نارنگ کے اردو

زبان اور لسانیات کے زندگی بھر کے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ لسانیاتی مضامین کے اس گنج گراں مایہ میں علمی، تاریخی، تجزیاتی اور نظریاتی تحریریں اور لسانی سرمایہ ہے جس سے اردو زبان کی گہرائیوں پر ان کی نظر کا اندازہ ہوتا ہے اور جدید لسانیاتی مباحث کا دریچہ کھلتا ہے۔ حقیقتاً ان مضامین سے بین الاقوامی شہرت یافتہ نقاد و دانشور گوپی چند نارنگ کے لسانیاتی زاویے اور تخلیقی و تنقیدی فکر و بصیرت سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ نیز ہندوستان میں اردو کو درپیش مسائل سے نبرد آزما ہونے اور گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے کی سمت میں لسانیات جدید کے بنیادگزار کی حیثیت سے گوپی چند نارنگ کا واضح موقف سامنے آتا ہے۔ کتاب میں شامل تمام مضامین کے عمیق مطالعہ سے نارنگ صاحب کی اردو زبان سے دیوانگی کی حد تک وابستگی اور اردو کے جدید لسانیاتی مسائل و مباحث سے گہری دلچسپی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اردو زبان سے ان کی والہانہ محبت کا ببانگ دہل اظہار اور وہ بھی اس وقت جب گیان چند جین کی متنازعہ کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ' دو ادب' بحث میں ہے اور بعض فرقہ پرست اور مایوس عناصر اس تصنیف کے انتساب کے حوالے سے گوپی چند نارنگ کے نام کو گھسیٹنے کے سعیٔ ناکام کرر ہے ہیں۔ زیرنظر ادبی صحیفہ میں زبان اور لسانیات میں گزشتہ چالیس برسوں کے دوران لکھے گئے مضامین بھی ہیں اور ایک جامع اور مبسوط دیباچہ بھی ہے جو اپنی معنی خیزی کو اجاگر کرتا ہے اور بدنہاد لوگوں کو آئینہ دکھاتا ہے۔ یوں تو یہ دیباچہ صرف چار صفحات پر مشتمل ہے لیکن گویا کوزہ میں دریا بند کر دیا ہے۔ اس دیباچہ سے ان تمام سوالوں کا جواب مل جاتا ہے جو اردو زبان سے اب تک کیے جاتے رہے ہیں۔ جو لوگ خود کو اردو زبان و ادب کا اجارہ دار سمجھتے ہیں اور دوسروں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں، ان کے منہ پر مصنف کا یہ اقتباس ہی ایک طمانچہ ہے۔ بلکہ ان کے لیے بھی کارگر جواب ہے جو اردو کو غیر سیکولر اور فرقہ وارانہ زبان سے تعبیر کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ''اردو ہماری صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے، یہ ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا وہ ہاتھ ہے جس نے ہمیں گڑھا، بنایا اور سنوارا ہے، یہ ہماری ثقافتی شناخت ہے جس کے بغیر نہ صرف ہم گونگے بہرے ہیں بلکہ بے ادب بھی۔ میں نے بارہا کہا ہے کہ اردو کو محض ایک زبان کہنا اردو کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے، یہ ایک طرز حیات، ایک اسلوب زیست، ایک اندازِ نظریا جینے کا ایک سلیقہ وطریقہ بھی ہے، اس لیے کہ اردو صدیوں کے تاریخی ربط و ارتباط سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایسا روشن استعارہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برصغیر کی زبانوں میں نہیں۔'' ('اردو زبان اور لسانیات' ص 11)

جین صاحب نے اپنی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' کا انتساب امرت رائے اور گوپی چند نارنگ کے نام کیا ہے۔ یہی بنیاد ہے نارنگ صاحب کو گھیرنے کی۔ لیکن گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب میں پہلے کی طرح ایک بار پھر کسی کا نام لیے بغیر تمام فرقہ پرست سوچ رکھنے والوں کو للکارا ہے اور ان کی کجرویوں کو برہنہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اردو کبھی دلوں کو توڑنے والی زبان نہیں رہی۔ وہ رقم طراز ہیں:

''اردو کا ایک نام سیکولرازم یعنی غیر فرقہ واریت' اور بقائے باہم' بھی ہے۔ اردو نے صدیوں سے اس کی معنی خیز مثال قائم کی ہے اور ہر طرح کی تنگ نظری اور دقیانوسیت کے خلاف محاذ باندھا ہے۔ لمحہ فکر یہ ہے کہ کیا کسی ایسے انسانیت پرور تصور کے بغیر ہمارے آزاد جمہوری معاشرے نہ صرف نہ کہ اپنے ترقی پذیر ہونے کا جواز فراہم کر سکتے ہیں بلکہ کیا کسی کشادہ اور روادار تہذیبی تصور کے بغیر وہ زندہ بھی رہ سکتے ہیں؟''

('اردو زبان اور لسانیات'، ص 11)

گوپی چند نارنگ نے گیان چند جین جیسوں کی باتوں کو بھی بہت ہی مہذب انداز میں رد کیا۔ ذرا یہ حصہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

''میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ میرا سفرِ اردو سفرِ عشق ہے۔ عشق اثبات خودی کی نہیں تسلیم خودی کی راہ ہے جس میں 'لین' کچھ نہیں 'دین ہی دین' ہے اور میں نے تو دیا کچھ بھی نہیں، میری بساط ہی کیا، اور لے لیا کتنا کچھ۔ یہ کسر نفسی نہیں کہ میری پہچان جو بھی اور جیسی بھی ہے اردو کی بدولت ہے۔ یہ اردو کی فیاضی نہیں تو کیا کہ میں تو کچھ بھی نہ دے سکا اور اس نے مجھے اتنا کچھ دیا کہ کسی کو بھی کسی نے کیا دیا ہوگا!''

('اردو زبان اور لسانیات'، ص 12-11)

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے تبصراتی مضمون 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' میں یہ اعتراف کیا ہے کہ:

''دنیا جانتی ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کو اردو کی ساری دنیا سے جتنے اعزاز، اکرام، ایوارڈ اور انعام ملے ہیں اتنے اردو کے کسی ادیب کو نہیں ملے اور نہ شاید آئندہ مل سکیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے ممدوح گوپی چند نارنگ کو

اردو کی دنیا میں اپنے بزرگوں اور معاصروں کے ساتھ کسی دوڑ میں مبتلا بیان کرنا پسند فرماتے ہیں...... دراصل صورتِ حال تو یہ ہے کہ اردو والے گوپی چند نارنگ کو اپنا 'ہمسر' تو کیا اپنے سے برتر مانتے ہیں۔"

(اردو ادب، شمارہ اپریل، مئی، جون 2006، ص 36)

دراصل گوپی چند نارنگ نے اپنے سفرِ اردو کو سفرِ عشق بتا کر، اپنی پہچان کو اردو کی بدولت قرار دے کر اور اردو کی فیاضی کا ذکر کر کے اردو کے تعلق سے اناپ شناپ لکھنے والوں کی خبر بھی لی ہے۔

جہاں تک 'انتساب' کی بات ہے تو اس حوالے سے گوپی چند نارنگ کے خلاف سازش کرنے کی کوشش حد درجہ غیر ذمہ دارانہ اور فرقہ وارانہ ہے۔ جو شخص اردو سے اپنی وابستگی کو دیوانگی کی حد قرار دیتا ہے۔ اپنے 'سفرِ اردو کو سفرِ عشق' بتاتا ہے، اردو کو زبانوں کا 'تاج محل' کہتا ہے۔ اردو کے امتیاز کے لیے اردو رسم الخط پر اصرار کرنے کو نہ صرف فطری بلکہ ضروری سمجھتا ہے بلکہ رسم الخط بدلنے کو زبان کے قتل کے مترادف قرار دیتا ہے اور وہ بھی تحریری شکل میں تو پھر ایسے شخص پر اردو کے تعلق سے بے جا بہتان تراشی کیا گیان چند جیسی شخصیتوں کی فکر کو جلا بخشنا اور ان کے اعتراضات کو سچ ثابت کرنا نہیں ہے؟ گوپی چند نارنگ اردو کو اپنی مادری زبان نہ ہوتے ہوئے بھی مادری زبان کا درجہ دیتے ہیں اور اس کی جادوئی کشش کے ساتھ اس کے جنوبی ایشیا کی 'لنگوا فرینکا' زبان ہونے کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ کیا ان سب کے باوجود انھیں ایک 'مخصوص عینک' سے دیکھنا کیا ہماری تنگ نظری اور عصبیت پر دال نہیں؟ دراصل یہی سوال سوچنے کا ہے۔ ان کا یہ اقتباس ان کی گہری وابستگی اور صدق دلی کا بین ثبوت ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

"اردو میری مادری زبان نہیں، میری ددھیال اور ننھیال میں سرائیکی بولی جاتی تھی، میری ماں دہلی ہجرت کے بعد بھی سرائیکی بولتی تھیں جو نہایت میٹھی، نرم اور رسیلی زبان ہے۔ لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میری مادری زبان سے دور ہے۔ اردو نے شروع ہی سے دوئی کا نقش میرے لاشعور سے مٹا دیا۔ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میرے خون میں جاری و ساری نہیں۔ یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اترتی چلی گئی، یقیناً کچھ تو جادو ہوگا۔ تاج محل کا کرشمہ مثالی ہے۔ میں اردو کو 'زبانوں کا تاج محل' کہتا ہوں اور اکثر اس لذت کو اپنے خون کی روانی میں سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے خبر و بے خبری میں محسوس کرتا ہوں۔ زبان میرے لیے رازوں بھرا بستہ

ہے۔ کیسے ہند آریائی کے بستے میں عربی فارسی ترکی کے رنگ گھلتے چلے گئے اور کیسے ایک رنگارنگ دھنک بنتی چلی گئی کہ جنوبی ایشیا کے اکثر ممالک کے طول و عرض میں وہ آج 'لنگوا فرینکا' بھی ہے اور ایک ایسا ادبی اظہار بھی جس کے رس اور بالیدگی کو دوسری زبانیں رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔

('اردو زبان اور لسانیات'، ص 12)

ہمارے عہد کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم جو کچھ نہیں دیکھتے اس پر بعض خود غرض لوگوں کے بھڑکانے پر یقین کر لیتے ہیں، اور خود اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھتے ہیں اس پر بھروسہ نہیں کرتے۔ گوپی چند نارنگ کے تعلق سے یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ ان کے کچھ 'کرم فرما' ایسے ہیں جو بر بنائے حسد و بغض و عناد ان کے خلاف ناکام سازشیں کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ نارنگ صاحب کی تحریروں کو پڑھنے کی بجائے اپنی کجروی کی بنا پر غلط فہمیوں کو ہوا دیتے ہیں اور جو کچھ نہیں ہے اسے گھڑنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ یعنی جو شخص نصف صدی سے اردو زبان و ادب کا دفاع کرتا آیا ہے اور جس کا ظاہر و باطن دونوں یکساں ہے اسے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ نہ صرف بد دیانتی ہے، گروہ بندی ہے، بلکہ خبث باطن بھی ہے جس کی مذمت کرنا چاہیے۔ یہاں یہ عرض بھی کر دوں کہ گوپی چند نارنگ پر انگشت نمائی کرنے والوں کی تعداد ان کے چاہنے والوں کے مقابلے میں چاند پر داغ کی مانند ہے۔ اس قسم کی سازشوں سے بھی وہ کبھی بددل نہیں ہوئے کیونکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ آسمان پر تھوکنے والے خود ہی ذلت اٹھاتے ہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا تھا: میں اس معاملے میں سر سید احمد خاں کا قائل ہوں جن کا قول ہے کہ خدا کا شکر ہے اس نے محسود بنایا ہے کسی کا حاسد نہیں۔

اکثر اخبارات و جرائد اپنے قارئین کی آراء اور خطوط شائع کرنے سے پہلے یہ فقرہ لکھ دیتے ہیں کہ "مراسلہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں"۔ مطلب یہ کہ قارئین کی رائے سے ایڈیٹر یا جملہ ذمہ داران کا کوئی سروکار نہیں۔ پھر بھی ہم یہ سمجھیں کہ قارئین کی جو رائے شائع کی جاتی ہے اس سے ادارہ جڑا ہوا ہے تو یہ ہماری ناعقلی ہوئی۔ یہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس میں شائع کسی مضمون نگار کی ہر بات سے ادارہ متفق ہو یا چند ایک سے۔ گیان چند نارنگ کی کتاب صفحہ ۱۷ پر 'اظہار تشکر' کے عنوان سے مصنف نے واضح انداز میں یہ تحریر کیا ہے کہ "کتاب میں جو کچھ ہے اس کی پوری ذمہ داری خود اسی پر عائد ہوتی ہے۔" اس کا متن آپ بھی ملاحظہ فرمائیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مصنف نے کیا لکھا ہے اور کن کن شخصیتوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اس کے باوجود صرف ایک شخص کو ہی کیوں ہدف بنایا جا رہا ہے:

''اظہار تشکر

مندرجہ ذیل اصحاب کا شکر گزار ہوں:

1 پروفیسر گوپی چند نارنگ، دہلی
2 جناب مشفق خواجہ، کراچی
3 ڈاکٹر جمیل جالبی، کراچی
4 جناب شمس الرحمن فاروقی، الہ آباد
5 ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری، ڈائرکٹر، خدابخش لائبریری، پٹنہ
6 ڈاکٹر محمد انور الدین، پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی، حیدر آباد

مندرجہ بالا حضرات نے مطلوبہ متعدد کتابیں اور رسالے فراہم کیے۔ اگر انکا کرم شامل حال نہ ہوتا تو میں امریکہ میں بیٹھ کر یہ کتاب نہ لکھ سکتا۔ لیکن یہ واضح کردوں کہ کتاب میں جو کچھ ہے اس کی پوری ذمہ داری مجھ پر اور صرف مجھ پر عاید ہوتی ہے۔ میری آرا کے لیے یہ لوگ نہیں میں خود پوری طرح ذمہ دار ہوں۔''

گیان چند جین نے نصف درجن افراد کا اظہار تشکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں محمد حسن اور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے ان کی کتاب پر مقدمہ لکھا ہے جس سے گیان چند جین کے لسانی Thesis کی توثیق ہوتی ہے۔ لیکن حیرت اور استعجاب ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ اتنے لوگوں میں صرف گوپی چند نارنگ کے نام کو ہی اچھالا گیا۔ کیا اس لیے کہ وہ ہندو ہیں؟ اب تک جتنے بھی مضامین اس حوالے سے آئے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی مندرجہ بالا ناموں میں سے کسی دوسرے نام کا کوئی تذکرہ نہیں آیا۔ آخر کیوں؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ اردو میں رواج ہے کہ انتساب کرنے سے پہلے کسی کی اجازت نہیں لی جاتی۔ اگر منسوب سے ہم مواد کو بھی منسوب کرنے لگے تو ایک نئی بحث چھڑ جائے گی۔ اسی لیے اس فرقہ وارانہ حرکت کی شدید مذمت کی ضرورت ہے۔ کیا اس لیے کہ محقق کا لفظ کچھ جید لوگوں کے حلق کا کانٹا بن گیا ہے؟

گوپی چند نارنگ نے اپنی تازہ کتاب میں سیاسی ہنگامہ پروری کے اس عہد میں پھیلنے والی غلط فہمیوں اور اردو رسم الخط کے ساتھ اردو۔ ہندی کے معنی خیز رشتے کا ذکر کر کے تعصب پسند افراد کے سینے کو اور بھی چھلنی کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو کا خصوصی امتیازی نشان اس کے عربی فارسی تاثرات ہیں۔ سیاسی ہنگامہ

پروری کے عہد میں غلط فہمیوں کا پھیلنا ایک عام سی بات ہے۔ یوں بھی جذباتی کاروبار، علم سے کم ہی نسبت رکھتا ہے، اس لیے اس عرفان کو عام کرنا ازبس ضروری ہے کہ اردو کی جڑیں اسی سرزمین میں ہیں اور اس کی کشش و دل آویزی اور مٹھاس اور رس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ اس میں کئی زبانوں اور کئی ثقافتوں کا پیوند لگا ہے۔ اردو کا چلن ہندوستان اور پاکستان یعنی پورے برصغیر میں ہے۔ اردو اور ہندی کی بنیاد ایک ہے یعنی کھڑی بولی لیکن اب یہ دونوں زبانیں الگ الگ آزاد اور مستقل زبانیں ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی طاقت ہیں اور ایک کے بغیر دوسری مکمل نہیں۔ اردو ہندوستان اور پاکستان کی متعدد بولیوں اور زبانوں کے درمیان ایک سماجی لسانی اور تہذیبی پل اسی لیے بناتی ہے کہ برصغیر کی بیس پچیس زبانوں میں سے کوئی دو زبانیں ایک دوسرے سے اتنی قریب نہیں جتنی کہ اردو اور ہندی۔ ہندوستان میں اردو کی بقا کے لیے اس رشتہ پر زور دینا بیحد ضروری ہے۔''

('اردو زبان اور لسانیات'، ص 13)

مذکورہ تمام حقائق سے پردہ پوشی کرتے ہوئے وہ حضرات جو پہلے گونگے اور بہرے دونوں تھے، ان کی تربیت نارنگ صاحب نے کی اور انھیں قوت گویائی اور قوت سماعت عطا کی اور ممکنہ حد تک ان کی مدد بھی کی لیکن اگر وہ ان کے خلاف لب کشائی کی کوشش کرتے ہیں یعنی وہ افراد جن کی پوری تنقیدی بساط نارنگ صاحب کی مرہون منت ہے، تو تعجب ہوتا ہے۔ حقانی القاسمی نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

''نئی نسل نارنگ کے تنقیدی فرہنگ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ پائی۔ وہی نارنگ کی ساختیات، پس ساختیات، تصور اسمیت و فعلیت، وہی نحوی واحدے، طویل مصوتے، وہی حرفی نحوی امتیازات، نارنگ کے جملے، ان کی اصطلاحات، لفظیات نئی نسل اپنے مضامین میں کچھ اس طرح استعمال کرتی ہے کہ لوگ نارنگ کی گہرائی و گیرائی کو نئے نقادوں کے ذہن کی گہرائی و گیرائی سمجھنے کی حماقت کر بیٹھتے ہیں اور المیہ یہ ہے کہ نارنگ کی وضاحت فکر اور سلاست زبان کی جگہ نئے نقادوں کے ذہن اور زبان کی ژولیدگی تحریر کو

چوں چوں کا مربہ بنادیتی ہے۔''

(ٹوٹی رسی سے بندھا کواڑ، حقانی القاسمی، استعارہ، شمارہ 22)

میں خود گیان چند جین کی متعصبانہ آرا کو رد کرتا ہوں اور فرقہ واریت خواہ کسی کی ہو اس پر لعنت بھیجتا ہوں لیکن یہ بات گلے سے نہیں اترتی کہ صرف 'انتساب' کا بہانہ بنا کر نارنگ صاحب کی شش جہت شخصیت پر چھینٹا کشی کی جائے اور ان کی جملہ خصوصیات پر پردہ ڈالا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جملہ فرقہ پرستوں بلکہ سازشیوں پر گوپی چند نارنگ کی یہ کتاب نہ صرف بہت بھاری ہے بلکہ زبردست طمانچہ بھی۔

اس کتاب میں شامل ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی، افسر بکارِ خاص، رام پور رضا لائبریری کے 'حرف آغاز' اور مشہور ماہر لسانیات وصدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے عالمانہ ''پیش لفظ'' نے تو اردو زبان اور اس کے رسم خط سے نارنگ صاحب کے والہانہ لگاؤ اور ان کی گراں قدر خدمات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اردو زبان و ادب کے حوالے سے کچھ تیرہ نہادوں کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔

پچیس مضامین سے آراستہ زیر نظر تصنیف پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں سات، دوسرے میں تین، تیسرے میں پانچ، چوتھے میں پانچ اور آخری حصے میں پانچ کے علاوہ انگریزی کے دو مضامین بھی شامل ہیں جو ہر اعتبار سے منفرد، یکتا اور معلوماتی ہیں۔ پہلے حصے میں اردو ہماری اردو، اردو کی ہندستانی بنیاد، اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہ، اردو کے افعال مرکبہ پر ایک نظر، اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک (اوّل و دوم) اور قصہ اردو زبان کا' کے عنوانات سے مجموعی طور پر اردو اور ہندی کے لسانی رشتوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور اردو کے تاریخی تناظر میں موجودہ درپیش مسائل کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے نارنگ صاحب کی اردو سے گہری مطابقت اور سچی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز برصغیر کے تناظر میں اردو کی تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور لسانی غرض و غایت کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے اور اس کی اہمیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ درحقیقت پہلا حصہ اردو۔ ہندی کے معنی خیز رشتے کی مختلف جہتوں کو واضح طور پر اجاگر کرتا ہے۔

دوسرے حصے کے تحت ''اردو رسم الخط- ایک تاریخی بحث، اردو رسم الخط: تہذیبی و لسانیاتی مطالعہ، اور اردو املا اور لسانیات، کے عنوانات سے مضامین شامل کیے گئے ہیں جن سے روایت اور اجتہاد پر روشنی بھی پڑتی ہے۔ ان تینوں مشمولات کا محور و مرکز اردو رسم الخط ہے اور جو انتہائی علمی اور سائنسی انداز میں لکھے گئے ہیں اور جن کے مطالعے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کا

شوشہ لسانی کی بجائے خالص سیاسی نوعیت کا ہے۔ انھوں نے صاف صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا ہے کہ اردو اور ہندی کے لیے ایک ہی رسم خط کا اختیار کیا جانا دونوں کے حق میں نقصان دہ ہے۔

زیر نظر کتاب کے تیسرے حصے میں تین ممتاز شخصیتوں دتاتریہ کیفی، احتشام حسین اور فرمان فتح پوری کی ادبی اور لسانیاتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے زبان سے متعلق بڑے اہم موقف کو بیان کیا گیا ہے جبکہ چوتھے حصے میں 'کربل کتھا کا لسانیاتی تجزیہ، اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی، انجمن ترقی اردو کی کل ہند اردو کانفرنس، بہار کا تاریخی اقدام اور کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس، سے متعلق مضامین ہیں۔ کربل کتھا پر ان کا مضمون جامع اور پر مغز ہے اور اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی کا جائزہ بھی کافی بھرپور ہے جو نارنگ صاحب کی ایک اہم لسانیاتی تلاش و جستجو ہے۔ اس طرح اردو کانفرنسوں میں شرکت کر کے اردو کے درپیش مسائل سے اہل زبان و ادب کو آگاہ کرنے کی بے حد ادبی گفتگو نے اس حصے کو معنی خیز بنا دیا ہے۔ اس طرح بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے سے متعلق تاریخی اقدام پر پروفیسر نارنگ کی تحریر نے اور بھی معنویت پیدا کر دی ہے۔

پانچویں اور آخری حصے میں پانچ مضامین 'اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت، ہمزہ کیوں؟ ان یاں، اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی اور اردو مصوتوں کی نئی درجہ بندی کے عنوانات سے ہیں۔ یہ تمام مضامین تکنیکی انداز میں خالص لسانیاتی نوعیت کے ہیں۔ یہ بیشتر وہ مضامین ہیں جن پر خوب خوب بحثیں ہو چکی ہیں۔ اردو آوازوں اور اردو مصوتوں کی نئی درجہ بندی کے حوالے سے شامل مضامین امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں لکھے گئے۔ آخر میں انگریزی کے دو مضامین اردو اور ہندی کی Generative Phonology کے مسائل پر لکھے گئے ہیں۔ یہ وہ مضامین ہیں جو مختلف یونیورسٹیوں میں لسانیات کے کورسوں میں حوالہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مضامین سے گوپی چند نارنگ کے مطالعہ کی عرق ریزی اور اردو سے ان کی محبت کی تصویر واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اردو کی محبت میں زبان کی کیسی کیسی جہات کو روشن کیا ہے۔

مختصر یہ کہ 'اردو زبان اور لسانیات' گوپی چند نارنگ کے اردو سے متعلق موقف کا واضح اظہاریہ ہے اور اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ نارنگ صاحب نہ صرف ایک ممتاز اور بلند پایہ نقاد اور نظریہ ساز ادیب و دانشور ہیں بلکہ ماہر لسانیات بھی ہیں۔ ان کے دلائل اتنے مربوط اور دلکش ہیں کہ ان کی تخلیقی و تنقیدی اور لسانیاتی فکر و بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ پھر گیان چند جین جیسے منفی سوچ رکھنے والوں کے ذریعہ پیدا کی گئی تند فضا میں بروقت اس کتاب کی اشاعت سے اس کی معنی خیزی اور بھی دوبالا ہو جاتی ہے اور اس کا ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ اگر معاشرے کا کوئی ایک شخص ذہنی عدم توازن کا

شکار ہو جائے تو پورے معاشرے کو عدم توازن کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ 'اردو زبان ولسانیات' جیسے ہتھیار اور تصنیف کی ضرورت ہے۔ رہی بات فرقہ پرستی کے توڑ کی تو گوپی چند نارنگ جیسے جید عالم کا ایک صفحہ ہی کافی ہے۔

گوپی چند نارنگ کی یہ عالمانہ اور فکر انگیز تصنیف اردو زبان اور لسانیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب کے حوالہ سے اردو ادب اور لسانیات کے اہل نظر کو برسوں روشنی ملے گی اور یقیناً یہ کتاب فکر و نظر کی نئی بستیاں آباد کرنے میں کامیاب ہوگی۔ بالخصوص آج کی مسموم فضا میں یہ تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح ہے۔ یہ کتاب گوپی چند نارنگ کے معاندین اور مخالفین کے منہ پر زنائے دار طمانچہ بھی ہے۔ نارنگ صاحب کے موقف کو کسی دوسرے کے حوالے سے نہیں بلکہ خود ان کی تصنیف کے حوالے سے جاننے اور پرکھنے کی ضرورت ہے اور یہی دیانت داری اور درایت کا تقاضا بھی ہے اور یہی اہل نظر اور ارباب تحقیق کا شیوہ رہا ہے۔

ہر چند کے اوپر ہم نے نارنگ صاحب کی فقط ایک کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' کے حوالے سے گفتگو کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نارنگ صاحب کی اکثر تصانیف سے اردو زبان کے بارے میں بار بار ان کا جو موقف سامنے آتا ہے اسے یوں بیان کر سکتے ہیں:

(۱) اردو زبان ہندو اور مسلمانوں کے اشتراک سے وجود میں آئی اور اس کی حیثیت دو فرقوں کے درمیان ایک لسانی اور تہذیبی پل کی ہے۔

(۲) اردو گنگا جمنی تہذیب یعنی مشترک تہذیب کی بہترین ترجمان ہے۔

(۳) جمہوری ہندوستان میں سیکولرازم کا کوئی تصور اردو کے بغیر مکمل نہیں۔

(۴) ادبی اور جمالیاتی حسن کاری کے اعتبار سے ہندوستانی زبانوں میں اردو کی حیثیت تاج محل کی سی ہے۔

(۵) اردو رسم الخط کو تبدیل کرنا اردو کی شخصیت کے قتل کرنے کے مترادف ہے۔ اردو کا تحفظ اس کے اپنے رسم الخط کے ساتھ ہونا چاہیے۔

(۶) اردو اور ہندی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں جو لسانی اور تعلیمی حقوق ہندی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی وغیرہ کو حاصل ہے وہ اردو کو بھی مساویانہ طور پر ملنا چاہیے۔ اردو علاقے میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اسکولوں میں اردو تعلیم کا نفاذ بے حد ضروری ہے۔

یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ تقریباً پچاس برسوں سے پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنے مندرجہ بالا Thesis کے ساتھ اردو کے دفاع میں سینہ سپر رہے ہیں۔

اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی اردو کے سیکولر کردار اور حقوق کے لیے انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ (ان کی 64 سے زیادہ کتابیں ہیں جن میں چالیس پینتالیس اردو میں اور دس گیارہ ہندی میں اور انگریزی میں) اس موضوع پر بلا شبہ انھوں نے ہزاروں صفحات لکھے ہوں گے اور دنیا کے کونے کونے میں اردو کا پرچم بلند کیا۔ انھیں بیرونی دنیا میں بالعموم 'سفیر اردو' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ عہد میں بشمول اردو کے دیگر ادیبوں کے کسی دوسرے جید ادیب نے اردو کے لسانی اور تہذیبی موقف کو سائنسی اور معروضی دلائل کے ساتھ اتنے موثر پیرائے میں بیان نہیں کیا ہوگا جتنا کہ گوپی چند نارنگ نے کیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ اپنی مثال آپ ہیں اور ان کی خدمات بے مثل ہیں۔

قرآن کریم کی آیت ہے:

وَلاَ یَجْرِ مَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمِ الاَّ تَعْدِ لُوْا

کسی قوم کی دشمنی میں عدل و انصاف سے منحرف ہوجانا، نہ اہل ایمان کا طریقہ ہے اور نہ ہی اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ تمام معاملات میں عدل و انصاف شرط ہے چاہے نظریاتی، لسانی، فکریاتی مسائل ہوں یا دیگر معاملات حزم، عدل و احتیاط برتنا ضروری ہے۔

☆☆

.... صفحہ ۱۱۷ کا بقیہ

پائندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو گوپی چند نارنگ سے یہ بڑا کام لینے میں ہمیں کوئی پس و پیش نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہر اعتبار سے وہ اس کے اہل ہیں۔ ان کے جیسے لوگ مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں گوپی چند نارنگ کی عظیم المرتبت شخصیت پر فخر ہے۔ ان کی موثر اور بلیغ معنی و مفہوم کی کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' کی اشاعت کے بعد کم سے کم میں تو یہی محسوس کرتا ہوں، میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ان کی یہ تازہ ترین کتاب ان کی مثبت سوچ اور فکر کا اعلان نامہ (Manifesto) ہے اور ان کو ہمیں اس پس منظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں اپنی طرف سے اور اردو کے تمام قارئین کی طرف سے 'اردو زبان اور لسانیات' کی مبارک اشاعت پر تہ دل سے انھیں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

☆☆

سیفی سرونجی

''اردو زبان اور لسانیات''
گوپی چند نارنگ کا نیا علمی کارنامہ

یہ بات طے شدہ ہے کہ جب تک پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسی ہستیاں دنیا میں پیدا ہوتی رہیں گی اردو زبان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا۔ حال ہی میں شائع ہونے والی نارنگ صاحب کی عالمانہ کتاب '' اردو زبان اور لسانیات'' اس کی زندہ مثال ہے جس میں نارنگ صاحب نے اردو زبان کے متعلق ۲۵ ایسے مضامین شائع کئے ہیں جن کے ایک ایک لفظ ایک ایک سطر سے ان کے اردو سے والہانہ عشق کا اظہار نمایاں ہے۔ پروفیسر نارنگ کی یہ کتاب اردو زبان اور لسانیات پر ہی نہیں ہے بلکہ اردو کے ایک سچے عاشق کے عالمانہ تجربات، ان کے دل سے نکلے ہوئے کلمات کے ذریعہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو سے سچا عشق ہی نہیں کیا بلکہ اپنی زندگی اردو کے لیے وقف کردی ہے۔ اور جو کچھ انہوں نے اردو سے پایا اس کا بھی انہوں نے کھل کر اعتراف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ میرا سفرِ اردو سفرِ عشق ہے، اثبات خودی کی نہیں، تسلیم خودی کی راہ ہے جس میں لین نہیں دین ہی دین ہے اور میں نے تو دیا کچھ بھی نہیں، میری بساط ہی کیا اور لے لیا کتنا، یہ کسرِ نفسی نہیں کہ میری پہچان جو تھی، ہے اور جیسی بھی ہے اردو کی بدولت ہے، یہ اردو کی فیاضی نہیں تو کیا ہے کہ میں تو کچھ بھی نہ دے سکا اور اس نے مجھے اتنا کچھ دیا کہ کسی کو بھی کسی نے کیا دیا ہوگا۔''

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نارنگ صاحب نے کس آسانی سے کہہ دیا کہ میں نے اردو کو کچھ نہیں دیا اور اردو نے مجھے مالا مال کردیا جبکہ سچائی یہ ہے کہ نارنگ صاحب نے اردو کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اردو زبان مالا مال ہوگئی، ان کے افکار و خیالات سے ان کی تحریروں سے ان کی زبان

سے نکلے ہوئے الفاظ سے آج جبکہ لوگ پندرہ بیس سال غیر معیاری شعر کہہ کر اور اپنے شعری مجموعوں کے انبار لگا کر اردو زبان کی خدمت کا ڈھنڈورا پیٹنے لگتے ہیں، نارنگ صاحب نے تمام عمر اردو کے لئے قربانیاں دینے کے بعد بھی یہ کہا کہ میں نے اردو کو کچھ نہیں دیا بلکہ اردو نے مجھے بہت کچھ دیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا ہر لمحہ اردو ادب کی خدمت کے لئے وقف ہے اور زیر نظر کتاب یعنی ''اردو زبان اور لسانیات'' میں تو انہوں نے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ یہ کتاب تو ان کی زندگی کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر اہل اردو کو ناز ہے، دوسرے یہ کہ جب جب اردو پر مصیبت کے دن آئے ہیں، پروفیسر گوپی چند نارنگ سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو گئے ہیں، لوگ زبانی دعوے کرتے ہیں، نارنگ صاحب نے عملی طور پر کام کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت ایسے ماحول میں ہوئی ہے جب ایک بار پھر اردو سازشوں کے گھیرے میں ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین صاحب جیسے اردو کے جاں نثار بھی پینترا بدل کر کھڑے ہو گئے، لیکن نارنگ صاحب نے یہ کتاب شائع کر کے ایک بار پھر اردو پر حملہ کرنے والوں کو شکست فاش دے دی اور انہیں ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ ایسے ماحول میں اس کتاب کی اشاعت نے اردو والوں کو مایوسی سے بچا لیا۔ اس کتاب کے بارے میں پروفیسر خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان اور لسانیات'' پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ان گراں قدر لسانیاتی مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو زبان کے حوالے سے وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔ یہ مضامین گزشتہ پچیس تیس سال کے دوران اردو کے مقتدر رسائل میں شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ یہ ہندوستان کے سماجی، تہذیبی، تاریخی اور لسانی تناظر میں اردو زبان کی صحیح اور سچی تصویر پیش کرتے ہیں اور جدید لسانیاتی مباحث کا باقاعدہ طور پر آغاز کرتے ہیں۔ ان یادگار مضامین کی اشاعت سے اردو کے لسانیاتی ادب میں نہ صرف وقیع اضافہ ہوا ہے بلکہ اردو زبان کو علمی وقار حاصل ہوا ہے۔ یہ مضامین نارنگ صاحب کی لسانیاتی فکر، بصیرت کو سمجھنے اور ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں اردو کو درپیش مسائل سے متعلق ایک صاحب نظر ادیب کے موقف کو جاننے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ اردو زبان اور اس کے رسم خط سے نارنگ صاحب کو فطری اور والہانہ لگاؤ ہے اور اردو کے لسانیاتی مسائل کی وضاحت سے انہیں جو گہری دلچسپی ہے اس کی واضح تصویر ان مضامین میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

اس وقت ہم یہ بحث نہیں کر رہے ہیں کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا کچھ لکھا، کتنا لکھا یا

ان کی شخصیت اور کارناموں پر کتنا کچھ لکھا گیا بلکہ بات ہے ان کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' کی۔ گیان چند جین کی کتاب آتے ہی چاروں طرف سے ان پر گھیرا بندی شروع ہوگئی اور کچھ لوگ، اخبارات و رسائل صرف اس وجہ سے کہ گیان چند جین کی کتاب امرت رائے اور گوپی چند نارنگ صاحب سے منسوب کی گئی ہے، بہت سے شکوک میں مبتلا ہوگئے اور نارنگ صاحب کو بھی شک کے دائرے میں گھیر لیا کہ وہ اس بات کی وضاحت کریں کہ اس کتاب کی اشاعت میں ان کا کتنا ہاتھ ہے۔ کچھ اخبارات اور رسائل نے باقاعدہ نام لے کر ان سے اس بات کی وضاحت چاہی لیکن نارنگ صاحب نے بجائے ہر کس و ناکس کا جواب دینے کے چند ہی مہینوں میں خاموشی کا طلسم توڑتے ہوئے اچانک ہی ایک دھماکہ خیز عالمانہ کتاب اردو زبان اور لسانیات ادبی دنیا میں پیش کردی اور صاف طور پر لکھ دیا کہ اردو میری جان ہے، اردو میرا وجود ہے، اردو سے میں ہوں ورنہ میرا وجود کچھ نہیں۔ یہ عالمانہ کتاب ان سارے شکوک وشبہات کی دھند کو صاف کرتے ہوئے ایک اردو کے سچے جاں نثار کا ایک ایسا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ وہ اردو کی خدمت کا دعویٰ کرنے والے بھی شرمسار ہوگئے جنھوں نے کیا تو کچھ بھی نہیں لیکن اپنی تحریروں اور تقریروں سے بلا وجہ اپنے الزامات سے سچے اردو کے پرستاروں کو ذہنی تکلیف پہنچانے کا کام کرتے رہے۔

اردو زبان اور لسانیات کی اشاعت نے ایسے ماحول میں اردو کی وہ خدمت انجام دی ہے جس کی مثال ادبی دنیا میں نہیں مل سکتی، اس لئے کہ اعتراضات کرنے والے تو سینکڑوں ہیں زبانی ہنگامہ برپا کرنے والے بھی سینکڑوں مل جائیں گے لیکن کسی نے ایسا عملی کام انجام دینے کی جرأت نہیں کی نہ کسی اور اردو ادیب کو یہ نصیب ہوا کہ وہ اردو کی بقا کے لئے اردو کے ماحول کو سازگار بنانے کے لئے یا اردو پر بُرا وقت آنے پر کوئی عملی قدم اٹھائے۔ نارنگ صاحب ایک دانشور بھی ہیں، ماہر لسانیات اور ایک عظیم نقاد ہی نہیں بلکہ اردو کے ایک سچے جاں نثار بھی ہیں، اردو کے سچے عاشق بھی ہیں اور یہ کتاب ان کے سچے اردو کے پرستار ہونے کا ثبوت ہے، یہ ادبی کارنامہ انھوں نے ایسے وقت میں انجام دیا ہے جب اس کی سخت ضرورت تھی اور زبان اور لسانیات کے دیباچے میں ہی نارنگ صاحب نے سب کچھ بیان کردیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ بات بتانے یا جتانے کی نہیں کہ اردو سے میری وابستگی دیوانگی کی حد تک ہے۔ جب لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اردو کی خدمت کررہے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بڑی زبان جس کے ذریعہ کروڑوں لوگ اپنی زندگی کو بامعنی بناتے یا اپنے وجود کی شناخت کراتے ہیں وہ کسی فرد واحد کی خدمت کی

محتاج کیسے ہوسکتی ہے، سب جانتے ہیں کہ اردو بے چاری صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے، یہ ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا وہ ہاتھ ہے جس کے بغیر نہ صرف ہم گونگے، بہرے بلکہ بے ادب بھی ہیں، میں نے بار بار کہا ہے کہ اردو کو محض ایک زبان کہنا اردو کے ساتھ بے انصافی ہے، یہ ایک طرز حیات، ایک اسلوب زیست، ایک انداز نظر یا جینے کا ایک سلیقہ وطریقہ بھی ہے، اس لئے کہ اردو صدیوں کے تاریخی ربط وارتباط سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایسا روشن استعارہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برصغیر کی زبانوں میں نہیں۔ اردو کا ایک نام سیکولرزم یعنی غیر فرقہ واریت اور بقائے باہم بھی ہے، اردو نے صدیوں سے اس کی معنی خیز مثال قائم کی ہے اور ہر طرح کی تنگ نظری اور دقیانوسیت کے خلاف محاذ باندھا ہے، لمحہ فکریہ یہ ہے کہ کیا ایسے انسانیت پرور تصور کے بغیر ہمارے آزاد جمہوری معاشرے نہ صرف یہ کہ اپنے ترقی پذیر ہونے کا جواز فراہم کر سکتے ہیں بلکہ کیا کسی کشادہ اور روادار تہذیبی تصور کے بغیر وہ زندہ بھی رہ سکتے ہیں۔''

گوپی چند نارنگ صاحب نے اپنی اس تازہ علمی کتاب اردو زبان اور لسانیات کے دیباچہ میں اردو زبان کی اہمیت، اس کی افادیت اور اردو کے بغیر زندہ رہنے کے تصور پر جس طریقے سے روشنی ڈالی ہے وہ کوئی ادنیٰ یا خالی اردو کے حق میں دعویٰ کرنے والا نہیں لکھ سکتا، ایسی تحریر صرف وہ ہی شخص لکھ سکتا ہے جس کے ذہن و دل میں ہی نہیں بلکہ جس کی زندگی میں صرف اردو ہو اور نارنگ صاحب ایک ایسی ہی شخصیت کا نام ہے، اردو کے بغیر زندہ رہنے کے تصور ہی سے کانپ اٹھتے ہیں۔ اس قدر کھل کر اردو زبان کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف کرنا اور ایک ایسی کتاب لکھنا جس کے لفظ لفظ سے اردو کی اہمیت ٹپکتی ہو اردو سے سچا عشق کرنے والا ہی تحریر کرسکتا ہے۔ اس کتاب کا پہلا مضمون ''اردو ہماری اردو'' ہے، جس میں نارنگ صاحب نے اردو کے رسم خط سے متعلق اظہار خیال کیا ہے کہ بغیر رسم خط کے اردو اردو ہی نہیں رہے گی اردو رسم الخط کی اس قدر حمایت بھی سچا عاشق اردو ہی کرسکتا ہے ورنہ آج کیا ہمیشہ سے اردو والوں میں اردو رسم خط کے ہی دشمن رہے ہیں۔ عصمت چغتائی ،راہی معصوم رضا اس کی مثال ہیں، اس کتاب کے سلسلے میں یعنی کتاب کے پیش لفظ میں مرزا خلیل احمد لکھتے ہیں:

''زیر نظر کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے جن میں کل ملا کر پچیس مضامین شامل

ہیں، پہلے حصے میں سات مضامین ہیں جو اردو کے تاریخی تناظر کے ساتھ ساتھ اس کے حالیہ مسائل کا جائزہ بھی پیش کرتے ہیں، نیز اردو ہندی کے لسانی رشتوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے برصغیر میں اردو کی تاریخی، تہذیبی اور لسانی اہمیت کا تو اندازہ ہوتا ہی ہے اردو سے متعلق نارنگ صاحب کے موقف کا بھی پتہ چلتا ہے، نارنگ صاحب ماہر لسانیات ہونے کے علاوہ اردو کے شیدائی بھی ہیں، اردو زبان اور رسم خط سے انہیں سچا پیار ہے تاہم وہ اردو کے بارے میں حقیقت پسندانہ طرز استدلال سے کام لیتے ہیں۔ اپنے پہلے مضمون ''اردو ہماری اردو'' میں وہ بجا طور پر اردو کو پچھلی کئی صدیوں کی تہذیبی کمائی سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے مختلف فرقوں اور طبقوں کے درمیان محبت یگانگت کی علامت تصور کرتے ہیں۔ اردو زبان کو وسیع تناظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں جس کا رشتہ ہمارے ملک کی ایک ہزار سالہ تاریخ سے استوار ہے جو ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت ہے اور جو ہماری پہچان بھی ہے۔''

اس اقتباس کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نارنگ صاحب کی کتاب صرف اردو زبان پر ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ہندوستان کی ایک ہزار سالہ تاریخی و تہذیبی تناظر کی جھلکیاں بھی صاف طور سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ جہاں ایک طرف کتاب کے پہلے مضمون ''اردو ہماری اردو'' میں رسم خط اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے تو دوسرے مضمون ''اردو کی ہندوستانی بنیاد'' میں پورا تاریخی، سیاسی، سماجی پس منظر پیش کر دیا، اس طرح تیسرے مضمون میں جو کہ اردو کے محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہہ پر ہے، چوتھا مضمون اردو کے افعال مرکبہ پر ایک نظر کے عنوان سے ہے، ان تینوں چاروں مضامین میں نارنگ صاحب نے اردو سے متعلق کیا کچھ نہیں لکھا، اردو کی اہمیت، افادیت کے علاوہ ہندوستانی تہذیب اور اردو سے متعلق تمام مسائل کا جائزہ اس خوبصورتی سے لیا ہے کہ اردو ایک طاقتور زبان کے روپ میں صاف ستھری دکھائی دینے لگی اور جو لوگ اردو سے مایوسی کی بات کرتے ہیں انہیں بھی آئینہ دکھا دیا کہ وہ زبان کبھی ختم نہیں ہو سکتی جس کی جڑیں ہندوستانی تہذیب کی ایک ہزار سالہ تاریخ میں پیوست ہیں، اردو کے لئے زبانی دعوے کرنے والے تو ہزاروں ہیں لیکن عملی کام کرنے والوں کا دور دور تک پتہ نہیں لیکن نارنگ صاحب نے اردو کے لئے عملی کام کر کے دکھایا ہے، وہ اردو بولتے ہیں، اردو پڑھتے ہیں، اردو لکھتے ہیں، اردو کے بارے میں سوچتے ہیں، اردو کے لئے سفر کرتے ہیں، اردو کے لئے تقریریں کرتے ہیں، ایسے عمل کام کرنے والے اگر دو چار ہی پیدا ہو جائیں تو اردو

کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ نارنگ صاحب کے دل میں اردو کے لئے جو تڑپ ہے وہ یوں تو ان کی ساری کتابوں اور بے شمار مضامین میں ان کی زندگی ان کے کارناموں میں دیکھی جاسکتی ہے لیکن جس تڑپ کا اظہار انھوں نے اپنی اس تازہ علمی کتاب اردو زبان اور لسانیات میں گویا اپنی پوری زندگی کے درد کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے، صرف کتاب کے دیباچے ہی میں سب کچھ بیان کردیا ہے، دیگر مضامین میں جو کہ اردو سے متعلق ہیں ان میں اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک، قصہ اردو زبان کا، اردو رسم الخط، ایک تاریخی بحث، اردو رسم الخط تہذیبی ولسانی مطالعہ، اردو املا اور لسانیات، روایت اور اجتہاد کی روشنی میں بھرپور جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے یہ کتاب ایسے موقع پر پیش کی ہے جب اردو پر چاروں طرف سے یورش کی جارہی ہے، بجائے اس کے وہ تقریر یا زبانی بیانات دیتے انھوں نے اردو کی حمایت میں ۲۶۰ صفحات کی یہ کتاب پیش کردی اور یہ ثابت کردیا کہ کام کرنے والے اس طرح کرتے ہیں اور باتیں کرنے والے صرف باتیں، اور ظاہر ہے کہ صرف زبانی باتوں سے اردو کا کوئی بھلا نہیں ہوسکتا، اس کے لئے عمل کی ضرورت ہوتی ہے اور عملی کام یہ ہے جو نارنگ صاحب نے اردو زبان اور لسانیات پر کیا ہے۔ ایک سچے اردو کے پرستار نے ایک ایسا کام اور ایسے موقع پر کر دکھایا جب اس کی ضرورت حد سے زیادہ تھی، جب اردو اور اردو والوں پر مایوسی کے سایے ہر طرف سے گھیرا ڈالے ہوئے تھے، یوں تو انہوں نے تمام زندگی اردو کے لئے وقف کررکھی ہے اور ان کا اوڑھنا بچھونا ہی اردو ہے لیکن یہ کتاب صحیح وقت پر لاکر انھوں نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ اردو زبان و ادب پر ہی نہیں اردو والوں پر بھی ایک احسان عظیم ہے، یہ کتاب ہمیشہ اردو والوں کو احساس کمتری کے دائرے سے باہر نکال کر امید کے چراغ روشن کرتی رہے گی اور اس کی کرنیں چاروں طرف بکھرتی رہیں گی۔ ادبی دنیا میں اردو زبان سے متعلق ایسی تاریخی دستاویزی کتاب کی اشاعت پر تمام اہلِ اردو کی جانب سے ہم نارنگ صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

☆☆

مرتب: سیفی سرونجی

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تازہ علمی کتاب

''اردو زبان اور لسانیات'' پر ایک مباحثہ

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' پر ایک مباحثہ سیفی لائبریری سرونج میں ۲۷/اگست ۲۰۰۶ء کو منعقد ہوا، شرکائے مباحثہ تھے:
نسیم انصاری، محمد ایوب واقف، کوثر صدیقی، اقبال مسعود، سیفی سرونجی، پروفیسر مختار شمیم، محمد توفیق خاں، محمد متین ندوی، انل اگروال۔

نسیم انصاری: میری نارنگ صاحب سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، حال ہی میں ساہتیہ اکاڈمی کی چار روزہ تقریبات کے سلسلے میں وہ بھوپال آئے، یہ تقریبات بھارت بھون میں منعقد ہوئیں، کوثر صدیقی نے موصوف کو منشی حسین خاں ٹیکنیکل سینٹر میں مدعو کیا، پہلی بار انھیں دیکھا اور سُنا۔
میں پروگرام کی نظامت کر رہا تھا، نارنگ صاحب نے مجھے ایک فہرست بھیجی جس میں تمام مہمانان، مدعوئین کے اسمائے گرامی لکھے تھے، وہ اپنے پروگرام میں بلائے گئے تمام لوگوں کے بے حد Concerned نظر آئے۔ نارنگ صاحب بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، ان کے مقام کا تعین تو مستقبل کا مورخ کرے گا لیکن ایک بات تو طے ہے کہ وہ اردو کے لئے زندہ ہیں، اردو ان کا اوڑھنا بچھونا ہے، اردو ان کا عشق ہے، اردو ان کا مذہب ہے، جب انہوں نے تقریر کی تو اپنی حالیہ کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' کے دیباچے سے دو پیراگراف پڑھ کر سنائے۔ انھیں سن کر اور سمجھ کر بہت سے لوگوں کے ذہن صاف ہوگئے، ''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب'' کے انتساب نے جو غلط فہمی پیدا کی تھی وہ یکسر دور ہوگئی۔ وہ انتہائی صاف ذہن انسان ہیں، اردو والے بیشک ان کی ذات پر فخر کر سکتے ہیں بلکہ میں یہ کہوں گا کہ کسی کتاب کو ان کے نام معنون کر کے انھیں یا ان کے نام کو Exploit نہیں کیا جاسکتا۔ کتاب مذکور کے دیباچے میں ''بین السطور'' میں بہت کچھ ہے۔'' تاثر نے

والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں" نارنگ صاحب بلا مبالغہ اردو کے عظیم سپاہی، غیر متعصب اور عظیم شخصیت ہیں۔

بھوپال کی ہر دل عزیز شخصیت نظم کے مشہور شاعر نسیم انصاری صاحب نے گوپی چند نارنگ صاحب سے حالیہ ملاقات اور ان کی ایک گھنٹہ کے تقریر جو کہ اردو زبان اور لسانیات سے متعلق تھی، کا حوالہ دیتے ہوئے نارنگ صاحب کی تازہ علمی کتاب "اردو زبان اور لسانیات" پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے نارنگ صاحب کی شخصیت، ان کی اردو سے دیوانگی کی حد تک محبت پر کھل کر اظہار خیال کیا، اس کے بعد مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی کے سکریٹری، ممتاز ادیب، صحافی اقبال مسعود صاحب نے نارنگ صاحب کی کتاب "اردو زبان اور لسانیات" پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا:

اقبال مسعود: اردو کی تمام ہستیوں، برصغیر ہندو پاک میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا نام نامی ایک روشن مینار کی طرح ہے جو اردو کے نا سمجھ اور کم عقل دوستوں کی اس طرح رہنمائی فرماتے ہیں جیسے اندھیرے اور سیاہ دنوں میں گہرے سمندر میں بھٹکتے جہازوں کو روشنی راہ دکھاتی ہے۔ ان کی تازہ کتاب "اردو زبان اور لسانیات" اردو ہندی کے درمیان کج مج مباحثہ، مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے والے، افراد اور جذباتی ہم وطنوں کو غور کرنے، سوچنے، فکر کرنے اور لائحہ عمل مرتب کرنے کی راہ دکھاتی ہے۔

اردو ادب میں گزشتہ پچاس برسوں کے دوران جب جب خاموشی اور جمود کا زمانہ آیا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے فکری سطح پر کوئی نہ کوئی ادبی بحث اور تحریک کا آغاز کر کے اس جمود، خاموشی اور منجمد احساس میں جولانی فکر اور عمل کی شمع روشن کی۔ ان کی آراء سے اختلاف ممکن ہے مگر یہ بات طے ہے کہ وہ ادبی سطح پر محرک کرنے، فکر سازی کرنے اور جمالیاتی ذوق کی حنا بندی کا کام کرتے ہیں، ان کی تازہ کتاب "اردو زبان اور لسانیات" بہت سے افراد کے ذہنی جالے صاف کرنے اور غور و فکر کرنے، بحث و مباحثہ اور نئی راہ متعین کرنے میں کامیاب ہوگی۔

اقبال مسعود صاحب کے بعد مشہور شاعر، ادیب و ایڈیٹر 'کاروانِ ادب' کوثر صدیقی یوں فرماتے ہیں:

کوثر صدیقی: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب دور حاضر کی ایسی عہد ساز شخصیت کا نام ہے جو صدیوں میں آتی ہے، آپ نے اردو کو جس طرح اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے، وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں، آپ گزشتہ پچاس سال سے اردو کے محاذ پر اردو کی حفظ و بقا

کے لئے مرد مجاہد کی طرح نبرد آزما ہیں، آزادیٔ وطن کے بعد جب جب اردو زبان و ادب پر حملے ہوئے ہیں آپ نے حملہ آوروں کو ترکی بہ ترکی جواب دیا ہے، خواہ وہ اردو رسم الخط کا معاملہ ہو یا کوئی اور معاملہ۔

حال ہی میں ڈاکٹر گیان چند جین صاحب کی تازہ کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' پر بھوپال میں آپ نے ایک ملاقات میں فرمایا کہ اردو ایک مکمل زبان ہے اور دستور ہند نے ایک زبان کے طور پر اس کے موجودہ رسم الخط میں تسلیم کیا ہے تو رسم الخط کی بحث بے معنی ہو جاتی ہے اور اگر کوئی اسے بدلنے یا کسی قسم کی ترمیم کی بات کرتا ہے تو شاید وہ جانے انجانے میں دستور ہند کو تسلیم نہیں کرتا۔ آپ نے ڈاکٹر گیان چند صاحب کی مذکورہ کتاب کا اگرچہ براہ راست جواب نہیں دیا ہے لیکن ان کی تازہ مطبوعہ کتاب ''اردو زبان ولسانیات'' میں آپ کے جو پچیس مضامین ہیں ان میں آپ نے مدلل طور پر ان سب کا جواب دے دیا ہے۔ مذکورہ کتاب کا دیباچہ پوری کتاب کی روح ہے۔ نارنگ صاحب اردو کے لئے جتنی عقیدت محبت رکھتے ہیں اس سے زیادہ موثر انداز میں اس کا اظہار ممکن نہیں ہے۔ جین صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب نارنگ صاحب کے نام منسوب کی ہے، اس سے قاری کو یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شاید نارنگ صاحب جین صاحب کے خیالات سے متفق ہیں، نارنگ صاحب نے بھی جہاں تک میرا علم ہے ابھی تک اس انتساب پر تحریری یا تقریری طور پر کوئی تبصرہ یا خیال ظاہر نہیں کیا ہے، اس لئے عوامی ذہن میں شک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ نارنگ صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے:

''مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میرے خون میں جاری و ساری نہیں، میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ اردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اترتی چلی گئی، یقیناً کچھ تو جادو ہوگا۔''

۲۶ راگست ۲۰۰۶ء کو بھوپال میں منعقدہ ایک جلسے میں آپ نے جس انداز میں اردو کا دفاع کیا اور کہا کہ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں اس سے زیادہ ہے، وہ ایک تہذیب کی ترجمان ہے، ایک طرز معاشرت ہے۔

اردو کے خلاف گیان چند جین صاحب کی کتاب سے جو غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے یا ہو رہی ہے، اس کا ازالہ اس کتاب سے ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نفرت کا

جواب نفرت سے نہیں، محبت سے دیا جاتا ہے، گیان چند جین صاحب کی کتاب پر برہمی ہونا فطری عمل ہے لیکن اس کا جواب نارنگ صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب سے بلاواسطہ جس طرح عالمانہ انداز میں دیا ہے وہ لائق صد آفریں ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ نارنگ صاحب جس مشن کو لے کر اردو کے محاذ پر کام کر رہے ہیں اس میں ہر محب اردو کو شریک ہونا ضروری ہے۔

کوثر صدیقی صاحب کے بعد سرونج کے بزرگ ادیب توفیق خاں نے کہا کہ:

محمد توفیق خاں: ''میں نے اپنی بیاسی سالہ زندگی میں پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسا اردو کا سچا عاشق نہیں دیکھا، گوپی چند نارنگ نے ہمیشہ سینہ سپر ہوکر اردو دشمنوں کا مقابلہ کیا ہے اور جب جب اردو کے لئے قربانیوں کی ضرورت پڑی ہے وہ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ ان کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' بھی ایسی ہی کتاب ہے۔ جو لوگ اردو رسم الخط اور اردو زبان کے مستقبل سے مایوسی کی بات کرتے ہیں وہ یہ کتاب پڑھ کر یقیناً حیران ہوں گے اور اس بات کا اعتراف کریں گے کہ گوپی چند نارنگ کے سامنے یا ان کی زندگی میں کوئی اردو مخالف اپنے پورے سیاسی جوڑ توڑ یا دباؤ میں آکر کچھ بھی لکھنے کی جرأت کرنے سے پہلے ہزار بار یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ ابھی پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے اردو کے سچے عاشق زندہ ہیں، یہ کتاب اردو زبان اور لسانیات لکھنے والا کوئی معمولی محقق نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اردو کے لئے اس کے دل میں تڑپ نہ ہو۔

محمد ایوب واقف: گوپی چند نارنگ اردو زبان و ادب کے سچے سفیر ہیں، گوپی چند نارنگ صاحب نے گزشتہ پچاس سال سے قلم و قرطاس سے اپنا رشتہ جوڑے رکھا ہے، اس پوری مدت میں کوئی ایک بھی ایسا موقع نہیں آیا جب انہوں نے ایک سفیر کے درجے اور رتبے سے روگردانی کی ہو، وہ اردو زبان، اس کی گنگا جمنی تہذیب اور اس کے رسم الخط کے عاشق ہیں، ادھر جب سے اردو کے مشہور محقق گیان چند جین کی متنازعہ کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' چھپ کر سامنے آئی ہے ان کی شخصیت شک کے گھیرے میں آگئی ہے، شک کے گھیرے میں آنے کی وجہ یہ ہے کہ گیان چند جین نے اپنی اس کتاب کو ان کے نام منسوب کیا ہے، لیکن خوش قسمتی سے اب گوپی چند نارنگ صاحب کی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' شائع ہوکر سامنے آگئی ہے۔ اس کتاب

میں کم از کم گیارہ ایسے مضامین ہیں جو اردو زبان اور اس کے رسم الخط کی پُرزور حمایت کرتے ہیں، لیکن اس کتاب کے آغاز میں ان کا جو مختصر دیباچہ ہے اسے پڑھ کر میرے اس خیال کی پوری تائید ہو جاتی ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کے سچے سفیر ہیں۔ اب ہم گوپی چند نارنگ صاحب سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس کریں گے کہ وہ اس بات کی وضاحت کریں کہ آیا وہ گیان چند جین کے بیانات سے اتفاق کرتے ہیں یا اس کی تردید کرتے ہیں۔

پروفیسر مختار شمیم: گوپی چند نارنگ صالح ذہنیت کے مالک ہیں اور انہوں نے ہمیشہ اردو زبان کی ترقی کے بارے میں صالح فکر کا اظہار کیا ہے، وہ عاشق اردو ہیں اس لئے اردو کو وہ تمام تر تہذیبی روایات کے ساتھ زندہ اور پائندہ دیکھنا چاہتے ہیں، اردو کیونکہ ہندوستانی زبان ہے اور ہندوستان ہی میں پلی بڑھی ہے اور اس کی شناخت ہندوستان ہی میں ممکن ہے، یہ صحیح ہے کہ پاکستان کا اردو ادب پروان چڑھا لیکن وہاں اردو زبان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہی اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی ممکن ہے اور جب تک گوپی چند نارنگ جیسے اردو زبان کے شیدا اور عاشق پیدا ہوتے رہیں گے یہ زبان اپنی شیرینی کے ساتھ اپنا جلوہ بکھیرتی رہے گی۔

گوپی چند نارنگ کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' ایک قابل قدر کارنامہ ہے اور گیان چند جین کے حالات کے تناظر میں نارنگ صاحب کی یہ کتاب اردو کو تمام الزامات سے بری کرتی ہے۔ ہم گوپی چند نارنگ صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ جب اردو کے لئے ایسی فضا تیار ہوئی کہ شکوک شبہات کے بادل چھانے لگے تو نارنگ صاحب کی تحریر نے پوری فضا کو روشنی سے بھر دیا اور اپنی فکر و نظر کے ایسے اُجالے بکھیرے کہ اردو زبان کا مستقبل توانا نظر آنے لگا۔

پروفیسر مختار شمیم کے بعد سیفی سرونجی نے گوپی چند نارنگ کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' پر اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سیفی سرونجی: یوں تو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پوری زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت میں ہی صرف کی ہے لیکن ان کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' تو ان کی پوری زندگی کے کارناموں کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے، اس عالمانہ کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ بات میں پورے یقین اور اعتقاد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب تک پروفیسر

گوپی چند نارنگ جیسی اردو کی دلدادہ ہستیاں پیدا ہوتی رہیں گی اردو زبان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا۔ ۲۶/اگست ۲۰۰۶ء کو بھوپال میں کاروانِ ادب کے جلسے میں نارنگ صاحب نے ایک گھنٹہ کی تقریر اور تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' کا دیباچہ پڑھ کر سنایا تو اہل بھوپال اور تمام اردو والے نہ صرف حیران رہ گئے بلکہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اردو سے والہانہ عشق کے قائل ہوگئے کہ ان جیسا اردو کا چاہنے والا صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دیباچے کی چند لائنیں پڑھ کر ایک لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ آپ سوچئے جب نارنگ صاحب نے یہ پڑھا تو کیا عالم ہوا ہوگا۔

''یہ بتانے یا جتانے کی ضرورت نہیں کہ اردو سے میری وابستگی دیوانگی کی حد تک ہے، جب لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اردو کی خدمت کررہے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بڑی زبان جس کے ذریعہ کروڑوں لوگ اپنی زندگی کو بامعنی بناتے یا اپنے وجود کی شناخت کراتے ہیں وہ کسی فرد واحد کی خدمت کی محتاج کیسے ہوسکتی ہے۔''

بلاشبہ نارنگ صاحب نے اردو سے عشق کیا ہے اور دیوانگی کی حد تک کیا ہے، ان پر ہر لمحہ اردو کا نشہ طاری رہتا ہے اور اس ہر لمحے کو انھوں نے اس عالمانہ کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' میں مقید کردیا ہے۔

سیفی سرونجی کے بعد نوجوان ادیب محمد متین ندوی نے کہا:

محمد متین ندوی: پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب اردو زبان کے محقق، نقاد، دانشور، مفکر اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے عالمی سطح پر شہرت رکھتے ہیں۔ ان کو دیکھنے اور سننے کی کافی عرصے سے آرزو تھی جو ابھی حال ہی میں ۲۳/اگست ۲۰۰۶ء سے ۲۶/اگست ۲۰۰۶ء تک بھارت بھون بھوپال میں ساہتیہ اکاڈمی کے تحت منعقد ہونے والے پروگرام میں شرکت کی وجہ سے پوری ہوئی۔ ابھی حال ہی میں پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کی معرکتہ الآرا تصنیف اردو زبان اور لسانیات جو رضا لائبریری، رام پور کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے، اسے پڑھ کر بے انتہا مسرت اور علم میں اضافہ ہوا، ساتھ ہی عالمی شہرت یافتہ محقق پروفیسر گیان چند جین صاحب کی یاد بھی آئی کہ انھوں نے بھی کچھ دنوں قبل ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' رکھا ہے، اس میں انھوں نے کیا لکھا ہے یہ کسی بھی پڑھنے لکھنے والے سے پوشیدہ نہیں۔ اہل قلم کی طرف سے جین صاحب کی اس کتاب پر سخت ردِ عمل کا مظاہرہ

کیا گیا۔ ہر کس و ناکس نے تنقیدی تیروں کی بارش کردی، ان پر لکھتے وقت حریفانہ انداز اختیار کیا گیا، اگرچہ اپنائیت کا انداز اپناتے ہوئے بھی بات کہی جاسکتی تھی لیکن ایسے حالات میں عام طور پر جذبات حاوی ہوجاتے ہیں اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، جہاں تک جین صاحب کی محققانہ حیثیت کا تعلق ہے تو وہ بلا شبہ تحقیق کے میدان کے شہسوار ہیں اور ساتھ ہی قابل احترام بھی، اگرچہ مذکورہ کتاب میں انھوں نے خود ہی اپنے بتائے ہوئے تحقیقی اصولوں سے انحراف کیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جین صاحب کو یہ کتاب لکھنے پر مجبور کیا گیا ہے، کیونکہ کتاب میں موجود باتیں ان کی شخصیت سے میل نہیں کھاتیں۔ جین صاحب کی کتاب پر بڑی تعداد میں اہل قلم نے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے لیکن نارنگ صاحب کی طرف سے کسی قسم کے ردِ عمل کا اظہار نہیں ہوا۔ اردو زبان اور لسانیات کے دیباچے کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ پروفیسر نارنگ صاحب کو کہنا تھا وہ سب مثبت انداز میں دیباچے میں ہی کہہ دیا ہے، صرف دیباچے کو ہی پڑھنے سے بہت سارے سوالات کے جوابات مل جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کتاب جین صاحب کی کتاب کے جواب میں منظر عام پر آئی ہے جس میں علمی، تاریخی، تجزیاتی، نظریاتی، لسانیاتی تحریریں اور نارنگ صاحب کا پچاس سالہ لسانی سفر موجود ہے۔

اس مباحثے کے آخر میں سدبھاونا منچ کے صدر انل اگروال نے کہا کہ میں اردو کا آدمی نہیں ہوں لیکن گوپی چند نارنگ صاحب کی تقریروں اور ان کے کارناموں کو دیکھ کر اردو کی طرف مائل ہوا ہوں، دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ان کی شخصیت اور تقریر نے مجھے اردو سیکھنے اور پڑھنے پر مجبور کردیا۔ میرے اسی جذبے کو دیکھتے ہوئے انھوں نے مجھے کئی بڑے سیمیناروں میں بلایا، یہی میرے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے، اس کتاب سے متعلق بھی ان سے کھل کر گفتگو ہوئی، سچائی تو یہ ہے کہ نارنگ صاحب اردو کے شیدا ہیں اور میں ان کا شیدا ہوں۔

☆☆

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نیا علمی کارنامہ

رامپور رضا لائبریری فخر سے یہ اعلان کرتی ہے کہ
اردو کے سربرآوردہ ادیب اور مرکزی
ساہتیہ اکاڈمی کے صدر

پروفیسر گوپی چند نارنگ

کی تازہ علمی کتاب

"اردو زبان اور لسانیات"

رضا لائبریری کے زیر اہتمام شائع ہوگئی ہے جو پچیس انتہائی اہم علمی و تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین ہندوستان کی صدیوں کی ملی جلی تہذیب اور ثقافت کی آئینہ دار اردو زبان کے تاریخی ارتقاء اور پس منظر کو بڑی علمی اور تکنیکی مہارت سے پیش کرتی ہے

جہانِ ادب (تبصرے)

"لاشعور"

غلام مرتضیٰ راہی

صفحات : 152

قیمت : ایک سو پچاس روپے

مبصر : سیفی سرونجی

غلام مرتضیٰ راہی جدید شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔ اردو شاعری میں چند ہی ایسے نام ہیں جو نہ صرف تخلیقی توانائی کے بل بوتے پر ایک منفرد وقار رکھتے ہیں اور اس مقام تک پہنچے ہیں جہاں تک پہنچنے کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے ان میں نمایاں نام غلام مرتضیٰ راہی کا ہے جو صرف اپنی شاعری اور اپنی پوری فکری ، اپنا خونِ جگر صرف کر کے غزل کے چراغ کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ لاشعور ان کا تازہ شعری مجموعہ ہے جو بھرپور اعتماد کے ساتھ ادبی دنیا میں پیش کیا گیا ہے، یوں تو ان کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لاشعور میں بھی چند قلم کاروں کی رائے شامل ہے، ڈاکٹر محمد حسن، شمس الرحمن فاروقی، مظہر امام، وارث علوی، شمیم حنفی، عشرت ظفر، کرامت علی کرامت، حامدی کاشمیری، علیم اللہ حالی، عتیق اللہ، ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد، وغیرہ۔ سبھی نے غلام مرتضیٰ راہی کی شاعری کو اس عہد کی بہترین شاعری قرار دیا ہے۔ عام طور پر اردو ادب میں اپنا مقام بنانے کے لیے لوگ پروفیسر، ڈاکٹر یا کسی بڑے عہدے کے سہارے اور اپنے اوپر مضامین لکھوانے، سیمیناروں اور مشاعروں میں شرکت کر کے مقام بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جیسے ہی ان کے عہدے کا اثر رسوخ کا دائرہ ختم ہوا ان کا ادبی مقام بھی داؤ پر لگ جاتا ہے۔ لیکن غلام مرتضیٰ راہی نے صرف اپنی شاعری سے یہ مقام بنایا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے لہجے کو سب سے جدا رکھا ہے۔ ان کے سارے شعری مجموعے اس بات کا ثبوت ہیں۔ لاشعور ان کا تازہ شعری مجموعہ ہے، ذرا لہجے کی پختگی ملاحظہ فرمائیں:

دنیا سے مرا فاصلہ بڑھتا رہے چاہے
تجھ سے جو ہے دوری اسے کم کرتا چلا جاؤں

ہر چند گلے گلے تھا پانی
تھا خشک لبِ فرات کتنا

جب تک نہ کسی کی نیند ٹوٹے
ہے خواب میں مجھے ثبات کتنا
دور سے آدمی پہچان لیا کرتے تھے
ساری بستی سے نکلتا ہوا گھر تھا میرا
ٹوٹنے کا وہ کہیں نام لیا کرتا ہے
وصل کی شب سے جڑا خواب سحر تھا میرا
اس کے احساس سے یہ ظاہر ہے
ہو رہی ہے مری نگہداری
مشرق و مغرب و شمال و جنوب
میری خاطر چہار دیواری
اس کی حکمت کو ہم نے موڑ دیا
روکا دریا تو نہر کی جاری

اس طرح کے خوبصورت، معیاری اور فکر سے بھرپور اشعار غلام مرتضیٰ راہی کے لاشعور میں موجود ہیں ان کی شاعری کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی نے سچ لکھا ہے:

''غلام مرتضیٰ راہی کی شاعری کا میں تیس سال سے قائل ہوں ان کی غزلوں میں اب بھی وہی آب و تاب ہے اور کہیں سے تھکن کے آثار نہیں ہیں، تازہ رہی کی ایسی مثال راہی کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی کے یہاں مل سکے۔
غلام مرتضیٰ راہی کی غزلیں آج کی شاعری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔''

☆

''اردو افسانہ - تجزیہ''

پروفیسر حامدی کاشمیری

ناشر : مکتبہ جامعہ

مبصر : سیفی سرونجی

پروفیسر حامدی کاشمیری ایک معتبر نقاد، شاعر و ادیب کی حیثیت سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ جہاں انہوں نے اردو نظم اور شاعری کی دیگر اصناف پر بے شمار تنقیدی مضامین اور کتابیں تحریر کی ہیں وہیں اردو افسانے سے متعلق بھی بہت سے ایسے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اردو

افسانہ-تجزیہ، ان کے تازہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں اردو کے مشہور اور منتخب افسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مثلاً منشی پریم چند کے ''کفن''، سعادت حسن منٹو کا ''ہتک''، راجیند رسنگھ بیدی کا ''لاجونتی''، کرشن چندر کا ''آدھے گھنٹے کا خدا''، انتظار حسین کا ''خواب اور تقدیر''، قرۃ العین حیدر کا 'نظاروں کے درمیاں''، جوگیندر پال کا بھائی بند، سریندر پرکاش کا سرنگ، رشید امجد کا ''دشت امکاں''، منشا یاد کا ''اوور ٹائم''، جیلانی بانو کا ''اجنبی چہرے''، مرزا حامد بیگ کا ''آوارہ''، اسی طرح نئی نسل کے افسانہ نگاروں کے مشہور اور منتخب افسانوں کے تجزیے آگئے ہیں۔ عبد الصمد، سلام رازق، شوکت جہاں بطور خاص طارق چھتاری کے افسانوں پر بہت کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔ افسانوں کی فنی خوبیوں اور کرداروں سے متعلق اور بیانیہ کہانی کے ابتدائی دور پر نظر ڈالتے ہوئے اس کے ارتقائی سفر پر بہت معلوماتی تجزیے کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری دراصل ایک ایسے نقاد ہیں جو اردو افسانے کی تکنیک اور فن پر نہ صرف دسترس رکھتے ہیں بلکہ انہوں نے افسانے پر بہت کام کیا ہے اور اچھے منتخب افسانوں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ یہ کتاب بھی ایسے ہی منتخب افسانوں کے تجزیہ پر مشتمل ہے اور تعریف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے نئی نسل کے بہترین افسانہ نگاروں اور ان کے افسانوں پر گفتگو کی ہے، ورنہ عام طور پر نقاد پریم چند، راجیند رسنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو سے آگے نہیں بڑھتے۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ یہ آج کے عہد کے ایسے افسانوں پر ہے جن میں ہمارے عہد کی عکاسی اور اس عہد کے مسائل ہیں۔ سلام بن رازق، عبد الصمد، شوکت حیات، انور خان، طارق چھتاری نے افسانے کے فن کو جو وقار بخشا ہے اور کہانی سے قاری کی دوری کو دور کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے، حامدی کاشمیری نے ان کے افسانوں کا تجزیہ کرنے میں افسانوں کے اندر افسانوں کی ساری خوبیوں اور خصوصیات کا بھرپور جائزہ لیا ہے، جہاں ایک طرف راجیند رسنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، سعادت حسن منٹو کے منتخب افسانوں کا تجزیہ ہے وہیں نئی نسل کے معتبر افسانوں پر گفتگو کر کے انہوں نے کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔

☆

''شاهد جمیل منظوم''

ڈاکٹر عبدالمنان طرزی

ناشر : نرالی دنیا پبلی کیشنز، دہلی

قیمت : ایک سو پچاس روپے

مبصر : سیفی سرونجی

اس میں کوئی شک نہیں کہ عبدالمنان طرزی دنیائے ادب میں ایک ایسے منفرد شاعر ہیں جو مجسم شاعر ہیں۔ شاعری ان پر نازل ہوتی ہے، نارنگ صاحب نے ان کے بارے میں صحیح کہا ہے کہ وہ ایک جنات ہیں۔ وہ ایک ایسے فطری شاعر ہیں کہ ہر اس واقعہ کو بھی منظوم کر لیتے ہیں جو کسی بحر میں نہ آئے تب بھی اس کے لیے ایسے الفاظ لے آتے ہیں کہ وہ بحر میں آجاتا ہے، چاہے وہ کسی کی شخصیت ہو یا وہ کوئی پیڑ پتھر ہو، اردو شاعری میں ہزاروں اشعار پر مشتمل مثنویاں تو پڑھی ہیں لیکن ان مثنویوں میں زیادہ تر عشقیہ داستانیں ہیں لیکن عبدالمنان طرزی صاحب نے تو تمام اہم شخصیات کی زندگی کو منظوم کر دیا۔ نارنگ زار منظر نامہ جس میں منظوم کتابیں اس بات کا ثبوت ہیں ان کی تازہ کتاب شاہد جمیل منظوم ہے جو مشہور شاعر ادیب شاہد جمیل کی پوری ادبی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ شاہد جمیل کی شاعری ان کے ادبی کارنامے ان کے دوستوں اور رسائل میں چھپے اور بے شمار واقعات کو نظم کے پیکر میں ڈھالنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے جبکہ آج کا شاعر اتنا سہل پسند ہے جو اپنے چند اشعار بھی کہتا ہے تو اس میں روانی برقرار نہیں رکھ پاتا۔ لیکن عبدالمنان طرزی کسی شخصیت پر بھی ایسی منظوم داستان اس روانی سے لکھتے چلے جاتے ہیں جیسے شاعری ان پر نازل ہو رہی ہو۔ وہ شاہد جمیل کی شخصیت اور شاعری پر کس طرح لکھتے ہیں:

میرے خامے کی زباں پر آئے اب شاہد جمیل
ہیں علوئے فکر و فن کی خود ہی جو اپنے دلیل
آج ان کی شاعرانہ منفرد پہچان ہے
دشت احساسات کا ہر اک گماں ایقان ہے
ان کے ہر مصرعے سے ظاہر ہے جمال اضطراب
پاتے ہیں ہر شعر میں ان کے شعور التہاب
اضطراری کیفیت سرمایہ ہے فنکار کا
ان کو ڈھب آتا ہے بے شک بات کے اظہار کا
ڈھب سے یا برتاؤ سے ہی اپنے ہر فنکار کے
ارتقائے فن کے طے ہوتے ہیں مشکل مرحلے

اس طرح شاہد جمیل کی پوری زندگی اور ان کے تمام ادبی کارناموں کو منظوم کر دیا، اس فنکاری میں صرف عبدالمنان طرزی ہی مہارت رکھتے ہیں۔ 88 صفحات کی اس کتاب میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا بھرپور دیباچہ شامل ہے جس میں انہوں نے شاہد جمیل کی شاعری پر روشنی

ڈالتے ہوئے عبدالمنان طرزی کے فنکارانہ کمال پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاہد جمیل کی تخلیقی قوت میں جو آرٹ ہے اور وجدانی صورت ہے اس میں فکری اخلاقی اور جمالیاتی پہلو دیکھے جاسکتے ہیں، اس طرح وہ نیکی حسن سچائی اور افادیت کے بھی نمائندہ ہیں، ان کے وجدان میں روح اپنے آپ کو معروضی وجود میں لاتی ہے تب فن وجود میں آتا ہے اور ان کی تخلیق یا شاعری بے مثال ہوتی ہے۔ اس انفرادی حیثیت کو سامنے رکھ کر اردو کے منفرد ناقد ڈاکٹر عبدالمنان طرزی نے یہ منظوم تنقیدی کتاب لکھی ہے۔''

بلاشبہ عبدالمنان طرزی کا یہ ایک منفرد کارنامہ ادبی دنیا میں یاد رہے گا۔

☆

''چشم نقش قدم''

ترنم ریاض

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

قیمت : 80روپے

مبصر : سیفی سرونجی

خواتین لکھنے والوں میں ترنم ریاض کا نام ایک ایسا نام تسلیم کیا جاتا ہے جو بیک وقت ایک اچھی شاعرہ، ایک اچھی ادیبہ ہی نہیں بلکہ اردو تنقید نگاروں میں بھی وہ ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں یعنی نظم و نثر میں ان کے کئی مجموعے اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ زبان و ادب کے معیار اور اس کے فن پر کتنا عبور رکھتی ہیں، ان کے ناول اور افسانے بھی ہمیشہ موضوع بحث رہتے ہیں، 'چشم نقش قدم' ان کے تازہ تنقیدی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے جس میں ان کے آٹھ بہترین تنقیدی تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ (۱) اردو رو بیائی اور ترقی پسند تحریک، (۲) مشترکہ قومی تہذیب اور اردو زبان، (۳) خواتین اردو ادب میں تانیثی رجحان، (۴) مغربی تانیث کے پس منظر میں، (۵) ہم عصر شاعرات کے کلام میں تانیثی جائزہ، (۶) غالب اور صنف نازک - ایک سماجیاتی اور نفسیاتی جائزہ، (۷) منٹو نظریے اور سماج، (۸) مرزا داغ دہلوی ایک سماجیاتی پس منظر۔

ان سارے تنقیدی اور تخلیقی مضامین میں جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ ہے ایک عورت کے نفسیاتی پہلوؤں کا جائزہ، ظاہر ہے ایسے نازک پہلوؤں پر ایک عورت جس طرح نظر ڈالے گی کوئی دوسرا وہاں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا، ترنم ریاض نے ان تمام مضامین میں عورت کے تمام تر نفسیاتی

پہلوؤں کا اس انداز سے جائزہ لیا ہے کہ ان کی تخلیقات کے تمام فنی اور تخلیقی پہلو سامنے آگئے ہیں۔ رباب اشرفی نے ان کے بارے میں صحیح لکھا ہے کہ:

''ترنم ریاض کا انداز کہیں بھی جارحانہ نہیں ہے بلکہ وہ احتجاج کو ایک شیریں کیپسول میں چھپاتی ہیں اور ایک میوزیکل آہنگ بخش دیتی ہیں، اس لیے احتجاج کی لے شاعرانہ حکم میں بدل جاتی ہے۔ یہ ایک بڑا وصف ہے۔''

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ اتنی ترقی کے بعد بھی انسانی معاشرے میں عورت آج بھی مظلوم ہے اور کوئی بھی عورت فنکار، عورت پر ظلم یا اس کے ساتھ زیادتی برداشت نہیں کر سکتی، ترنم ریاض نے ترقی پسندی سے لے کر آج تک، مغربی تہذیب کے حوالے سے نہ صرف بھرپور روشنی ڈالی ہے بلکہ عورت کے استحصال پر اور اس سے متعلق ہونے والے تمام پہلوؤں پر گہری نظر ڈالی ہے اور پھر اپنی رائے بھی دی ہے، اس کا حل بھی بتایا ہے، مسائل سے بحث کی ہے اور ایسے تمام مسائل کو خواتین مصنفوں کی تحریروں میں تلاش کیا ہے، مثلاً قرۃ العین حیدر، صالحہ عابد حسین، ساجدہ زیدی، رضیہ سجاد ظہیر وغیرہ۔ شاعری میں افسانوں میں اور دیگر تحریروں میں جہاں جہاں انہیں اردو ادب کے شاہکاروں میں عورت یا اس کے مسائل نظر آتے ہیں انہیں بڑے کھوج بین اور مکمل تحقیق کے بعد قلم اٹھایا ہے۔ اور ایسے پہلو تلاش کیے ہیں جن پر آج تک کسی کی نظر نہیں گئی تھی، اس لیے یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ قومی اردو کونسل کے تعاون سے یہ کتاب شائع کی گئی ہے۔

☆

''گمنام جزیروں کی تمکنت''

عنبر بہرائچی

قیمت : ایک سو پچاس روپے

ناشر : ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

مبصر : سیفی سرونجی

عنبر بہرائچی اردو ادب کا ایک معتبر نام تسلیم کیا جاتا ہے، شاعری کے علاوہ ان کے نثری کارنامے بہت ہیں اور وہ بھی ایسی منفرد نثر منفرد موضوعات پر کہ جن پر لکھنے کے لیے وسیع مطالعے اور گہرے شعور کی ضرورت ہوتی ہے، عنبر بہرائچی کا مطالعہ نہ صرف وسیع ہے بلکہ وہ کئی زبانوں پر مہارت رکھتے ہیں، ہندی، اردو، سنسکرت جیسی زبانوں میں اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ ادب میں ان کا ایک وقار قائم ہو گیا ہے، سچ ہے کسی نے کہا ہے کہ صلاحیتیں تیکھی ہیں۔ عنبر بہرائچی بے شمار صلاحیتوں کے مالک ہیں

اور ادب کی مختلف اصناف میں ان کے بکھیرے ہوئے ادب پارے اس بات کا گہرا ثبوت ہیں۔ 'گمنام جزیروں کی تمکنت' ان کا تازہ شعری مجموعہ ہے جس میں ان کی بہترین نظمیں شامل ہیں ان کی نظموں کے مطالعے سے دل اور دماغ پر نہ صرف گہرا اثر مرتب ہوتا ہے بلکہ سوچ کے کئی زاویے سامنے آتے ہیں اور قاری کو ایک مفکر کا درجہ دینے میں نمایاں رول ادا کرتے ہیں، ان کی نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ موضوعات بھی اسی زمین سے منتخب کرتے ہیں، کہیں بھی اپنے قاری کو خلاؤں کا سفر کرنے پر مجبور نہیں کرتے۔

درونِ دل

درونِ دل وہ نظامِ ہائے خروش پرور
سنوارتے ہیں صفِ عناصر کی دھڑکنوں کو
سہانے گزرتے ہوئے دنوں کے ملنگ سارے
درونِ دل زر افشاں مناظر کے رازداں ہیں
کثافتیں ان کا لمس پا کر سنور رہی ہیں
اجاڑ چہروں پہ شوخ ٹیسو لہک رہے ہیں
میں اپنی ٹوٹی ہوئی چٹائی پہ سو رہا ہوں
اڑا کے اندھے کنویں میں پنکھڑی اک گلابی
میں اس کے گرنے کی چاپ سننے میں منہمک ہوں

اس طرح کی کئی نظمیں عنبر بہرائچی کے اس مجموعہ میں شامل ہیں، جن میں زبان کی پختگی اور گہری فکر نمایاں ہے، اس مختصر تبصرے میں ان کی شاعری پر مکمل گفتگو نہیں کی جا سکتی کہ اس شاعری میں اتنی وسعت اور گہرائی ہے کہ بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے جو ایک مکمل مضمون کا متقاضی ہے۔

''لمحے لمحے سہ ماہی''

حسیب سوز

مبصر : سیفی سرونجی

'لمحے لمحے' سوز کی نگرانی میں ہمیشہ ایک ضخیم نمبر کی شکل میں شائع ہوتا ہے۔ یوں تو یہ رسالہ پابندی سے نہیں نکلتا لیکن جب بھی آتا ہے تو ایک ضخیم اور یادگار نمبر کی صورت میں آتا ہے، حسیب سوز نے اس سے پہلے 'لمحے لمحے' کی کئی خصوصی نمبر شائع کیے ہیں جو ادبی دنیا میں ایک یادگار نمبر تسلیم کیے جاتے ہیں، مثلاً جگن ناتھ آزاد نمبر، وسیم بریلوی نمبر اور دیگر کئی، لیکن تازہ خصوصی اور ضخیم نمبر ہندی اور

اردو کی مشہور شاعرہ ڈاکٹر مدھو ریما سنگھ نمبر کی شکل میں آیا ہے، چار سو صفحات پر مشتمل بہترین ٹائٹل اور گیٹ اپ کے ساتھ یہ نمبر مدھو ریما سنگھ کی شاعری اور ان کی شخصیت پر مکمل دستاویز ہے جسے ہمیشہ محفوظ رکھا جائے گا۔ کسی بھی رسالے یا خصوصی نمبر کے معیار اور کامیابی کے لیے سب سے پہلے اس نمبر میں لکھنے والوں کے ناموں پر نظر جاتی ہے، اس نمبر میں ہندوستان کے تمام معتبر قلم کاروں نے مضامین تحریر کیے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ مضامین لوگ آسانی سے نہیں لکھتے، اس میں صاحب نمبر اور مدیر کے تعلقات، اس کی ہر دل عزیزی اور شخصیت کا زیادہ اثر ہوتا ہے، اس میں بہت سے قابل اور محترم لکھنے والوں نے مدھو ریما سنگھ کی شاعری اور شخصیت پر بہت شاندار مضامین، تاثرات تحریر کیے ہیں۔ جس سے نمبر کی اہمیت اور مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ملک زادہ منظور احمد، بشیر بدر، قیصر الجعفری، انور جلال پوری، ایاز جھانسوی، ممتاز راشد، ظفر گورکھپوری اور دیگر کئی قلم کاروں نے مدھو ریما سنگھ کی شاعری پر مکمل گفتگو کی ہے، اداریہ میں ایڈیٹر حسیب سوز لکھتے ہیں:

''مدھو ریما سنگھ کی شاعری نظموں، غزلوں، گیتوں میں عوامی زبان کی تمام تصویریں موجود ہیں، یہ تصویریں گھر آنگن کی بھی ہیں، سماج اور سیاست کی بد چلنی کی بھی اور انسانی رشتوں کی بھی۔ مدھو ریما سنگھ نے اپنے لہجے کی بنا پر علمی منظر نامے سے لے کر گاؤں کی چوپال تک کے واقعات تجربات، حادثات اور مشاہدات کو اپنے رنگ میں اس طرح رنگا ہے جس سے نہ صرف آپ محظوظ ہوں گے بلکہ محسوس بھی کریں گے، کل ملا کے یہ ہے کہ 'لمحے لمحے' کا نمبر مدھو ریما سنگھ کی پوری شاعری اور شخصیت کا آئینہ دار ہے، جس پر انہیں اور حسیب سوز کو مبارکباد۔

☆

''سبز آتش''

رونق شہری

ناشر : رنگ پبلی کیشنز، دھنباد

مبصر : سیفی سرونجی

رونق شہری نئی غزل کے ایسے سنجیدہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اردو غزل میں اپنے لہجے اور انفرادیت کی چھاپ ان کے دیگر ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ پائداری کے ساتھ قائم کی ہے۔ ان کی غزل میں جہاں نئے نئے الفاظ سے ایک نیا فکری جہان روشن ہے وہیں روایت کی پاسداری بھی ہے۔ غزل کو نیا کچھ دیا ہی ہے اور سنجیدہ ادبی حلقوں کو متاثر بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے متعلق شمس الرحمن فاروقی، منصور سبزواری، بشر نواز، مظہر امام، انور سدید، غیاث احمد

گدی، جیسی شخصیات نے اپنی قیمتی آراء سے نوازا ہے، شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''رونق شہری کے کلام کی جس خصوصیت نے مجھے سب سے پہلے متاثر کیا وہ یہ ہے کہ وہ جری اور جگر دار شاعروں کی طرح نئی تراکیب، نئے الفاظ اور غزل کے لیے نئی امیجری کی تلاش میں بہت دور نکل جاتے ہیں، وہ زبان کے امکانات کو بے خوفی سے برتنا جانتے ہیں اور گرد و پیش کی زندگی جو شعر کے لئے بنجر زمین کی حیثیت رکھتی ہے وہاں بھی اپنی کج کاویوں سے بے کیف اور بے رنگ یا تکلیف دہ اور دکھ بھرے لمحوں کو شگفتہ شعروں میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔''

'سبز آتش' میں شمس الرحمٰن فاروقی اور دیگر قلم کاروں کی رائے کے علاوہ پروفیسر علیم اللہ حالی کا بھرپور دیباچہ بھی شامل ہے۔ رونق شہری نے اپنا یہ شعری مجموعہ بھرپور اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے اور بہت کہنے کے باوجود انتخاب سخت کیا ہے ان کے یہاں احتیاط بہت ہے۔ چند شعر دیکھئے:

مصروف ہم مطالعۂ فطرت میں رہتے ہیں
دن بھر کسی فقیر کی صحبت میں رہتے ہیں
جلتے دیے کی لو ہی نہیں حادثے کی وجہ
بجھتے ہوئے چراغ بھی طاقت میں رہتے ہیں

☆

ہم گھنے رشتوں کے جنگل میں بھٹکنے والے
کون سے پیڑ کا ممنوع ہے پھل جانتے ہیں

☆

عجب پیاس کے دریائے نیل چھوڑ گئے
پرند موسم گل میں ہی جھیل چھوڑ گئے

☆

میرے کمرے میں ٹھہرے گی بے گھر شام
لمحہ لمحہ پھر بدلے گی تیور شام
رونق بہتر تھا کہ دھرتی پھٹ جاتی
روشن رخ پر بھی ڈالے گی چادر شام

☆

آگ مصروف ھے
مظفر حنفی

ناشر : مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی بھوپال

مبصر : سیفی سرونجی

ڈاکٹر مظفر حنفی کا نام ادبی دنیا میں ایک ایسا معتبر نام تسلیم کیا جاتا ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے کہ وہ ایک اچھے ادیب، نقاد تو ہیں ہی ساتھ میں اردو شاعری میں سب سے زیادہ کہنے والے شاعروں میں بھی ان کا واحد نام ہے۔ اکثر شاعری کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ شاعری شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے لیکن سو میں سے ایک شاعر ہوتا ہے جو اپنے لہجے اور اپنی شخصیت سے پہچانا جاتا ہے، ان شاعروں میں سب سے نمایاں نام ڈاکٹر مظفر حنفی کا ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ زیادہ کہتے ہیں وہ دس پندرہ سال کے بعد اپنے آپ کو دہرانے لگتے ہیں، یعنی ان کی تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور نئے الفاظ کے استعمال کو یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم نیا کہہ رہے ہیں جبکہ تخلیقی قوت برائے نام رہ جاتی ہے اور وہی پرانے خیالات کو نئے ڈھنگ سے کہنے لگتے ہیں لیکن ڈاکٹر مظفر حنفی وہ واحد شاعر ہیں کہ ان کی ہر غزل میں نیا خیال اور نئی آب و تاب ہوتی ہے اور تعریف کی بات یہ ہے کہ انہیں اس فن میں اتنی مہارت ہو گئی ہے کہ اپنی پوری شخصیت کو ایک ایک لفظ سے واضح کر دیتے ہیں۔ شخصیت کا بھرپور اظہار اتنی قوت اور کمال فن نے انہیں اپنے تمام ہم عصروں سے نمایاں کر دیا ہے۔ اب تک شاعری کے درجنوں مجموعے پیش کرنے کے بعد ہزاروں اشعار کہنے کے بعد بھی ان کے قلم میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی بلکہ اور بھی تخلیقی توانائی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ یہ بات کسی شاعر میں آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ آگ مصروف ہے ان کا تازہ شعری مجموعہ ہے جسے مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے بہت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، یوں تو اس میں غزلوں سے زیادہ نظمیں ہیں لیکن جو بات، جو انفرادیت مظفر حنفی صاحب نے اپنی غزل میں پیدا کی ہے قاری ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی غزلیں پڑھنے پر مجبور ہوتا جاتا ہے، میں بھی ان کی غزل کا عاشق ہوں، ذرا ان کی غزلوں کے تیور دیکھئے اور یہ بھی دھیان میں رکھئے کہ آج سے چالیس پہلے بھی وہ انفرادیت کی وجہ سے ہی ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں اور آج بھی اسی تیکھے لہجے کی وجہ سے قاری پر چھائے رہتے ہیں۔

وہ مہرباں ہوا تو فضا ہی بدل گئی
صحرائے جاں کی آب و ہوا ہی بدل گئی
دریا تو بہہ رہے ہیں اسی آن بان سے

کشتی میں آکے موجِ بلا ہی بدل گئی
چیخ کی آواز تو گھونٹ دی آپ نے
عمر بھر کان میں چیخیں آتی رہیں
لوگ جھوٹوں پہ موتی لٹاتے رہے
کھوکھلی سیپیاں غم مناتی رہیں
ذہن میں لاوا سا پکتا ہے کچھ
دل میں ہر وقت کسکتا ہے کچھ
میری قسمت کا ستارا تو نہیں
وہ جو رہ رہ کے چمکتا ہے کچھ
بشر کے ہاتھ متاعِ عزیز آئی ہے
کئی ہزار برس میں تمیز آئی ہے
کھڑے ہیں دھوپ کے پرچم تلے در و دیوار
سمجھ رہے تھے محل میں کنیز آئی ہے

ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مظفر حنفی نے جس اعتماد کے ساتھ شاعری شروع کی تھی اسی اعتماد اور وقار کے ساتھ اپنی پوری زندگی شاعری کو سونپ دی اور غزل میں جو انفرادیت جو اضافہ انھوں نے اپنی لفظیات نئے قوافی نئے خیالات سے کیے ہیں اس کی تفصیل کے لیے تو سینکڑوں صفحات درکار ہوں گے جو اس مختصر تبصرے میں ممکن نہیں ہے۔ آگے مصروف ہے کے زراعنوان پر غور کیجیے اور پھر یہ اشعار دیکھیے:

اتنی نکیلی کرنوں سے ہر پودا جل جائے گا
لیکن دس بارہ گھنٹوں میں سورج بھی ڈھل جائے گا
یہاں تو جتنے برس گزارے عذاب یا احتیاط کے تھے
جو ہم سے کٹ کر نکل گئے ہیں وہ چار دن انبساط کے تھے
لہو کی اک بوند اے مظفر تھمی ہوئی نوکِ خار پر تھی
ادھر فنا گھات میں لگی تھی ادھر تقاضے حیات کے تھے
دھوپ نے کھیت [illegible]
غنی مرجھائی ہوئی [illegible]

اس طرح کے درجنوں اشعار اس مجموعے میں موجود ہیں جو ایک سچے بڑے اور بیباک شاعر کے اندر کی تخلیقی صلاحیتوں کے مظہر ہیں۔

☆

"ادھورے چہرے"

دیپک بُدکی

ضخامت : ۱۴۱ صفحات

قیمت : ایک سو روپے

ناشر : سندیپ بدکی، چنار پبلی کیشنز، جموں توی،

اشاعت : دوسرا ایڈیشن (پیپر بیک) ۲۰۰۵ء

مبصر : محمد ایوب واقف

دیپک بُدکی کا نام میرے لیے اور اردو کے دوسرے قارئین کے لیے نیا نہیں ہے۔ ان کی کہانیاں برسوں سے اردو اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان شائع شدہ کہانیوں میں سے چند کہانیاں تو یقیناً میری نظر سے گزری ہیں، لیکن گزشتہ مہینے جب انہوں نے اپنی کہانیوں کا مجموعہ "ادھورے چہرے" از راہِ خلوص و محبت مجھے ارسال کیا تو اس کتاب میں شامل ان کی انیس کہانیوں کو ایک ساتھ پڑھنے کا اور پھر ان کے بارے میں اپنی ناچیز رائے قائم کرنے کا موقع ملا۔ دیپک بدکی سائنس کے طالب علم رہے ہیں اس لیے انہیں اردو یا ہندی کو بحیثیت زبان کے کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے کا موقع میسر نہیں آیا لیکن اپنے فطری شوق کے سبب جب قلم و قرطاس سے رشتہ جوڑنے کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے اردو زبان سے رشتہ استوار کیا۔ اس صورت حال سے یہ بات پھر ثابت ہوتی ہے کہ اردو سرتا سر قومی یکجہتی اور پیار کی زبان ہے اور یہ کہ یہ جتنی مسلمانوں کی زبان ہے اتنی ہی ہمارے ہندو بھائیوں کی بھی ہے۔ غالب کے چہیتے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ سے لے کر ہمارے عہد کے کالیداس گپتا رضا اور گلزار دہلوی تک اردو کے ہندو شعراء و ادباء کا جو سلسلۂ خوشگوار قائم و دائم ہے جناب دیپک بدکی اس کی دلنواز اور خوبصورت کڑی ہیں۔ اردو زبان کو سیکھنے اور اسے سینے سے لگانے کی انہوں نے جو مثال قائم کی وہ ہر اعتبار سے قابلِ تعریف اور لائق صد احترام ہے۔

"ادھورے چہرے" کے افسانوں کے تعلق سے انہوں نے اپنے خصوصی دیباچے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے افسانوں کے موضوعات کا علم اگرچہ ہو جاتا ہے لیکن کسی افسانے کے مطالعے کا مقصد صرف یہ جاننا ہی نہیں ہوتا کہ افسانے میں کون سی بات بیان کی گئی ہے۔ یہ افسانہ نویسی

کے بہت سارے پہلوؤں میں سے ایک پہلو یقیناً ہوتا ہے لیکن اس کے دوسرے اور بھی بہت سے پہلو ہوتے ہیں، مثلاً افسانے کے پلاٹ کا تانا بانا کس ہوشیاری اور دور اندیشی سے تیار کیا گیا ہے، کہانی کے کرداروں کا مقصد کہانی میں صرف سیر و سیاحت اور گشت (Perambutation) کا ہے یا ان سے کہانی کی مقصدیت تک پہنچنے کا بھرپور کام لیا گیا ہے۔ کہانی اپنے آغاز سے ہولے ہولے جب کلائمکس تک پہنچتی ہے تو کہانی کا یہ پورا سفر قاری کے ذہن پر کسی طرح کا منفی ڈالتا ہے یا پھر قاری کے ذوق اور اس کی پسند کے عین مطابق ہے، آخر میں ایک افسانے کی سب سے اہم خوبی کا انحصار اس امر پر ہونا چاہیے کہ افسانے میں زبان کس درجے کی ہے، اگر زبان اپنے معیار کے تمام اصولوں کے ساتھ نہیں برتی گئی ہے تو یہ جان لیجیے کہ افسانہ اپنی تمام خوبیوں کو رکھنے کے باوجود قابل تعریف اور لائق اعتنا قرار نہیں پائے گا۔

دیپک بدکی کے جو افسانے ''ادھورے چہرے'' میں شامل ہیں ان کا مطالعہ اس بات کو بہ طریق احسن واضح کرتا ہے کہ یہ تمام افسانے کامیاب افسانہ نگاری کے عواقب اور عوامل سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ دراصل دیپک بدکی صاحب کا ذہن افسانہ نگاری کے لیے بہت موزوں واقع ہوا ہے اور اپنے موزوں اور مناسب ذہن سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے کامیاب افسانے لکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ محنتی اور جفاکش انسان بھی ہیں، ان کی اس فطرت نے انہیں اچھے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی کہانیوں اور ناولوں کے سنجیدہ مطالعہ پر اکسایا، یہی سنجیدہ مطالعہ ان کی عمدہ افسانہ نگاری کے لیے محرک (Stimulus) بن گیا۔ ان کی زبان بھی بہت عمدہ، دلکش اور نفیس ہے۔ ان کی عمدہ، سادہ اور شیریں زبان کا ایک نمونہ دیکھتے چلیں:

> ''اس روز ڈبیٹ سے واپس آکر شاید سلمیٰ میرے دل کی کیفیت بھانپ گئی تھی۔ وہ خود زندگی میں شکست و ریخت سے سمجھوتہ کر چکی تھی مگر میں! میں تو پہلی بار شکست کا سامنا کر رہا تھا جس کی خراش سے میں تلملا رہا تھا، جب دونوں کی یہ کیفیت ایک جیسی ہو تو ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کا جاگنا قدرتی عمل ہے۔'' (خودکشی، صفحہ نمبر ۷۳ پر)

چھوٹے چھوٹے اقتباسات میں بڑی بڑی باتیں پیش کر کے افسانوں کو کمال کی حدوں تک پہنچا دینے کے فن میں ماہر دیپک بدکی کو ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان سے دوسرے بہت سے خوبصورت افسانوں کی امید کرتے ہیں۔

☆

"اندھیرے اُجالے کے بیچ"

رفعت سروش

مبصر : عزیزہ بانو (الہ آباد یونیورسٹی)

رفعت سروش اصلاً شاعر ہیں، ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے افسانے اور ناول بھی لکھے ہیں، ریت کی دیوار شہر نگاراں وغیرہ ان کے اچھے ناولوں میں شمار ہوتے ہیں۔ شہر نگاراں میں انہوں نے بمبئی کی زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ 'اندھیرے اُجالے کے بیچ' رفعت سروش کا ایک اور مختصر سا ناول ہے جو چھوٹے چھوٹے ۱۹/ ابواب پر اور ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

ناول کا مرکزی کردار ساجد عباس ہے جو بمبئی کے کھار علاقہ میں کرایہ کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اپنی پھوپھی کے ساتھ رہتا ہے۔ ساجد عباس ایک ہونہار اور نوجوان صحافی ہے۔ ہفتہ وار کلام کا نائٹ ایڈیٹر ہے۔ ہونہار اور قابل ہونے کے ساتھ وہ ایک اُلجھے ہوئے ذہن کا مالک ہے اور اکثر و بیشتر اپنی ذہنی اُلجھن کے علاج کے لیے ڈاکٹر کچو بھائی پٹیل کے پاس جاتا رہتا ہے۔ جہاں وہ اپنی ذہنی اُلجھن کی گتھیوں کو سلجھاتا ہے۔

اس ناول کا دوسرا اہم کردار ذکیہ ناز کا ہے جو اپنی منفرد شخصیت بہن، شاعرہ، محبوبہ، بیوی اور دوست کی حیثیت سے ناول کے ایک بڑے حصے پر چھایا رہتا ہے۔

اس ناول کا مرکزی خیال محبت ہے، پوری ناول میں یہ خیال کہیں ماں سے محبت، کہیں ملک سے محبت، کہیں بہن سے محبت، کہیں تہذیب و ثقافت سے محبت اور کہیں فرض اور پیشے سے محبت اور کہیں دو متضاد جنس کی آپسی محبت کی شکل میں ہمیں ملتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ آزادئ ہند نے جہاں انگریزوں کی غلامی سے نجات دلائی وہیں تقسیم ہند نے نہ جانے کتنے گھروں کو اجڑنے، تباہ و برباد ہونے پر مجبور کیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی لوگوں کو ملک بدر ہونا پڑا، شر پسندوں نے خون کی ہولی کھیلی، معصوم و بے گناہ لوگوں کی لاشیں پامال کی گئیں۔ غرض انسانیت سوز طاقتوں نے ظلم و بربریت کا ایسا ننگا ناچ کھیلا کہ روح انسانی کانپ اٹھی۔ ایسے میں ایک معصوم جس نے لوگوں کی لاشیں دیکھی ہوں، چیخ و پکار، آہ و بکا سنی ہو اس کے ذہن میں ڈر و خوف کا بیٹھ جانا لازمی ہے۔ ساجد عباس نے ایسے ہی کسمپرسی کے حالات میں آنکھ کھولی، ساتھ ہی وہ ماں کی محبت اور اس کی آغوش سے بھی محروم رہا، نتیجتاً ساجد پراگندہ ذہن لے کر بڑا ہوتا ہے۔

محبتوں کا ترسا ہوا یہ شخص جب مسٹر شہاب الدین کے گھر ایک دعوت میں جاتا ہے تو ذکیہ کی

الدین جو کالج کے زمانے سے ہی شاعری کرتی تھیں، ان کی غزل کا یہ شعر

کھل جائیں جہاں فصلیں الفت کے گلابوں کی
صحرا مرے خوابوں کا وہ آب و ہوا مانگے

سن کر متاثر ہوتا ہے اور ہند و پاک رشتے پر فصلیں الفت کے گلابوں کی عنوان سے ایک بہت عمدہ مضمون سپرد قلم کرتا ہے۔ اس مضمون میں دونوں ملکوں کے سیاست دانوں پر طنز اور عوام کی امن پسندی اور محبت کی طرف اشارہ ملتا ہے، دراصل یہ خود ناول نگار کے اپنے خیالات ہیں جن کو ساجد کی زبانی کہلوایا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے قابل غور ہیں۔

''دونوں ملکوں کے عوام محبت کے خواہاں ہیں۔''

''جہاں بیلا، چنبیلی، گلاب اور موتیا کھلتے تھے وہاں بارود کی کاشت ہوتی ہے۔ اور نفرت کے پودوں پر انسانیت کو ہلاک کرنے والے بم کھلتے ہیں۔ برگ گل کی جگہ تیکھے خنجر نظر آتے ہیں، شاخ گل کی جگہ تلواریں چمکتی ہیں۔ آج جب سیاست نفرت کے کانٹے بو رہی ہے قلم کار اپنے لفظوں اور شعروں سے ماحول کو بدل دینا چاہتا ہے۔''

یہ جملے حالات حاضرہ کی ترجمانی تو کرتے ہی ہیں اس طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ سیاست داں اپنے مفاد کی خاطر ماحول کو خراب کر کے عوام کو آپس میں لڑواتے ہیں۔ لیکن قلم کار چاہے وہ ادیب ہو یا شاعر ان کی مخالفت کرتا ہے اور اپنے فن پاروں کے ذریعہ ماحول کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔

انڈو پاک کلچرل سوسائٹی کے ڈیلی گیٹس کے ساتھ جب ساجد پاکستان جاتا ہے تو اس کی ملاقات ذکیہ کی چھوٹی بہن ثریا سے ہوتی ہے، ثریا کا یہ جملہ بہن سے بے پناہ محبت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

''نہیں مگر ان (ماں) کے انتقال کے بعد آپا میرے لیے اماں، ابا، بھائی اور سب کچھ تھیں اور ہیں۔ خدا انھیں سلامت رکھے۔''

اور پھر جب ذکیہ کو پتا چلتا ہے کہ ساجد ثریا سے مل کر واپس آرہا ہے تو ان کی بے قراری اور بہن سے والہانہ لگاؤ بھی ملاحظہ ہو۔

''اے گل بہ تو خورسندم تو بوئے کسے داری

''کیسی ہے ثریا ریاض کیسے ہیں، تم ان سے مل کر آرہے ہو، میں کیوں نہ چلی گئی

تمہارے ساتھ، اس ڈیلی گیشن میں؟''

''ہائے میں ترس گئی اپنی پیاری بہن کو دیکھنے کے لیے۔''

''کتنا اچھا لگتا ہوگا وہ پیارا پیارا سا جیسا جیسی کبھی ثریا تھی۔''

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تمہیں لاہور میں ثریا ملے گی تو میں اس کے لیے ڈھیر سارے تحفے بھیجتی۔''

ڈیلی گیشن کے دوسرے ممبروں کے ساتھ ساجد بھی دہلی اور آگرہ گھومنے کی غرض سے دہلی رک گیا تھا۔ آثار قدیمہ جو ہماری ثقافتی دولت ہے، سے آج کے دور میں جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے اور جو بے پروائی برتی جا رہی ہے اور جدید تہذیب کے خلاف ساجد کے یہ جملے تہذیب و ثقافت سے محبت کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

> ''نئی دہلی کی بے ہنگم تعمیرات کے جنگل میں آثار قدیمہ بے وقعت ہو کر رہ گئے ہیں، نہ ان کے تحفظ کا کوئی اہتمام ہے، نہ ان کی شان و شوکت اور عظمت پارینہ کے نقوش اجاگر کرنے کا۔''
>
> یہ تو ایک بہت بڑی ثقافتی دولت ہے جو ہمارے بزرگ ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں، جدید تہذیب سب کچھ کر سکتی ہے مگر آثار قدیمہ نہیں مہیا کر سکتی۔''

مرزا شمس الدین ساجد کی شرافت، قابلیت، متانت و سنجیدگی اور کردار کی پختگی سے بے حد متاثر تھے اور اپنی بہن کی شادی ساجد کے ساتھ کرنے کے خواہش مند۔ شگفتہ جو آج کے تیز رفتار زمانہ کی لڑکی تھی اور زمانہ سے قدم ملا کر چلنا چاہتی تھی، اس کی آزاد خیالی و بے باکی کو ساجد نے پسند نہیں کیا، اس پر ڈھکے چھپے لفظوں میں ساجد کو شگفتہ سے شادی کر لینے کی بات کرنا مرزا صاحب سے متنفر کر دیتا ہے اور ساجد اچانک بمبئی کے لیے رخت سفر باندھ لیتا ہے لیکن شگفتہ مرزا کے یہ الفاظ:

> ''مجھے سست رفتار زندگی پسند نہیں، تیزی سے چلو تیزی سے سوچو، تیزی سے زندگی گزارو، کیا پتہ یہ کمبخت کب دھوکا دے جائے۔ ساجد صاحب دنیا میں ہر چیز کا بھروسہ کیا جا سکتا ہے مگر زندگی کا نہیں۔''

زندگی گزارنے سے متعلق شگفتہ مرزا کا یہ نظریہ ساجد کے ذہن کے کسی کونے میں محفوظ ہو جاتا ہے، ساجد اپنی دماغی الجھن کے علاج کے لیے، دوسرے تیسرے دن ڈاکٹر پٹیل سے ملنے جاتا ہے اور پھر ایک دن ساجد کی بنائی ہوئی پینٹ تصویروں کے ذریعہ جس ڈاکٹر پٹیل نے اس کے ذہن کی

الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے میں کامیابی حاصل کرلی۔

آزادیٔ ہند کے حالات، کشت وخون، لاشیں، آہ وفغاں، غریبی و بے بسی، ماں کی مجبوری و لاچاری جس کی وجہ سے نہ اسے ماں کی گود نصیب ہوئی ہے اور نہ پیٹ بھرنے کے لیے ماں کا دودھ اور نہ شفقت ومحبت، غرض یہ سب مل کر ساجد کو ایک نفسیاتی مریض بنا دیتے ہیں جس کو لڑکیاں نہیں عورتیں پسند ہیں اور وہ اس کا اعتراف بھی کرتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ ذکیہ شادی شدہ ہونے کے باوجود جب ساجد کی طرف جھکتی ہے اور اپنی زندگی کی دکھ بھری کہانی سناتی ہے تو ساجد کو ذکیہ سے ہمدردی ہو جاتی ہے اور وہ ذکیہ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، لیکن ڈاکٹر پٹیل سے ملنے اور ان کے سمجھانے کے بعد وہ اپنی ذہنی رو کو بھٹکنے سے روکنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اپنے کیریئر کی طرف سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ یکے بعد دیگرے مضامین کے مقبول ہونے سے اس کے قلم کو ایک نئی زندگی ملتی ہے اور وہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کے خلاف بے باک ہو کر مضامین لکھتا ہے۔

کامیابی کی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ برطانیہ اسکالرشپ پر جانے کی تیاری کرتا ہے۔ شگفتہ مرزا کی موت کی خبر سن کر وہ سکتہ میں آجاتا ہے اور زندگی سے بھرپور شگفتہ اس کی نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ زندگی کے متعلق اس کے خیالات ساجد کے ذہن میں گونجنے لگتے ہیں۔

اور سوٹ، آپ سمجھتے ہیں کس کے لیے ہے زندگی
بہت تیز رفتار ہے کیا پتہ پھر کبھی ملاقات ہی نہ ہو،

ساجد کی زبان سے نکلا ہوا یہ جملہ شگفتہ سے اس کی محبت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

''مگر ایک ہنستی کھیلتی پُر بہار اور شوخیوں سے بھری زندگی کا اچانک خاتمہ ہو گیا۔''

اور پھر ساجد اپنی محبت کا اقرار ان الفاظ میں کرتا ہے:

''اب اس کی اچانک موت کی خبر سن کر مجھے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ شاید میں اس سے محبت کرنے لگا تھا، کیا جوان موت ہوئی ہے، رخسانہ! تم اس سے ملتیں تو یقیناً پسند کرتیں۔''

اداس اور غمزدہ ساجد لندن جانے کے لیے اپنی تیاریاں مکمل کرتا ہے، جہاں ایک نئی زندگی اور روشن مستقبل اس کا استقبال کرتا ہے، اس کی اس کامیابی پر اس کے سبھی دوست بہت خوش تھے۔

تین اہم کرداروں ساجد، ذکیہ اور ڈاکٹر پٹیل کے علاوہ ضمنی کرداروں میں رخسانہ، ریاض، ثریا، مرزا شمس الدین اور شگفتہ مرزا، ان سب نے مل کر ناول کے لیے ایک گٹھا ہوا پلاٹ تیار کر دیا ہے۔ خاص طور سے شگفتہ مرزا کا کردار منفی کرداروں میں سب سے اہم کردار ثابت ہوتا ہے۔ جس نے ساجد کی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے اور جس کی موت نے ساجد کو محبت

جیسے پاکیزہ رشتے سے آشنا کیا۔

پورے ناول میں محبت کا یہ جذبہ اپنے الگ الگ رنگ میں کارفرما نظر آتا ہے۔ زبان آسان اور بیان میں روانی ہے لیکن کتابت کی غلطیاں پڑھنے میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں۔

علاوہ ازیں یہ ایک اچھا تاثراتی ناول ہے جو قاری کو باندھے رکھنے میں کامیاب ہے اور پڑھنے والا متجسس رہتا ہے کہ اب کیا ہوا۔ دوسروں تک محبت کا پیغام پہنچانا ہی ناول نگار کا اہم مقصد ہے اور اپنے اس مقصد میں ناول نگار کامیاب ہے۔

☆

"مخاطب آپ سے ہوں"

حفیظ انجم کریم نگری

مبصر : رؤف خیر

اگر کوئی اپنی کتاب کے سرنامے پر ہی یہ اعلان درج کردے کہ

کوہسارو ، درختو اور جھرنو — میں مخاطب ہوں آپ سے سنیے

تو قاری سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ شاعر انسانوں کے بجائے پہاڑوں، پیڑوں اور جوہڑوں سے آخر کیوں خطاب پسند کررہا ہے، ورڈز ورتھ کی طرح فطرت سے ہم کلامی کا مزہ یقیناً کچھ اور ہے لیکن حفیظ انجم کی تخلیقات کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ دوست نما دشمنوں اور مار آستیں جیسے عزیز و اقارب کے ہاتھوں تلخ تجربات کی وجہ سے حفیظ انجم کا تخاطب و ترجیحات بدل گئی ہیں۔

دوستی دشمنی میں بدلی ہے — زہر ایسا اگل گیا کوئی

جس کے ساتھ حسن سلوک کیا گیا تھا اس کا یہ عالم ہے کہ

احسان سارے بھول گیا اور کہہ گیا — دنیا کے مدرسے کی روایت ہے کیا کروں!

اور تو اور علمائے سوء کا نقش بھی حفیظ انجم نے خوب کھینچا ہے

آپ کیسے عالم ہیں آپ کی یہ فطرت ہے — آپ عیب بینوں میں آپ نکتہ چینوں میں

ابتداً حفیظ انجم سے ہر شخص نقاب اوڑھ کر ملتا ہے اور نقاب سرکتی ہے تو اصلی چہرہ نکل آتا ہے۔

ایسا بھی ایک دور تھا باہم خلوص تھا — ہر شخص آج دیکھئے موقع شناس ہے

عالم کے ساتھ ساتھ مرشد بنے پھرنے والوں کا یہ حال ہے

مرشد بغیر داڑھی ہیں پتلون کوٹ میں — دنیا کی ہر برائی کا سودا بھی سر میں ہے

انسانوں کی دنیا سے شاعر بیزار ہوکر شعر و سخن کی پناہ گاہوں میں ستانا چاہتا ہے۔

انسانوں سے بچ کر رہنا سیکھ ذرا　　زہریلے سانپ سے بڑھ کر کیا بولوں
دو غزلوں کے شاعر کا بھی دعویٰ ہے　　کوئی نہیں ہے میرے برابر کیا بولوں
چھت پر کھڑے مکان کے کہتا تھا اک بشر　　اے آسمان دیکھ میں کتنا بلند ہوں
مشکل سے بنا پایا ہوں چھوٹا سا گھروندہ　　احباب سے کیوں میرے یہ دیکھا نہیں جاتا

گویا حفیظ انجم کو شاعروں کی انانیت اور خودسری بھی کھلنے لگی۔

جو خوشبو لگا کر عفونت دبا دیں　　بھلا ایسے ذہنوں سے کیا بات ہوگی

''فارغ البالپ'' قسم کے شاعروں کا کھوکھلا پن بھی ان کا شعر چھپا نہیں پاتا۔

ہیں طبیعت میں بلا کی پستیاں　　شعر میں اونچائیوں کا تذکرہ

حفیظ انجم کے طنز کی کاٹ بہت تیز ہو جاتی ہے جب وہ ایسے کسی دوست کے حوالے سے ہوتی ہے۔

آپ غیبت مری نہیں کرتے　　دوست ہونے کا فائدہ کیا ہے

دوست احباب عزیز و اقارب کے علاوہ میزانِ عدالت پر نظر ڈالیں تو اس کا پاسنگ بھی حفیظ انجم کو دکھی کر دیتا ہے۔

یہاں ایمان بکتا ہے، یہاں فرمان بکتا ہے　　عدالت میں تھکی ہاری دلیلیں چیخ اٹھتی ہیں

ان حالات میں وہ ایک چبھتا ہوا سوال کرتے ہیں۔

ہوس کا ایک ہے سیلاب دنیا!　　مخالف سمت میں کب تک بہوں میں؟

یہی صورت حال انہیں انسانوں کے جال میں سکون سے باہر نکال لاتی ہے اور وہ درختوں، کوہساروں اور جھرنوں کی فطری خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ان سے گفتگو ہی میں سکون پاتے ہیں۔ وہ اپنا تعارف پیش کرتے ہیں۔

زمیں داروں کا بیٹا ہوں، زمینداری نہیں کرتا
کہیں پر نوکری کرتا ہوں، معیاری نہیں کرتا
مجھے کیوں کام سونپا جا رہا ہے بولیے حضرت
کسی کے گھر پہ جا کر میں دفعداری نہیں کرتا
کماتا ہوں، گنواتا ہوں، گنواتا ہوں کماتا ہوں
کبھی دولت جتانے کی سمجھداری نہیں کرتا
میں کوسوں دور رہتا ہوں، میں کوسوں دور رکھتا ہوں
میں ایسے ویسے لوگوں سے کبھی یاری نہیں کرتا

مرا ظاہر مرا باطن ہمیشہ ایک رہتا ہے
اداکاری نہیں آتی ، اداکاری نہیں کرتا

اور آخر میں وہ پھر ریاکاروں کے لیے لمحہ فکر چھوڑتے ہیں۔

تجھے اس دور کا انسان کیسے مان لیں انجم
ریاکاروں میں رہتا ہے ، ریاکاری نہیں کرتا

کریم نگر جیسے دور افتادہ مقام پر رہتے ہوئے بھی حفیظ انجم مختلف رسائل و جرائد کے وسیلے سے ادب سے جڑے رہتے ہیں۔ وہ نہ مفت خورے ہیں نہ مفت خواں ہیں، ماشاء اللہ صاحب حیثیت آدمی ہیں، S.T.O. کے معزز عہدے پر برسر خدمت رہے، کتابیں رسائل و جرائد خرید کر پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں۔

سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ تلگو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ذاتی دلچسپی لے کر اردو ادب سے ایم۔اے۔ بھی کیا اور اُردو میں شعر کہتے ہیں تو یہ نہیں لگتا کہ اُردو تہذیب سے نا آشنا ہیں۔ البتہ ان کی فکر پر تلگو کلچر اور زبان پر ہندی کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

دل کا ویرانہ مرا گلشن ہوا
آپ کا آنا منورنجن ہوا

دوست میرا جب سے وہ دشمن ہوا
اور بھی میرا منوبل بڑھ گیا

زہر نفرت کا پروسہ نہیں کرتے ہم لوگ
دوست تو دوست ہے دشمن بھی اگر گھر آئے

وہ تلنا کرنے لگا شاہ جہان سے اپنی
بنا کے چھوٹی سی کٹیا کہیں پہ نکڑ پر

ظاہر ہے کسی نکڑ پر کٹیا تو کسی طرح گوارا کرلی جاسکتی ہے لیکن شاہ جہاں سے تلنا کرنا کھلتا ہے، ہندی کے الفاظ اُردو کے حسن کو مجروح کرتے ہیں اور ان دنوں ٹی۔وی۔ اور فلموں کی سازش سے ایسی ایسی مضحکہ خیز اردو ہندی تراکیب عوام الناس کی زبانوں پر چڑھائی جارہی ہیں جن سے بچنے بچانے کی مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ میں آپ سے سہمت نہیں یا وہ شخص بھروسہ مند ہے جیسی زبان اردو کے خوش ذوق اصحاب کی سماعت پر بار گزرتی ہے، لیکن حفیظ انجم کی پہچان اردو شاعری میں ہندی کے الفاظ برتنے کا سلیقہ ہے۔ یہ ان کی مجبوری ہے اور خوبی بھی مگر جو لوگ اردو کا ذخیرہ الفاظ رکھتے ہیں انہیں یہ روش اپنانے کی ضرورت نہیں۔ جا و بے جا انگریزی اور ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں تو ہم اردو کے ساتھ ظلم کرتے ہیں، تلگو میڈیم کے تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے حفیظ انجم کے فکر و فن میں ہندو دیومالائی علائم اور قصے بھی پائے جاتے ہیں، رامائن اور مہابھارت کے قصوں کے پس منظر میں نئی نسل کے اردو پڑھنے والے ان کے اس پہلو سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں، اردو ادب میں یہ انوکھا انداز بھی ان کی پہچان ہے۔

آخر میں ایک اہم بات کہنا میں ضرور چاہوں گا کہ شعروادب کی منزلیں بڑی آسانی سے سر نہیں کی جاسکتیں، اس کے لیے بڑا ریاض چاہیے، یوں بھی اردو کا حسن اس کے سلیقہ اظہار میں پوشیدہ ہے۔ زبان و بیان پر دسترس، عروض سے آگہی کا دعویٰ کسی کو زیب نہیں دیتا، بے عیب تو اللہ کی ذات اور بے عیب اللہ کا کلام ہے۔

تو رام کا اوتار نہیں ہوسکتا ہے — تو کرشن سا معمار نہیں ہوسکتا
ہوسکتا ہے تو کنس بھی راون بھی مگر — انسان کا طرفدار نہیں ہوسکتا

اپنے بچوں کے قتل کے صدمے — کون سہتا ہے دیوکی کی طرح
ہر طرف ہے چھڑی مہابھارت — بھیشم لیتا ہے رائیگاں لکھنا!
ہے کرن کی اماں میں دریودھن — سخت مشکل ہے امتحاں لکھنا!
کرشن کے رن میں آنے آنے تک — کیا بچے گا یہ کارواں لکھنا!

بانسری کی انوبھوتی شبدوں میں ہے ناممکن! — آج بھی تو گوکل کی گوریاں ترستی ہیں
یہ مانگتی ہے اگنی پرکشا بھی مون بھی! — سیتا ہے یہ کبھی، کبھی مریم ہے زندگی!

حفیظ انجم نے کبھی اپنی عروض دانی کا مظاہرہ نہیں کیا اس لیے زبان و بیان کی بعض فروگزاشتیں در آئی ہیں جو نظر انداز کی جاسکتی ہیں۔ استادی کا دعویٰ کرکے اگر کوئی شعر کی قرأت صحیح نہیں کرپاتا ہے تو اس کی خبر لی جاسکتی ہے۔

حفیظ انجم کا ذخیرہ الفاظ قابل داد ہے۔ ان کی ادبی ٹکسال میں دینار شرعی اور ہندوستانی سکۂ رائج الوقت بین بین ڈھلتے ہیں۔ ان کے بیشتر اشعار اپنی جگہ ایک سیاسی، سماجی کہانی سناتے ہوئے معاشرے پر ان کی گہری نظر کی نشاندہی کرتے ہیں، جیسے:

ڈگریاں بیچ دوں گا رد ی میں — اب نہ بیٹھوں گا میں بھی بھوکا دیکھ
لٹا رہا ہے کمائی شراب خانے میں — وہ گھر میں بیٹھی ہے بیٹی جوان، بھول گیا
بوڑھا ہے مگر باپ کماتا ہے ابھی تک — تو کیسا جواں بیٹا ہے محنت نہیں ہوتی
میں تیری حویلی کا کوئی پیڑ نہیں ہوں — کیوں پھر بھی پنپتا ہوا دیکھا نہیں جاتا!

ایک صحابی کا انتقال ہوا اور کسی کی ایک چادر ان کی ذمہ باقی رہ گئی تھی تو رسول اکرمؐ ان کی نماز جنازہ پڑھانے سے رُک گئے، مگر ان دنوں سماج میں قرض حسنہ ادا کرنے میں لوگ جلدی نہیں کرتے۔ اس پر طنز ملاحظہ فرمائیے:

مقروض بن کے موت گوارا تو ہے مگر — کیوں قرض لے کے آج چکاتا نہیں کوئی

اور صاحب استطاعت لوگوں پر حفیظ انجم کا طنز بھی بڑا کاری ہے:

نہیں دیکھا تو بس اک گھر خدا کا　　　گنوادی عمر کیا کیا دیکھنے میں

حفیظ انجم کو زندہ رکھنے کے لیے ان کا یہ ایک شعر ہی کافی ہے۔

آج کا حال کررہا ہے رقم　　　مجھ میں جو فاہیان ہے بابا

☆

”دلِ ناداں“
انور شیخ

ناشر : ماڈرن پبلی کیشنز، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: سیفی سرونجی

دل ناداں انور شیخ کا تازہ سترھواں شعری مجموعہ ہے جو چار سو صفحات پر مشتمل ہے، جسے ماڈرن پبلی کیشنز کے مالک پریم گوپال متل نے ان کے دوسرے شعری مجموعوں کی طرح بہت خوبصورت اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ انور شیخ کے تمام شعری مجموعوں میں تین سو صفحات سے کم نہیں ہوتے اور یہ مجموعہ تو اور بھی خوبصورت اور چار سو صفحات پر مشتمل ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انور شیخ نے کس قدر تعداد میں اشعار کہے ہوں گے۔ آجکل ایک شعری مجموعہ بھی شائع ہوتا ہے تو مشکل سے ڈیڑھ سو صفحات کا ہوتا ہے۔ جبکہ انور شیخ کے سترہ شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں اور وہ بھی اتنے ضخیم ضخیم کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ یہی نہیں شاعری کے علاوہ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا ہر لمحہ شعروادب کی خدمت میں گزرتا ہے، تب کہیں جاکر وہ اتنے ضخیم ضخیم شعری مجموعے اور افسانوں کے مجموعے ادبی دنیا میں پیش کرتے ہیں۔ انور شیخ نے اردو شاعری کو اپنے خیالات اور نظریات سے اتنا مالا مال کیا ہے کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ دلِ ناداں میں ان کی غزلوں کے ساتھ نظمیں بھی شامل ہیں اور نظمیں بھی کوئی نثری نہیں کہ جن میں بحر و وزن سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا بلکہ پابند نظمیں ہیں۔ غزلوں کے مقابلے میں نظموں میں زندگی کے مختلف موضوعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہوں نے غزل کو غزل رہنے دیا ہے اور نظموں کو اپنے موضوعات کے حساب سے تخلیق کیا ہے یعنی جیسا کہ وہ غزل کے بارے میں اکثر کہتے رہتے ہیں کہ غزل صرف عشقیہ جذبات کے لیے ہے وہ اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

” شاعری کیا ہے؟ ایک ملکہ خداداد جس کی تعریف کرنا قیاس آرائی سے زیادہ

نہیں ہے، وہ گانٹھ ہے جو کھولنے سے اور گنجلک ہوتی ہے بایں ہمہ شاعری کی
نوعیت وہی ہے جو ایک راز کی ہوتی ہے جو جتنا گہرا ہوا سے جاننے کے لیے
دل اتنا ہی مچلتا ہے۔ شعریت تب پیدا ہوتی ہے جب شاعری کو دل سے جدا
کیے بغیر دماغ سے ہم آہنگ کیا جائے چونکہ شاعری صرف جذبات کی ہی
ترجمانی نہیں بلکہ حکمت کی بھی آئینہ دار ہے البتہ حکمت ایک گوہر کمیاب ہے،
اگر یہ وافر ہو جائے تو حکمت اور حماقت میں فرق باقی نہیں رہتا یہی وجہ ہے کہ
ہر شعر حکیمانہ نہیں ہوسکتا، البتہ یہ کیفیت جذباتی امتزاج کی بالا دستی سے پیدا کی
جاسکتی ہے اور اس کی جاذبیت ایسا نکھار بخشتی ہے جو پھولوں کی شبنمی موتیوں کی
آراستگی سے حاصل ہوتا ہے۔''

انور شیخ کی اس رائے کو پڑھنے کے بعد ان کی شاعری پڑھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ
جذبات نگاری میں اپنی مثال آپ ہیں اور شاعری کی روح کو سمجھتے ہیں۔ شاعری میں بنا جذبات کے
ایک خشک اور الفاظ کی بھرمار کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا، یہی وجہ ہے کہ انور شیخ نے اپنی پوری شاعری کو
جذبات کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔

مجھے جب یاد آتے ہو میں خود کو بھول جاتا ہوں
اگر تم مسکراتے ہو میں خود کو بھول جاتا ہوں
طریقہ ہوگیا معلوم دلبر تم سے بچنے کا
مجھے جب بھی ستاتے ہو میں خود کو بھول جاتا ہوں

☆

یاروں کا کیا کروں گلہ دنیا عجیب ہے
بدلہ وفا کا ہے جفا دنیا عجیب ہے
ڈرتا ہے زندگی سے جو آگے نہ بڑھ سکے
جانے کہاں وہ ہم رہو دور شباب ہے
ممکن نہیں ہے جیتنا یہ زندگی کی دوڑ
کچھوا نہ بن کہ تیزرو دور شباب ہے
لڑنا جھگڑنا ہر گھڑی کار فضول ہے
یہ زندگی سے ہے جفا اب جی کے دیکھیے

اخلاص ذوق دوستی جذب وفا خوشی

سب سے بڑی یہی دوا اب جی کے دیکھیے

پیار کی منزل پہ پہنچا جو سفر پر چل پڑا

گرچہ تھا وہ سست رو کیا پیار کرنا جرم ہے

انور شیخ کی پوری شاعری میں عشق ومحبت وفا خلوص وفا ملن جدائی ہجر کی کیفیت ملک کی خوشی محبوب سے چھیڑ چھاڑ محبوب سے مذاق، سب کچھ موجود ہے، اب جبکہ سائنسی دور میں عشق ومحبت کے لیے آدمی کو فرصت نہیں لیکن بات طے ہے کہ انور شیخ کی شاعری پڑھ کر ایسے لوگ بھی عشق کرنے پر مجبور ہو جائیں گے جنھیں عشق کی فرصت نہیں ہے، صحیح معنوں میں انور شیخ کے پاس زندگی جینے کا ہنر ہے جس حوصلہ اور زندہ دلی سے وہ اپنی زندگی گزارتے ہیں اپنے پڑھنے والوں کو بھی اپنی خوشیوں میں شریک کرنا چاہتے ہیں انہیں بھی زندگی جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں، پروفیسر احتشام اختر لکھتے ہیں:

''انور شیخ بچپن سے ہی عاشق مزاج اور حسن پرست رہے ہیں انور شیخ کے معاشقوں کا ذکر مظفر حسن عالی نے تفصیل سے کیا ہے، خود انور شیخ نے بھی اس پر روشنی ڈالی ہے، انور شیخ غزل کی پرانی تعریف کے بھی حمایتی ہیں کہ غزل عورتوں سے باتیں کرنے کا نام ہے، رومانی شاعری کا مرکز وہ عورت کو سمجھتے ہیں، بقول ان کے رومانی شاعری کی اصل کشش عورت ہے حسن وعشق کی رنگینیاں اور رعنائیاں ان کی غزلوں میں بکھری پڑی ہیں، حسن وعشق کا لذیذ اور لطیف موضوع اور منفرد اسلوب ان کی پہچان ہے۔ انور شیخ کے دلنشیں اور منفرد اسلوب بیان نے ان کی شاعری کو پُر اثر اور فکر انگیز بنا دیا ہے۔''

انور شیخ کے اب تک سترہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور وہ بھی اتنے ضخیم ضخیم کہ اب تک اتنی بڑی تعداد میں شاید ہی کسی کے مجموعے شائع ہوئے ہوں اور یہی نہیں کوئی غزل آٹھ دس شعر سے کم کی نہیں ہوتی ہے اور ہر غزل میں عشقیہ جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے، جیسی انور شیخ کی شخصیت جیسا کہ ان کا عاشقانہ مزاج ہے ان کی غزل ان کی پوری شخصیت اور مزاج کی آئینہ دار ہے، دلِ ناداں کی شاعری میں ہمیں ایک شاعر ہی سے ہی نہیں ایک ایسے عاشق سے ملاقات ہوتی ہے جس کے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو عشق ومحبت کے جذبات سے سرشار ہے اور یہ شاعری ایک ایسے ہی زندہ دل شاعر کی شاعری ہے۔

چلوں سر اٹھا کر ہمیشہ ہی میں تو

بنے تم خدا ہو رہوں چپ میں کب تک
نہ دو دوش قسمت کو اپنی خطا کا
کہ خود بے نوا ہوں رہوں چپ میں کب تک
یہ کیسی زندگی والا ولی ہوں میں نہ پاپی ہوں
کبھی ماشہ کبھی تولہ ولی ہوں میں نہ پاپی ہوں
کبھی مان جائے گا ابھی نادان ہے ظالم
ہمیشہ من کو بہلاؤں ارے یہ دل کی باتیں ہیں
وہ ایک پتھر کی مورت ہے جسے ذکر محبت تو
نہیں ہرگز ہی راس آتا اگر چہرا جواں تو کیا
کیا تم نے رسوا کہو اب کیا ارادہ ہے
ہمارا ہر گلی کوچہ کہو اب کیا ارادہ ہے
اشاروں سے رکرو باتیں یہ گمراہی نہیں تو کیا ؟
کبھی تو کھل کے بھی بتلا کہو اب کیا ارادہ ہے
قصہ بڑا ہے مختصر ہم کو بھی آزمایئے
کہنا یہ ان سے نامہ بر ہم کو بھی آزمایئے
یہ کیا ممکن نہیں خالق بناوے آدمی اس کو
بظاہر جو لگے انساں مرا سب سے بڑا ارماں

انور شیخ کی شاعری میں زبان و بیان کے عیب پر نظر نہ ڈالی جائے تو یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جہاں جذبات ہوتے ہیں وہاں جذبات کا بہاؤ اتنا تیز اور رواں ہوتا ہے کہ کبھی شعلے اگلنے لگتے ہیں کبھی محبت کی برسات ہونے لگتی ہے، یہ طوفان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور شاعر پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ بس شعروں کی آمد اسی طرح ہوتی ہے جیسے وہ نازل ہو رہے ہوں، ایسی شاعری میں زبان و بیان کے عیب نہیں دیکھے جاتے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو کیفیت شاعر پر طاری ہے وہ پڑھنے والوں پر طاری ہوئی یا نہیں اور انور شیخ کی شاعری پڑھنے پر مردہ دل بھی اپنے ماضی میں اس طرح کھو جاتے ہیں گویا کہ سامنے محبوب ہے اور اس سے گفتگو کی جارہی ہو۔ ایسی شاعری ایک طرح ہمیں جینے کا حوصلہ بخشتی ہے اور جینے کا سلیقہ بھی۔ ڈاکٹر منصور عمر لکھتے ہیں:

''انور شیخ نے جن موضوعات پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی ہے وہ آفاقی اہمیت

کے حامل ہیں، ان کی شاعری میں جینے کا ایک عزم ہے، ولولہ ہے بلند حوصلگی ہے اور عالی ہمتی ہے، ہم جانتے ہیں کہ ان اوصاف کے بغیر کوئی بھی مسافت طے نہیں کی جا سکتی، انور شیخ اگر ان اوصاف سے بہرہ ور نہ ہوتے تو برِ صغیر ہند و پاک سے براعظم یورپ تک کا طویل سفر طے نہیں کر پاتے اور پھر غریب الوطنی میں اپنی تہذیبی زبان وادب کی آبیاری کر کے اسے آفاقیت نہ عطا کرتے۔"

انور شیخ کی شاعری سے متعلق میں نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی تصدیق میں معتبر لکھنے والوں کی رائے بھی شامل کر رہا ہوں تا کہ قاری ان کی شاعری سے متعلق کوئی ذہنی الجھن محسوس نہ کرے اور یہ بھی خیال نہ کرے کہ کسی ایک لکھنے والے کی رائے اس پر تھوپی جارہی ہے بلکہ دیگر بڑے اہم قلم کاروں کی رائے پیش کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو، جب درجنوں بڑے لکھنے والے ان کی شاعری کی طرف نہ صرف توجہ دے رہے ہیں بلکہ ان پر کتابیں شائع کر رہے ہیں ان کی شاعری پر بے شمار مضامین لکھ رہے ہیں، کئی ادبی رسائل ان پر خصوصی نمبر نکال چکے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ایک شعری مجموعہ پر لکھنے کا سلسلہ بند نہیں ہو پاتا کہ اسی درمیان چار سو صفحات پر مشتمل ان کا نیا شعری مجموعہ آ جاتا ہے۔ ابھی صدائے دل، بہارِ دل، ادائے دل اور دیگر شعری مجموعوں پر لکھنے کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اچانک چار سو صفحات پر مشتمل ان کا سترھواں شعری مجموعہ 'دلِ ناداں' بہت خوبصورت تصاویر، ٹائٹل اور گیٹ اپ کے ساتھ منظر عام پر آ گیا۔ ہماری گفتگو ان کے اسی تازہ شعری مجموعہ دل ناداں سے متعلق کی جارہی ہے جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس ضخیم شعری مجموعہ دل ناداں میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی شامل ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظموں میں بہت زیادہ جان ہے لیکن ان کی نظموں سے متعلق ہم الگ سے مضمون میں ذکر کریں گے، ابھی صرف ان کی غزلیہ شاعری پر گفتگو کی جارہی ہے۔ اس سے پہلے کہ دل ناداں پر آگے گفتگو کی جائے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

سمجھ نہ ہم کو بے نوا عاشق ہوئے تو کیا
اپنا تھا جو بھی بے لیا عاشق ہوئے تو کیا
نظریں جما کے دیکھنا تم کو گناہ تھا
جو ایسے ہوگئے خفا عاشق ہوئے تو کیا

☆

سب سے بڑی سزا ہے داغ فراقِ یار

اک سوز کربلا ہے داغ فراق یار
سنتا نہیں کوئی بھی دنیا کو کیا ہوا ہے
یہ دل کی اک صدا ہے داغ فراق یار

☆

ہوں منتظر کبھی کا یہ انتظار کب تک
میں تو گیا ہوں اکتا یہ انتظار کب تک
مدت سے گا رہا ہوں میں چاہتوں کے نغمے
کوئی نہیں ہوں باجا یہ انتظار کب تک

☆

دنیا مری جواں ہے یہ کس نے راگ چھیڑا
ہائے تو اب کہاں ہے یہ کس نے راگ چھیڑا
اس سے کہوں میں کچھ بھی کرتا ہے وہ منادی
نادان راز داں ہے یہ کس نے راگ چھیڑا
ہر گھڑی صبر آزما شاید کہ کچھ ہونے کو ہے
دل کہے یہ مہ لقا شاید کہ کچھ ہونے کو ہے
یہ جیون اک ظرافت ہے کبھی خنداں کبھی گریاں
یہ لگتا ہے شرارت ہے کبھی خنداں کبھی گریاں

انور شیخ کی شاعری میں دل سے نکلی ہوئی تمام کیفیات خوشی غم جدائی وصال کے ساتھ ساتھ نئے قوافی اور نئے نئے الفاظ نے ایسے رنگ بھر دیے ہیں جو کئی سمتوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ محبت کے ہزاروں رنگ سے بجی یہ شاعری دلوں کو گدگداتی ہوئی سیدھے دماغوں میں ایک تازگی بھرتی ہے جس سے ذہن و دل میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور پوری شاعری میں وہ صرف عورت سے مخاطب ہیں، بغیر عورت کے تصور کے ان کی شاعری سے لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا، اس لیے کہ وہ شاعری کو ہی عورت سے بات چیت کرنے کے معنی میں لیتے ہیں اور پوری شاعری کا انحصار عورت پر ہے، اس سلسلے میں ڈاکٹر یونس اگاسکر لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ انور شیخ کی تخلیقات میں صنف نازک اور حسن و قبح کے بیان کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اور صنفی تعلقات و معاملات کا ذکر ان کی شعری

ونثری کاوشات میں جابجا نظر آتا ہے مگر جس طرح منٹو کے ہاں بنیادی
موضوع عورت اور جنس ہوتے ہوئے بھی وہ ایک جنس نگار نہیں ہے اسی طرح
انور شیخ بھی محض لذت پرست اور جنس کے عکاس فنکار ہیں وہ مغرب و مشرق
میں بسی ہوئی برصغیر کی عورت کے نبض شناس، اس کے حسن کے پرستار اور
مظلومیت کے غمخوار ہیں، وہ عورت مرد کی ہم کار غم گسار دیکھنا چاہتے ہیں مگر ان
کے سامنے عورت کا جو روپ آتا ہے وہ مرد کی ہوس اور استحصال کے نتیجے میں
پیدا ہونے والی ایک کموڈٹی کا ہے۔"

انور شیخ کی شاعری ہو یا افسانہ نگاری ان کا موضوع زیادہ تر عورت ہی ہے اور شاعری میں وہ محبوبہ کا روپ اختیار کر لیتی ہے، افسانوں میں وہ ایک مظلوم ماں، بہن اور بیوی کا روپ اختیار کر لیتی ہے، غرض کہ ان کی شاعری میں جتنے بھی رنگ ہیں وہ اس دنیا میں رہنے والی عورت سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اور ہر رنگ ایک نئی فضا، نئی ادا اور نئے روپ میں عورت دکھائی دیتی ہے اور یہی ہماری اردو شاعری کا بنیادی وصف ہے۔

☆

"شاعر"

افتخار امام صدیقی

قیمت : پندرہ روپے فی شمارہ

مبصر : محمد متین ندوی

ماہنامہ شاعر ایسا ہر دلعزیز رسالہ ہے کہ بے چینی کے ساتھ ہر ماہ اس کا انتظار کیا جاتا ہے، ہر ماہ صحیح وقت پر اشاعت کے تمام مراحل طے کرتے ہوئے شاعر نواز عالمی اردو قلم کاروں اور قارئین تک پہنچتا بھی ہے، اس نے ہند و بیرون ہند کے بہت سے قلم کاروں کو ادبی دنیا سے متعارف کرایا ہے، ان متعارف ہونے والوں میں بڑی تعداد میں ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر "شاعر" انہیں مواقع نہ فراہم کرتا تو شاید وہ اپنی پہچان بنانے میں کامیاب نہ ہوتے۔ شاعر کا ہر شمارہ اپنے اندر کچھ کچھ نیا پن ضرور رکھتا ہے، شاعر کے عام شمارے میں جو گوشہ موجود ہوتا ہے وہ اردو کے عام رسائل کے خصوصی نمبروں پر افادیت کے لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے اگر چہ گوشہ مختصر ہوتا ہے مگر جامع ہوتا ہے، گوشہ کا مختصر و جامع ہونا اور سرورق کے پورے صفحہ پر صاحب گوشہ کی تصویر کا موجود ہونا ہی گوشہ کی کامیابی ہے۔ ادبی فیچر والا کالم تو مجھے کچھ زیادہ ہی پسند ہے، بقیہ شعری و نثری تحریریں جو دیگر کالموں کے تحت ہوتی ہیں وہ بھی

اچھی ہوتی ہیں۔ فی الحال میرے سامنے ستمبر ۲۰۰۶ء کا شمارہ ہے جس کے متعلق اختصار کے ساتھ عرض کرنا ہے۔ زیر تبصرہ شمارہ ایک تجرباتی شمارہ ہے، ''کل، آج اور کل'' کے نئے اور کامیاب سلسلے کے تحت جن قلم کاروں کو شامل کیا گیا ہے ان پر خانوادۂ علامہ سیماب اکبرآبادی کے مایۂ ناز شاعر و ایڈیٹر افتخار امام صدیقی صاحب نے اختصار کے ساتھ خود بھی لکھا ہے اور ان کے متعلق قلم کاروں کی آراء بھی پیش کی ہیں اور ساتھ ہی تخلیقات کے نمونے بھی۔ افتخار امام صدیقی صاحب نے مختصر تو بہر حال لکھا ہے لیکن ہر ایک کا تعارف اور اس کی ادبی شخصیت و تحریروں کا تجزیہ بھی بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ شاعر کا یہ شمارہ صرف تجرباتی نہیں بلکہ تجزیاتی بھی ہے۔ افتخار امام صدیقی صاحب کی تحریر سے معلوم ہوا کہ وہ ۲۰۰۷ء میں شاعر کے تجزیاتی اور خاص نمبروں کا سلسلہ شروع کرنے والے ہیں، اس سلسلہ میں عرض کرنا یہ ہے کہ خاص نمبروں کے جہاں بہت سے فوائد ہیں وہیں کچھ نقصانات بھی ہیں، جیسے کہ اگر شخصی نمبر شائع ہوا تو عام شاعر نواز اور عام قاری کی دلچسپی کا سامان اس کے اندر موجود نہیں ہوتا، اگر چہ نمبر ریکارڈ میں رکھے جاتے ہیں، لائبریریوں کی زینت بنتے ہیں، وہ پڑھے بہت کم جاتے ہیں لیکن پی. ایچ. ڈی. کرنے والوں کے بہت کام آتے ہیں۔ اس تجزیاتی شمارے میں جو شاعر و ادیب شامل ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ امتیاز فاطمی، جاوید ندیم، بشیر مالیر کوٹلہ، رشید شیخ، فاروق راہب، سرفراز شاکر، رونق جمال، نور محمد یاس، فہیم اختر، سیفی سرونجی۔ شاعر کا یہ تجزیاتی شمارہ منفرد اور پسندیدہ شمارہ ہے۔ یہ اتنے سلیقہ سے نکالا گیا ہے کہ اس کی تعریف سے گریز کرنا بددیانتی ہے، شاعر اپنی اشاعت کے ۷۷ ویں سال میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ نکل رہا ہے۔ یہ خانوادۂ سیماب کی قربانی اور شاعر کی مقبولیت نہیں تو اور کیا ہے؟

میں اس خصوصی تجزیاتی شمارہ کی اشاعت پر افتخار امام صدیقی صاحب اور ناظر نعمان صدیقی و حامد اقبال صدیقی کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

☆☆

ادبی خبریں

اردو جنوبی ایشیاء کے رابطہ کی زبان ہی نہیں، ہماری صدیوں کی گنگا جمنی روایات کی امین بھی

(ڈاکٹر نارنگ)

صدر ساہتیہ اکادمی کے استقبالیہ میں ایوب واقف اور کوثر صدیقی کی کتابوں کا اجراء

بھوپال ۲۷/اگست (نمائندہ خصوصی) ساہتیہ اکادیمی نئی دہلی کے صدر نشین اور اردو کے معتبر محقق و ادیب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے یہاں کہا کہ تاج محل کو فن تعمیر کا کرشمہ مانا جاتا ہے لیکن میں اردو کو ہندوستانی زبانوں کا تاج محل سمجھتا ہوں اور اس زبان کی لذت کو اپنے خون میں دوڑتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ یہ زبان جنوبی ایشیا کے ممالک کے رابطہ کی زبان ہی نہیں ہماری صدیوں کی گنگا جمنی روایات کی امین بھی ہے۔ اس کے بغیر ہم گونگے بہرے اور بے ادب ہو جائیں گے۔

اردو کی ۶۴ کتابوں کے مصنف اور پدم بھوشن سے اعزاز یافتہ ڈاکٹر نارنگ گزشتہ شب ''دبستان بھوپال'' اور سہ ماہی ''کاروانِ ادب'' کے استقبالیہ کے جواب میں ان خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ انہوں نے اردو کو ایک طرز حیات اور انداز فکر قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اس زبان کی دوسری مثال برصغیر کی ۲۴ زبانوں میں نہیں ملتی اور کسر نفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اردو کو کچھ نہیں دیا اور اس سے بہت کچھ لے لیا ہے۔ گجرال صاحب نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ کیا سیکولرازم کے بغیر ہندوستان زندہ رہ سکتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اردو جیسی سیکولر زبان کے بغیر اس ملک کی ثقافتی رونق برقرار نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے محبانِ اردو سے اپنی زبان اور اپنے اوپر اعتماد کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اس گنگا جمنی زبان پر اپنے فخر کے جذبے کو کبھی کمزور نہ ہونے دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید کہا کہ جس زبان میں گیان سنگھ شاطر اور کالی داس گپتا رضا جیسے اردو کے بے لوث خدمت گار ہوں بھلا وہ کیسے مر سکتی ہے۔ یہ خالص ہندوستانی زبان ہے۔ تقسیم کے وقت یہ پاکستان کے کسی ضلع و تحصیل کی زبان نہیں تھی۔ اس کا اپنانا وہاں کے حکمرانوں کی مجبوری تھی کیونکہ اردو سے زیادہ رواں اور خوبصورت زبان پاکستان میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اگر خدانخواستہ ہندوستان میں اردو کا خاتمہ ہو گیا تو پاکستان میں بھی یہ زبان باقی نہیں رہے گی۔ وہاں کے ہر بڑے شاعر و ادیب کو رِگنگ نیشن (شناخت نامہ) ہندوستان سے ہی ملتا ہے۔ انہوں نے اردو زبان کو ایک ایسے شجر سایہ دار سے تعبیر کا جس کی شاخیں ہند و پاک میں مساوی طور پر سایہ فگن ہیں۔ نارنگ صاحب نے برصغیر کے نقشہ میں بھوپال کی لسانی و ادبی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ وہی شہر ہے جس نے ۲۰ ویں صدی کے اوائل

میں اردو دنیا کا دیوانِ غالب کا پہلا نسخہ فراہم کیا اور عبدالرحمٰن بجنوری نے یہاں بیٹھ کر جو مقدمہ لکھا اس کے پہلے جملہ نے غالبؔ کو موضوع گفتگو بنا دیا۔ دیوانِ غالب کا دوسرا نسخہ بھی اسی شہر سے دستیاب ہوا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بھوپال کا غالب اور اس کی زبان سے کیسا گہرا تعلق ہے۔ اسی طرح اقبال سے اس شہر کا ناقابل فراموش رشتہ ہے۔

ڈاکٹر نارنگ نے استقبالیہ کے محرکین کوثر صدیقی اور جاوید یزدانی کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ایک موثر ادبی محفل سجائی اور صدارت کے لیے ریاستی اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر بشیر بدر کی موجودگی پر گہری طمانیت ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ بشیر بدر صاحب بھوپال میں ہیں تو وہ یقیناً ساہتیہ اکادیمی کے پروگرام میں انہیں لانے کی کوشش کرتے۔ نارنگ صاحب نے بشیر بدر سے اپنے دیرینہ تعلق اور اس کے سرد وگرم پر بھی لطیف پیرایہ میں روشنی ڈالی اور کہا کہ آج ہمارے درمیان ایسا شاعر موجود ہے جو خدائے سخن میر کی ہمسری کا دعویدار ہے، انہوں نے ایوب واقف صاحب کے تئیں خصوصیت سے ممنونیت کا اظہار کیا کہ موصوف نے ان پر محبت بھرا مضمون لکھا تھا جسے پڑھ کر احساس ہوا کہ نارنگ صاحب نے ایسے محبت کرنے والے بھی پیدا کر لیے ہیں جو کام اور لگن کا اعتراف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ نے تقریر کے آخر میں واضح کیا کہ وہ کسی سیاسی پارٹی کے کارڈ ہولڈر کبھی نہیں رہے اور آزادیٔ فکر کو قلم کار کے لیے مقدم سمجھتے ہیں۔ اور ایسے ہر دباؤ کا آج تک مقابلہ کرتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر بشیر بدر کے صدارتی کلمات میں جہاں نارنگ صاحب سے اپنے پچاس سالہ رشتہ کا اظہار تھا وہیں مدتوں بعد ملاقات کا گلا وشکوہ بھی۔ انہوں نے نارنگ صاحب کی فرمائش پر اپنے کچھ شعر بھی سنائے۔ قبل ازیں تقریب کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے نارنگ صاحب اور مہمانِ ذی وقار کی حیثیت سے محمد ایوب واقف صاحب کو میزبانوں کی جانب سے سپاس نامہ نسیم انصاری نے پڑھا اور شال پوشی وگل پوشی کے ساتھ اُن کا استقبال ہوا۔ بعد میں ایوب واقف صاحب کی کتاب ''شعور و ادراک'' اور کوثر صدیقی کی کتاب ''بیچاری اردو'' کا اجراء نارنگ صاحب نے فرمایا۔ دونوں کتابوں کے مصنفوں کو موصوف نے مبارکباد دی۔ خاص طور پر کوثر صدیقی کی کتاب کے بعض حصے پڑھ کر سنائے اور اس کے نام سے عدم اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ''اردو بیچاری نہیں، ایک طاقتور زبان ہے۔ اس موقع پر رضیہ حامد نے ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کچھ یادیں کچھ باتیں'' کے زیرعنوان ایک مضمون پڑھا جس میں جامعہ ملیہ کے صدر شعبہ اردو، مشفق استاد اور ادبی ولسانی سرگرمیوں کے روح رواں کی حیثیت سے نارنگ صاحب کی شخصیت وخدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ ڈاکٹر سید حامد اور ابرار نغمی نے شعری نذرانہ پیش کیا۔ اسی دوران اردو کی بزرگ ادیبہ ڈاکٹر شفیقہ فرحت کا عمر کے ۷۵ سال مکمل

ہونے پر نارنگ صاحب نے گلدستہ پیش کر کے استقبال کیا۔ پروگرام کی نظامت نہایت سلیقہ کے ساتھ مزاح نگار اور شاعر نسیم انصاری نے انجام دی اور مہمانوں کا تعارف بھی کرایا۔ ابتدا میں ایوب واقف اور غضنفر علی صاحبان نے بھوپال اور اہل بھوپال کے بارے میں اپنے جذبات محبت وخلوص کا اظہار کیا۔ بعد ازاں شعری دور میں ڈاکٹر بشیر بدر، غضنفر علی، پرتھی پال سنگھ بیتاب، جینت پرمار، پیغام آفاقی عالم خورشید، جمال اویسی اور شکیل اعظمی نے اپنے منتخب اشعار سامعین کے نذر کیے۔ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے خواتین وحضرات بڑی تعداد میں موجود تھے۔

سرونج میں محمد ایوب واقف کا استقبال

گزشتہ دنوں ممبئی سے مشہور ادیب محقق محمد ایوب واقف کی سرونج آمد پر ایک شاندار ادبی جلسہ سہ ماہی انتساب اور سد بھاؤنا منچ کی طرف سے کیا گیا جس میں بھوپال سے مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی کی سکریٹری اقبال مسعود، نظم کے مشہور شاعر نسیم انصاری، کاروانِ ادب کے ایڈیٹر کوثر صدیقی نے بھی شرکت کی۔ محمد ایوب واقف نے اپنی تقریر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تازہ علمی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ایک طرف گیان چند جین نے اردو اور مسلمانوں کے خلاف کتاب لکھ کر جو فضا خراب کی تھی اس کی تلافی پروفیسر گوپی چند نارنگ نے یہ کتاب لکھ کر کر دی اور یہ ثابت کر دیا کہ جب تک اردو زبان میں ایسے قد آور اور اردو کے جاں نثار گوپی چند نارنگ موجود ہیں اردو کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا، ایوب واقف صاحب نے سد بھاؤنا منچ کے صدر انل اگروال اور سیفی سرونجی کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہندی اور اردو دونوں زبانیں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور قومی یکجہتی کے فروغ کا واحد ذریعہ ہیں۔ اقبال مسعود اور نسیم انصاری صاحب نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا، اس شاندار جلسے میں سرونج کے تمام ہندی اردو کے اہل ذوق حضرات نے شرکت کی۔ سرونج کے بزرگ ادیب محمد توفیق خاں نے بیمار ہوتے ہوئے بھی اپنے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس کے بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ کی دستاویزی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' پر ایک مباحثہ کیا گیا جس میں محمد ایوب واقف، نسیم انصاری، اقبال مسعود، پروفیسر مختار شمیم، کوثر صدیقی، محمد توفیق خاں، سیفی سرونجی، محمد متین ندوی اور انل اگروال نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور نارنگ صاحب کی اس معرکۃ الآرا کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' کی اہمیت پر روشنی ڈالی، آخر میں سیفی سرونجی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں طالب عرفانی، سلیمان آزر کے علاوہ تمام مہمان شعرا کو بار بار سنا گیا۔

رپورٹ: انل اگروال

اردو کے عظیم و بے لوث خادم اور ممتاز نقاد پروفیسر عبدالمغنی کا انتقال

نئی دہلی، ۵ رستمبر ۲۰۰۶ء: یہ خبر اردو دوستوں پر آج بجلی بن کر گری کہ اردو کے مشہور نقاد اور پوری زندگی اردو کے فروغ اور آزاد ہندوستان میں اردو کے حقوق کے لیے ان تھک جدو جہد کرنے والے مرد مجاہد پروفیسر عبدالمغنی نے آج صبح عارضہ قلب میں پٹنہ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

ادارۂ ادب اسلامی ہند کے صدر ڈاکٹر سید عبدالباری اور جنرل سکریٹری انتظار نعیم نے اس حادثہ پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور ادب میں اعلیٰ اقدار و مقاصد کے حامیوں کے لیے اسے المناک قرار دیا ہے۔ وہ ایک عالم دین بھی تھے اور انگریزی کے ممتاز استاد۔ پٹنہ یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی میں مدت دراز تک خدمات انجام دینے کے بعد متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ایک طویل مدت تک انجمن ترقی اردو بہار کے صدر رہے اور مستقل انجمن کے دفتر میں شام کے وقت بیٹھتے اور اردو کے مسائل پر غور کرتے تھے۔ ان کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں بہار میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ حاصل ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج ملک کے تمام صوبوں میں اردو میں تعلیم و تعلم، تصنیف و تالیف وصحافت کے معاملہ میں بہار کی نئی نسل سب سے آگے ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی اردو کے ایک نامور نقاد تھے جنھوں نے درجنوں ضخیم کتابیں تصنیف کیں۔ علامہ اقبال کے وہ زبردست مداح تھے اور ان پر ضخیم کتب لکھیں۔ تنقید میں وہ تعمیری اعتدال پسند اور متوازن طرز فکر کے حامل تھے۔ پروفیسر عبدالمغنی کی ایک اور اہم حیثیت یہ تھی کہ وہ ادارۂ ادب اسلامی ہند کی تنظیم کے آغاز سے ساتھ رہے۔ اس کی مجلس اعلیٰ کے رکن رہے۔ اس کے رسائل میں برابر لکھتے بھی اور خود اپنے ماہنامہ رسالہ مریخ میں اسی طرز فکر اور نقطہ نظر کو ادب میں پیش کرتے رہے۔ انھوں نے اشتراکی ادب اور جدید و مابعد جدید بے مقصد ادب پر سخت تنقید کی اور ادب میں ہیئت و فارم کے لایعنی تجربات پر بھی ہمیشہ سخت تنقید کرتے رہے۔ انھوں نے مثبت و تعمیری انداز سے سوچنے اور لکھنے والوں کی ایک نسل کی آبیاری کی۔

رپورٹ : انتظار نعیم، اسسٹنٹ سکریٹری جماعت اسلامی ہند

ادارۂ ادب اسلامی کے زیر اہتمام

''اے ارض فلسطین'' اور ''ڈاکٹر ابن فرید: بے بدل انسان - بے مثل قلم کار'' کا اجراء

۱۲ رستمبر نئی دہلی، ادارۂ ادب اسلامی کے زیر اہتمام مرکز جماعت اسلامی ہند میں دو اہم کتابوں کی تقریب اجراء منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری امیر جماعت اسلامی ہند نے فرمائی اور نظامت کے فرائض جناب انتظار نعیم جنرل سکریٹری ادارۂ ادب اسلامی ہند، بہ اشتراک ڈاکٹر تابش مہدی انجام دیے۔ فلسطین سے متعلق مختلف شعراء کی منظومات پر مشتمل مجموعہ ''اے ارض

فلسطین'' کا اجراء سفیر فلسطین عزت مآب جناب اسامہ موسیٰ نے کیا جو اس تقریب کے مہمان خصوصی بھی تھے۔ دوسری کتاب '' ڈاکٹر ابن فرید: بے بدل انسان ۔ بے مثل قلم کار'' کی رسم رونمائی دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر عبدالحق صاحب کے مبارک ہاتھوں عمل میں آئی۔

تلاوت کلام پاک کے بعد پروگرام کے آغاز میں جناب اعجاز احمد اسلم ایڈیٹر ریڈینس ویکلی نے انگریزی میں سفیر کبیر فلسطین کا تعارف کراتے ہوئے اظہار خیال کی دعوت دی۔ اپنی مختصر تقریر میں سفیر فلسطین نے فرمایا کہ '' میں آپ کے اس تعاون کا شکر گزار ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ حکومت ہند کا تعاون بھی ہمیں حسب سابق ملتا رہے گا۔'' انہوں نے یاد دلایا کہ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، محترمہ اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی نے ہمارے موقف کی حمایت کے ساتھ مالی طور پر بھی ہماری امداد کی ہے۔ ہم اپنے ملک کی آزادی کے لیے جدو جہد کرتے رہیں گے جس کے بیشتر حصے پر اسرائیل قابض ہے جہاں ہمارے آبا و اجداد رہتے تھے۔ ہم یو.این.او. سے انصاف کی امید رکھتے ہیں جبکہ امریکہ ہمارے مسائل کو غیر منصفانہ طور پر پیش کر رہا ہے۔ میں اپیل کرتا ہوں کہ ہر قوم اور ہر مذہب کے ماننے والے اس بارے میں غور کریں اور بھرپور تعاون دیں۔ ہم دہشت گرد نہیں ہیں، اگر حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو دہشت گرد، امریکہ، اسرائیل اور بش ہیں۔

ڈاکٹر شاہد حسن صدر شعبۂ اردو جے.این.یو. نے سفیر فلسطین کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ احتجاج کرنا انسانی حق ہے اور غیر انسانی عمل کے خلاف جدو جہد جاری رہنا چاہیے۔ ادارہ ادب اسلامی کے اراکین کو مبارکباد دیتے ہوئے دونوں کتابوں کا اعتراف کیا۔

قیم جماعت اسلامی ہند جناب محمد جعفر صاحب نے ڈاکٹر ابن فرید مرحوم کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی تنقیدی تحریروں کی اہمیت پر روشنی ڈالی، خواتین کی اصلاح کے پہلو سے ڈاکٹر ابن فرید کی خدمات کا ذکر کیا اور ماہنامہ حجاب رامپور کو اس سلسلے میں سنگ میل قرار دیا اور مرحوم کے تنقیدی پہلو کو اصلاح کے پہلو سے قابل قدر بتایا۔

پروفیسر عبدالحق صاحب نے ادارۂ ادب اسلامی کے متحرک اور فعال جنرل سکریٹری جناب انتظار نعیم اور دیگر اراکین کی کوششوں کو سراہتے ہوئے مبارکباد پیش کی اور ڈاکٹر ابن فرید کے ساتھ گزارے ہوئے خلوت و جلوت کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ مرحوم کی اصلاحی اور تنقیدی تحریروں نے عوام پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کی تنقید کے اعتدالی پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ بطور انسان مرحوم اعلیٰ اقدار کی شخصیت کے حامل تھے۔ '' اے ارضِ فلسطین'' کی اشاعت پر کلماتِ تحسین سے نوازتے ہوئے ان منظومات کو اہم قرار دیا۔ انتظار نعیم صاحب کی

خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے وضاحت کی کہ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، عرب، امریکہ اور دیگر ممالک سے بلکہ تمام اردو دنیا سے جو تخلیقات آپ نے یکجا کی ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔
اجراء کے مشمولات کے بعد مختصر شعری نشست بھی منعقد ہوئی جس کے منتخب اشعار نذر قارئین ہیں:

اجمل ناز فاروقی: حیران ہو نہ سن کے صحابہؓ کی عظمتیں
ہے معجزہ نبیؐ کا جو ایسے بشر ہوئے

ابوالمجاہد زاہدؔ: منصف تو مجھ پہ اور بھی بیداد کر گیا
الزام میرے قتل کا میرے ہی سر گیا

شبنم سبحانی: کسی غریب کا آنسو بھی پونچھتے جا کر
جناب شیخ سے ایسی ریاضتیں نہ ہوئیں

قمر سنبھلی: علامتیں ہیں نئے دور کی برہنہ سب
مگر مزاج غزل کا غلاف چاہتا ہے

ڈاکٹر ظفرؔ مرادآبادی: بنامِ خدمت اردو ادب، ہوا یوں بھی
تمام عمر گزاری صدا فروشی میں

ڈاکٹر تابش مہدی: کم ظرف کو عروج پہ لانے سے پیشتر
دامن کی فکر کیجئے، پگڑی سنبھالیے

انتظار نعیم صاحب نے ''سرور فتح مکہ کا تمنائی'' کے عنوان سے نظم پیش کی۔
ادارۂ ادب اسلامی ہند کے صدر ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی نے ادارہ کا تعارف کراتے ہوئے مختصر طور پر دونوں کتابوں کی افادیت کے پہلو پر روشنی ڈالی اور آئندہ مزید ایسی تحریریں منظر عام پر لانے کا یقین دلایا۔
اپنی صدارتی تقریر میں جناب ڈاکٹر عبدالحق انصاری امیر جماعت اسلامی ہند نے ادارۂ ادب اسلامی کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے امید کی کہ مزید اس طرح کی علمی و ادبی اور تعمیری خدمات میں ادارہ کی خدمات قائم رہیں گی۔ آپ نے اس سلسلے میں اپنے ممکنہ تعاون کا یقین دلایا۔
آخر میں ادارۂ ادب اسلامی ہند کے جنرل سکریٹری جناب انتظار نعیم نے شکریہ کے کلمات ادا کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ تمام شرکاء اسی طرح تشریف لا کر ادارہ کے پروگراموں کو کامیابی سے ہم کنار کرتے رہیں گے۔ تقریباً ۴؍ گھنٹے تک چلی اس تقریب کا ۹؍ بجے شب اختتام ہوا۔
رپورٹ: ابوعدیل، ۱۳؍ ستمبر ۲۰۰۶ء

محمد ممتاز راشدؔ کا مجموعۂ حمد و نعت ”مدحت سرائی“

قطر میں ۲۹ سال سے مقیم نامور شاعر ممتاز راشد کا مجموعہ حمد ونعت ''مدحت سرائی'' جولائی ۲۰۰۶ء میں ناشر محمد نوید مرزا (راوی کتاب گھر، لاہور) نے شائع کیا ہے۔ ۱۲۸ صفحات کی اس کتاب کا سرورق نامور مصور آغا نثار کی تخلیق ہے۔ یہ کتاب خوبصورت انداز، عمدہ کاغذ اور معیاری طباعت کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ سرورق پر خانۂ کعبہ اور روضۂ رسولؐ کی تصاویر ہیں۔ عقبی سرورق پر ممتاز راشد کی پاسپورٹ سائز کی تصویر کے ساتھ مدیر ''دستاویز'' لاہور اشرف سلیم کی رائے میں لکھا ہے کہ ''ممتاز راشدؔ نے حمد و نعت میں اپنا ہنر بڑے اہتمام اور سلیقے کے ساتھ پیش کیا ہے''۔ ''مدحت سرائی'' میں تین صفحات پر مشتمل نامور رباعی گو علامہ بشیرؔ رزمی کا دیباچہ بھی ہے۔ ان کے بقول ''ممتاز راشد غزل گوئی سے بہت جلد بتوفیق الٰہی حمد و نعت کی رحمت آمیز وادیوں کی گلگشت کو نکل پڑے اور انہوں نے توحید و رسالت کے رنگ برنگے پھول چنے اور کہیں بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ جس ہنر مندی سے اپنے افکار و احساسات کو شعری پیکر میں ڈھالنے میں کامیاب ہوئے ہیں اس کے لیے لائق ستائش ہیں۔ ان سے فکری اختلاف ہوسکتا ہے مگر ان کی کاوشِ جمیلہ سے اختلاف ممکن نہیں۔ ان کو اس خوبصورت نعتیہ شاعری پر مبارکباد۔ قارئین اس کلام سے اپنی نگاہوں کی انگلیوں سے جس قدر پھول چن سکتے ہیں چنیں اور دل کے گلدان میں سجالیں''۔

اس کتاب میں خود ممتاز راشدؔ کا دو صفحات کا پیش لفظ بھی ہے جس میں اس کی اشاعت کا پس منظر بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس میں ان کے سابقہ مجموعہ حمد و نعت ''عقیدتِ خام'' (مطبوعہ ۱۹۸۸ء) کی بعض نعتیں بھی ہیں، جس میں حفیظ تائب، حافظ سلیم تابانی اور عطاء الحق قاسمی کے دیباچے شامل تھے۔ ''مدحت سرائی'' کی بیشتر حمدیں، نعتیں ''بزم اردو قطر'' کے سالانہ حمدیہ اور نعتیہ مشاعروں کی عطا ہیں۔ بزم کے نعتیہ مشاعرے اس کے قیام (۱۹۵۹ء) سے ہو رہے ہیں، جبکہ سالانہ حمدیہ طرحی مشاعروں کی بنا ممتاز راشدؔ نے تب ڈالی تھی جب ۱۹۹۳ء میں وہ صدر بزم تھے۔ انہوں نے ۱۹۹۹ء میں اپنے سہ ماہی رسالے ''خیال وفن'' (لاہور/قطر) کا حمد نمبر بھی شائع کیا تھا۔ یہ کسی ادبی رسالے کا پہلا حمد نمبر تھا۔ ''مدحت سرائی'' کا انتساب انہوں نے اپنے آبائی گاؤں محمود بوٹی لاہور کے نصف صدی تک رہنے والے امام مسجد سید محمد ایوب شاہ (متوفی ۱۹۹۹ء) کے نام کیا ہے جن سے انہوں نے قرآن ناظرہ پڑھا اور نعت خوانی کا شوق پایا۔ اس کتاب میں ان کی ۲۳ حمدیں، ۵۱ نعتیں اور ان کے سفر حرمین کی درجن بھر نظموں کے علاوہ چار رباعیات، دس قطعات اور آٹھ سلام شامل ہیں۔ نظموں میں ''اللہ سے دوستی، مناجات، زائرین حرم، خانہ کعبہ کا سفر، حرم کا نظارہ، مدینہ کا سفر، مسجد نبوی میں، دیدۂ تر میں

چراغاں اور کربلا کا درس'' وغیرہ ہیں۔ ''مدحت سرائی'' کی زیادہ حمدیں، نعتیں غزل کی ہیئت میں ہیں۔ چند خوبصورت حمدیہ اور نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کبھی جو ملتی ہے راشد عمیق تنہائی
مجھے خدا کا تصور سرور دیتا ہے

اسیر وہم و گماں ہیں ترے کئی بندے
انہیں یقین کی سوغات کر عطا مولا

نور ہی نور تھا ، دم بہ دم ، ہر طرف
دل میں راشدؔ جلا جب دیا نعت کا

ریزۂ سنگ ہوں سرکار ! نگینہ کردیں
میرے افکار کے یثرب کو مدینہ کردیں

ہوا مجھ پہ ایسا کرم اللہ اللہ
مرے سامنے ہے حرم اللہ اللہ

مظلوم جہاں کوئی نکلتا ہے سر رزم
شبیرؓ کی تصویر ابھرتی ہے نظر میں

اے خدا کو ڈھونڈنے والو! کہاں جاتے ہو تم
مصطفیٰؐ کے در پہ آجاؤ خدا مل جائے گا

میں سمجھتا ہوں کہ بخشش کی ضمانت ہے وہی
ایک مصرع بھی جو شایانِ رسالت ہو جائے

چاند سورج تھے یونہی پھر بھی کہاں تھا روشن
آپؐ آئے تو ہوا سارا زمانہ روشن

''مدحت سرائی'' کے قطعات میں دیگر انبیا،شہدا کے بارے میں ذکر ہے اور مجموعی طور پر اس کتاب کا مطالعہ ذوقِ عقیدت کو پُر کیف بنائے رکھتا ہے۔ صفحہ آخر پر راشدؔ کی چودہ کتب کی فہرست ہے، ان میں گیارہ مطبوعہ ہیں، دیگر میں ان کا پنجابی شعری مجموعہ، طفلی نظموں کا مجموعہ اور افسانوں کا مجموعہ شامل ہیں۔ مطبوعہ کتب میں غزلوں کے دو، قطعات کے دو، نظموں کا ایک اور طنز و مزاح کی شاعری کا مجموعہ شامل ہے۔ ''مدحت سرائی'' ان کا آٹھواں شعری مجموعہ ہے اور یہ ان کی ۵۳ سال کی عمر میں آیا ہے۔ ان کی دو نثری کتب میں ''صحرا کی ٹھنڈی شامیں'' (شعرائے قطر کا تذکرہ) اور ۵۲۶ صفحات کی ضخیم کتاب ''لاہور کے نئے پرانے رنگ'' شامل ہیں۔ ان کتب کی اشاعت ۱۹۸۱ء سے تاحال (۲۰۰۶ء) جاری ہے جو کہ ادب سے ان کی مسلسل وابستگی کا بین ثبوت ہے۔ وہ کئی ممالک کے ادبی دورے کر چکے ہیں۔ کئی رسائل ان کے بارے میں خصوصی گوشے شائع کر چکے ہیں۔ یوں وہ آسمانِ ادب کا ایک خوب روشن ستارہ بن چکے ہیں۔

رپورٹ : محمد شعیب مرزا، لاہور

قطر میں احمد ندیم قاسمی مرحوم کے لیے تعزیتی جلسہ

نامور ادیب و شاعر احمد ندیم قاسمی ۸۹ برس کی عمر میں ۱۰ر جولائی ۲۰۰۶ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کے جنازہ میں اعلیٰ حکام اور اہل قلم کی بڑی تعداد کے علاوہ سینکڑوں افراد نے شرکت کی۔ قطر کی قدیم ترین ادبی تنظیم ''بزم اردو قطر'' اور فعال پاکستانی ادبی تنظیم ''ادارۂ خیال و فن، قطر'' کے زیر اہتمام بھی تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔

(رپورٹ : محمد ممتاز راشد، دوحہ قطر)

اردو زبان اور لسانیات: پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نیا علمی کارنامہ

رامپور، ۷ راگست ۲۰۰۶ء: رامپور رضا لائبریری فخر سے یہ اعلان کرتی ہے کہ اردو کے سربرآوردہ اور مرکزی ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تازہ علمی کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' رضا لائبریری کے زیر اہتمام شائع ہوگئی ہے جو چھبیس انتہائی اہم علمی وتحقیقی مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین ہندوستان کی صدیوں کی ملی جلی تہذیب اور ثقافت کی آئینہ دار اردو زبان کے تاریخی ارتقا اور پس منظر کو بڑی علمی وتکنیکی مہارت سے پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ بین الاقوامی سطح کے مشہور دانشور، نقاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ نارنگ صاحب نے اپنی پوری زندگی اردو ادب، تاریخ، ثقافت اور لسانیات کی خدمت میں صرف کی ہے۔ ان کے اس خیال سے سبھی متفق ہوں گے کہ اردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک کی نشانی ہے اور ہندوستان کی ایک ہزار سالہ گنگا جمنی تہذیب کی امین ہے۔ نارنگ صاحب کے خیال میں اردو کا رسم الخط بھی بڑی ثقافتی اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے جسے تبدیل کرنا زبان کی شخصیت کے قتل کے مترادف ہے۔

اس اہم کتاب میں ایسے مضامین منتخب کیے گئے ہیں جن سے اردو زبان کی تاریخ، خصوصیات اور رسم الخط کے مختلف پہلوؤں پر گہری روشنی پڑتی ہے۔ نیز اردو کی ہیئت، اس کی صوتیات، اسلوبیات اور بہت سارے تکنیکی مسائل کو بڑے ہی دلکش طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ، صدر شعبۂ لسانیات علی گڑھ یونیورسٹی کا عالمانہ اور مبسوط 'پیش لفظ' شامل ہے جس سے کتاب کی اہمیت اور معنویت پر روشنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی

اردو انجمن برلن، جرمنی کی دسویں سالگرہ اور مژگاں (کولکاتا) کے مظفر حنفی نمبر کی رسم اجرا

اردو انجمن برلن، جرمنی کی دسویں سالگرہ کے موقع پر ۱۰ ستمبر ۲۰۰۶ء کو ہائرش بوئل اسٹفنگ کے ہال ہاکشے ہوئنے برلن میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر مظفر حنفی صاحب نے اردو کا جمہوری مزاج کے عنوان سے مقالہ پیش کیا جسے بہت پسند کیا گیا۔

اولاً انجمن کے صدر جناب عارف نقوی صاحب نے اردو انجمن کی تفصیل ومقاصد بیان کیے، انہوں نے کہا کہ اردو انجمن ایک غیر مذہبی، غیر سیاسی اور غیر تجارتی تنظیم ہے، اردو انجمن ہر اس شخص کا خیر مقدم کرتی ہے جسے انسانیت اور ادب سے محبت ہے، نائب صدر جناب انور ظہیر نے مہمانوں کا استقبال کیا۔

اس موقع پر کولکاتا کے رسالہ مژگاں کے ضخیم مظفر حنفی نمبر کا اجرا عمل میں آیا۔ چار سو صفحات پر مشتمل اس نمبر میں مظفر حنفی کے فن اور شخصیت پر قلمبند کردہ ۷۰ سے زیادہ اہم اردو زبان کے ادباء و شعراء کے مضامین شامل ہیں۔ اس نمبر کو بہت پسند کیا گیا اور ان کے ادبی کاموں کا بھرپور اعتراف کیا گیا۔

اس موقع پر اظہار خیال کرنے والوں میں پروفیسر عارف نقوی، ساحر شیوی، سلطانہ مہر اور پروفیسر فائلباخ نے مظفر حنفی کے فن اور شخصیت پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس کے بعد پروفیسر مظفر حنفی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا جس میں بڑی تعداد میں سامعین نے شرکت کی۔

لندن میں عالمی مشاعرہ

انجمن فروغِ اردو برطانیہ نے ۲۷/اگست ۲۰۰۶ء کو لندن کے مرٹن ہال میں ایک شاندار عالمی مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اس مشاعرے میں ہندوستان، پاکستان، کینیڈا، فرانس، جرمنی، ناروے اور امریکہ کے شعرا نے شرکت کی۔ اس مشاعرے کی صدارت معروف بین الاقوامی شاعر پروفیسر مظفر حنفی نے فرمائی۔ قیصر شمیم مہمانِ خصوصی تھے۔ مظفر حنفی کے علاوہ جن بیرونی شعراء نے اپنا کلام سنایا ان میں محسن احسان، عمر شریف، ولی عالم شاہین، ارمان نجمی، مظفر ممتاز، عاکف غنی وغیرہ شامل ہیں۔ برطانیہ کے مختلف شہروں سے شعرا اور سامعین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ برطانیہ کے جن شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان میں سے اکبر حیدرآبادی، خالد یوسف، سوہن راہی، عبدالغفار عزم، نجمہ عثمان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس مشاعرے میں سامعین کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ یہ مشاعرہ لندن کا کامیاب مشاعرہ کہا جا سکتا ہے۔

☆☆

"رہبر جونپوری کا پیغام حق"

کوئی ساٹھ اکسٹھ اُدھر کی بات ہے ہسوہ (فتح پور) کے ورنا کیولر مڈل اسکول میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا، گلابی جاڑے کی ڈھلتی رات میں اکثر دور سے ڈھولکی پر موج میں لوک گیت، کورس میں گاتے ہوئے دھوبیوں اور کمہاروں کی آوازیں نیند سے بیدار کر دیتیں، کبھی کبھار گڈمڈ صداؤں کے درمیان ایک آدھ مصرع سمجھ میں بھی آتا، مثلاً:

آلھا اُودل بڑے لڑیا جن سے ہار گئی تروار (تلوار)

اور

ایک کا ماریں دوئی گر جاویں، تیسر دہشت میں مر جائے

تجسس نے کھوج بین کی تو معلوم ہوا صدیوں پہلے مہوبہ کے راجا اور پرتھوی راج چوہان کے مابین ہونے والی جنگ میں مہوبہ کے دو سورما بھائیوں (آلھا اور اُودل) نے ایسی بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا کہ وہ عوام کے ہیرو بن گئے اور ان کے کارناموں کو ایک مخصوص طویل رزمیہ لوک گیت میں ڈھال کر عوام الناس برسہابرس سے بندیل کھنڈ، اودھ اور شمالی ہند کے وسیع علاقوں میں گایا کرتے ہیں، آلھا اُودل گانے والوں کی یہ محفلیں عموماً فصلیں کٹنے کے بعد جمتی ہیں۔ امتدادِ زمانہ سے اس لوک گیت میں اودھی، مگدھی، راجستھانی، برج اور کئی دوسری بولیوں کی آمیزش ہوگئی لیکن بالادستی پوربی کو حاصل رہی۔

کتابوں کا رسیا بچپن سے تھا ایک دن گھر کے مچان پر بوسیدہ اور دیمک خوردہ پرانی کتب کو اُلٹنے کے دوران چار پانچ کتابچے ذرا بہتر حالت میں نظر آئے تو انھیں جھاڑ پونچھ کر پڑھنے بیٹھا۔ ان کے نام دلچسپ تھے، اسلام کھنڈ کا پہلا کھنڈ، اسلام کھنڈ کا دوسرا کھنڈ، اسلام کھنڈ .....وعلی ہٰذا القیاس۔ افسوس کہ یاد نہیں آتا ان کھنڈوں کے مصنف کون تھے۔ یہ کتابچے ایک طویل رزمیہ نظم کے ابواب پر مشتمل تھے جن میں بطرزِ آلھا، فتوح الشام (اسلامی جنگوں کے احوال پر مشتمل تاریخ) کو منظوم کیا گیا تھا۔ ہر چند کہ یہ کتابچے فارسی رسم الخط میں تھے لیکن ان کی زبان پوربی تھی جو دیوناگری ہندی اور فارسی رسم الخط میں قدیم اردو ہو جاتی ہے۔ وہ کتابچے خورد برد ہو گئے اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن خیال آتا ہے کہ ان میں جب داستان کسی ایسے موڑ پر پہنچتی تھی جہاں سے منظر نامہ تبدیل ہوتا ہے تو درمیان میں نظم کی بحر قدرے تبدیل ہو جاتی تھی اور غالباً دوہے کی بحر میں دو مصرعوں کے بعد منظوم رزمیہ دوسرا موڑ لیتا تھا۔ اُسی زمانے میں کچھ ایسی نوٹنکیاں بھی دیکھنے اور پڑھنے میں آئیں جن میں کہیں 'سوتر دھار' (راوی) داستان کے سِروں کو آلھا کی طرز میں کہے گئے اشعار پڑھ کر ملاتا تھا اور بعض میں ایک آدھ گانا بطرزِ آلھا شامل ہوتا تھا۔

ان پاروں پر پچاس برس سے زیادہ کی گرد بیٹھ چکی تھی کہ پچھلے دنوں اچانک ''صدائے اردو'' (بھوپال) کے شماروں میں رہبر جونپوری کی منظوم تاریخ اسلام ''پیغام حق'' بالاقساط چھپنا شروع ہوئی جو بطرز آلھا کہی گئی ہے، تا حال اس کی تقریباً بیس قسطیں شائع ہو چکی ہیں اور ہر قسط کم وبیش ۲۰ ر اشعار پر پھیلتی ہے یعنی تا حال رہبر جونپوری چار سو شعر آلھا کی طرز پر کہہ چکے ہیں اور چونکہ اس نظم میں تاریخ اسلام ختم نبوت تک بیان کی جائے گی جب کہ تا حال یہ سلسلہ رسول اکرم کی حضرت خدیجہؓ سے شادی تک ہی پہنچا ہے، اس لیے توقع ہے کہ ابھی ہزاروں اشعار کہے جائیں گے۔ (تازہ ترین اطلاع کے مطابق یہ طویل نظم مکمل ہوگئی ہے)

رہبر جونپوری کی قادر الکلامی اور روانیٔ طبع کا اندازہ اُن کے مجموعہ ہائے کلام پڑھ کر تو ہوتا

ہی ہے لیکن یہ نقش انھیں مشاعروں میں سن کر زیادہ مستحکم ہوتا ہے جہاں موصوف نازش پرتاب گڈھی اور راہی شہابی کی طرح پچاسوں بندوں پر مشتمل نظمیں جوشیلے انداز میں مسلسل پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ آلھا پڑھنے والوں کے ہاں بھی یہی رواں دواں پُرجوش انداز ہوتا ہے چنانچہ زیرِ بحث نظم میں رہبر کی ان خصوصیات کا نہایت فنکارانہ اظہار ہو رہا ہے، بیانیہ پر ان کی قدرت اور زبان پر مہارت کے ثبوت اس نظم سے بخوبی عیاں ہیں۔

بہ ظاہر نظم کے ساتھ شائع ہونے والا اُن کا یہ دعویٰ کہ اس نظم سے اردو شاعری میں ایک نئی صنف کا آغاز ہوا ہے، صد فی صد درست نہیں ہے کہ یہ شرف اولیت تو اسلام کھنڈ، کو حاصل ہے البتہ اُن کے اس اجتہاد کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نظم ''پیغام حق'' میں پوربی بولیوں کی جگہ خاص اردو استعمال ہوئی ہے، نیز داستان میں از اول تا آخر ایک خاص نوع کی روانی ہے جبکہ اسلام کھنڈ میں دوہوں کے درمیانی استعمال سے بحر تبدیل ہو جاتی تھی۔ بحیثیت مجموعی یہ نظم بہر لحاظ لائق تحسین ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی

کھرڑ جرنلسٹ ایسوسی ایشن (رجسٹرڈ) کھرڑ (روپڑ، پنجاب) کے فاؤنڈر ممبر جناب کرشن پرویز شاعری کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی جڑے ہوئے ہیں اور پنجاب کے سارے اخبارات سے کسی نہ کسی شکل میں وابستہ ہیں۔ صحافت میں ۵۰ سال پورے ہونے پر انہیں سمانت کرتے ہوئے پنجاب کے سابق ڈپٹی اسپیکر اور حلقہ کے ایم۔ایل۔اے۔ سردار بیر دیویندر سنگھ اُن کے ساتھ کھرڑ کے ایس۔ڈی۔ایم۔ شری درشن سنگھ سندھو کھڑے ہیں۔ پیچھے شری پون جین (انڈین ایکسپریس) شری ترسیم چنڈ پوری (نواں زمانہ) اور گورکھ سنگھ مان (اجیت) صدر ایسوسی ایشن کھڑے ہیں۔

مشاہیر کے خطوط محمد ایوب واقف کے نام

یوسف ناظم کا خط

برادرم! ہماری زبان کے پہلی مارچ کے شمارے میں آپ کا سحر انگیز مضمون ''ہمارے علی میاں'' پڑھ کر بے اختیار جی چاہا کہ آپ کی عقیدت، ارادت، محبت اور خلوص سے بھرپور مضمون کی داد دوں، آپ نے جس عرق ریزی اور جانفشانی سے یہ مضمون قلمبند کیا ہے وہ آپ ہی کا دل جانتا ہوگا۔ آپ نے مولانائے مرحوم سے اتنی دور رہتے ہوئے غضب کی قربت کا ثبوت دیا۔

یکم مارچ ۲۰۰۰ء   اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

آپ کا
یوسف ناظم

عبدالقوی دسنوی کا خط

عزیز محترم واقف صاحب،

السلام علیکم،

اب تک آپ کو سردار جعفری کے خطوط نہ بھیج سکا، وجہ کچھ پریشانیاں ہیں۔ اہلیہ گر گئیں، ان کے داہنے ہاتھ کی ہڈی کلائی کی ٹوٹ گئی، یہ واقعہ ۱۲؍جولائی کا ہے، دو مہینے سے زیادہ ہوگیا، تکلیف اب بھی ہے، اس لیے سکون نہیں ہے۔ اس لیے خطوط ڈھونڈ نہ سکا۔ دیکھئے کب موقع ملتا ہے۔ آج ہماری زبان (۸؍ستمبر ۹۴ء) ملا، آپ کی نئی کتاب ''میں زندہ ہوں'' پر جگناتھ آزاد کا تبصرہ پڑھا، مسرت ہوئی کہ آپ علمی، ادبی کاموں میں مصروف رہتے ہیں، مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو خاموشی کے ساتھ کام کرتے رہتے ہیں۔ خدا یہ سلسلہ دراز کرے، اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد قبول کریں۔

۱۶؍ستمبر ۹۴ء

آپ کا
عبدالقوی دسنوی

گیان چند جین کا خط

شعبہ اُردو،
یونیورسٹی آف حیدرآباد،
حیدرآباد، 500001

۱۴ر جنوری ۷۸ء

مکرمی آداب عرض،

کرم نامہ ملا، افسوس کہ مجھے کتاب ''ذکر رفتگاں''[1] نہیں ملی۔ ڈاک میں اِدھر اُدھر ہوگئی ہوگی۔ مکاتیب منشی دیانرائن نگم[2] مجھے ملی تھی۔ میرے کتب خانے میں موجود ہے، میں نے آپ کواس کی رسید بھیج دی تھی۔ اب یہ یادنہیں کہ کس پتے پر بھیجی تھی، اگر کتاب کسی کتب فروش یا ناشر کے ذریعہ بھیجی گئی ہوگی تو رسید اسی کو بھیجی ہوگی، بہر حال شکریے کے ساتھ کتاب کی رسید کا ایک بار پھر اعتراف کرتا ہوں، امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

گیان چند

شمس الرحمٰن فاروقی کا خط

(نائب صدر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)

West Block-1

R.K. puram- New Delhi

Date 31-3-2005

برادرِ عزیز محمد ایوب واقفؔ سلام علیکم

مجھے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے نائب صدر نشین کی ذمہ داری تفویض کئے جانے پر آپ کا مبارکباد نامہ ملا۔ میں اس کرم گستری اور یاد آوری کے لئے تہہِ دل سے ممنون ہوں۔ اس عہدے کے فرائض ادا کرنے کی اگر مجھ میں کوئی اہلیت ہے تو وہ آپ جیسے اردو پرست دوستوں اور بہی خواہوں کے تعاون اور توجہ ہی کی بدولت بروئے کار آسکتی ہے۔ مجھے توقع، بلکہ یقین ہے کہ مجھے آپ کا تعاون حاصل رہے گا۔

ایک بار پھر شکریے کے ساتھ آپ کا نیاز مند۔

شمس الرحمٰن فاروقی

---

[1] محمد ایوب واقفؔ کے خاکوں کی کتاب۔

[2] محمد ایوب واقف نے ماہنامہ ''زمانہ'' کانپور کے مشہور ایڈیٹر منشی دیانرائن نگم کے نواسی اہم خطوط کا مجموعہ ترتیب دیا تھا۔ اس مجموعے کو نگم میموریل ٹرسٹ لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔

رشید حسن خاں کا خط

رشید حسن خاں،
ٹی:سی-9 گوریان
دہلی یونیورسٹی، دہلی-110007

مکرمی آداب

آپ کا پوسٹ کارڈ پرسوں مجھے ملا تھا، پڑھ کر سخت حیرت ہوئی، ارے صاحب! میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کتاب کے واپس کرنے کی، میں آپ کا خط پڑھ کر حیران رہ گیا، کل میں نے پوسٹ مین کو جا پکڑا اور پوچھا کہ کیا اس نے میرے نام کی کوئی کتاب واپس کی ہے؟ اس نے صاف انکار کیا اور کہا کہ ایسی کوئی کتاب ملی ہی نہیں، میں تو کتاب کے قدردانوں میں سے ہوں، اسے واپس کیسے کر سکتا ہوں، قسم لے لیجئے جو کبھی اس طرح سوچا بھی ہو۔

اب ازراہِ کرم یہ لکھئے کہ وہ کتاب آپ نے کس پتے پر بھیجی تھی اور کیا رجسٹرڈ بھیجی تھی؟ اگر اس کا ریپر محفوظ رہ گیا ہو تو ایک لفافے میں اسے رکھ کر ضرور بھیج دیجئے، میں اس کی پوری تحقیقات کروں گا۔ یہ پہلا موقع ہے پچھلے تیس سال میں کہ ایسی صورت پیدا ہوئی۔ اگر وہ نسخہ اب بھی محفوظ ہو تو ازراہِ لطف خاص اسے ایک بار پھر بھیجنے کی زحمت گوارا فرمالیجئے اور رجسٹرڈ ضرور کردیجئے۔ اس طرح کتاب محفوظ رہتی ہے۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اس خط کے جواب سے مجھے نوازیں گے۔

۱۵رجون ۸۷ء
نیازمند
رشید حسن خاں

انتساب کی ڈاک

مسعود منزل، کوہِ سبز
شالیمار، سری نگر

محبی و عزیزی سیفی سرونجی صاحب،

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ کی قیادت اور ادارت میں انتساب خاص و عام میں خاصی مقبولیت حاصل کر رہا ہے، آپ کی لگاتار محنت اور اردو زبان و ادب سے شیفتگی کی حد تک محبت رنگ لا رہی ہے۔

ادھر میرا نیا شعری مجموعہ ''یک شہر گماں'' چھپ گیا ہے، ساتھ ہی برادرم شاہد علی خاں (مکتبہ جامعہ) نے منتخب افسانوں کے تجزیوں پر مشتمل میری کتاب چھپوادی ہے، دونوں کتابوں کی

ایک ایک کاپی ارسال کر رہا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ آپ ان کو ایک نظر سے دیکھیں گے اور ان پر انتساب میں کچھ نہ کچھ لکھیں گے۔ آپ کے خلوص کا سدا معترف رہا ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ موجودہ خودغرضی، احباب نوازی کے بے چہرہ دور میں خلوص و محبت ماضی میں دفن ہو چکے ہیں، اس لیے میں مکمل طور پر خانہ نشین ہو گیا ہوں، اور تنہائی میں کچھ نہ کچھ لکھتا ہوں۔

میری بیگم مصرہ مریم نے منتخب کشمیری افسانوں کے اردو تراجم پر مشتمل کتاب چھپوادی ہے، وہ کتاب آپ کی نذر کر رہی ہیں۔ رسید سے نوازیئے گا۔ ایک Ad منسلک ہے اور ہاں انتساب کے لیے ایک غزل حاضر ہے۔ والسلام۔

آپ کا

حامدی کاشمیری

۱۶ر مئی ۲۰۰۶ء

برادرم سیفی سرونجی صاحب،

آپ کا خط ملا، جس کے لیے بہت بہت شکریہ،

مجھے مسرت ہوئی یہ پڑھ کر کہ آپ کو ''گر ہم بُرا نہ مانیں'' پسند آئی اور یہ کہ آپ اپنے اگلے شمارے میں اس پر سیر حاصل تبصرہ فرمائیں گے۔ میں اپنی دوسری تحقیقی تصانیف (''خدا کے تخت بندے''، ''ہر ملک ملک ماست''، ''تاریخ کا سفر'' اور ''کون عبث بدنام ہوا'') آپ کو بھجوانے کا ارادہ کر رہا ہوں جن میں میں نے اردو ادب میں تاریخ نویسی کے ایک منفرد اسلوب کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

فی الحال ایک نظم ''بالاکوٹ'' آپ کو بھجوا رہا ہوں، امید کہ آپ کو پسند آئے۔

نیازمند

اطہر رضوی

محترمی ڈاکٹر سیفی سرونجی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ،

شمارہ نمبر ۵۹ (انور شیخ نمبر) دستیاب ہوا، تین ہفتے گزر گئے، مطالعہ تقریباً مکمل کر لیا ہے، آپ کے بیباک اداریے نے بہت سارے صحافیوں کے ہوش اُڑا دیے ہوں گے۔ کیوں کہ سچائی بیان کرنے میں سو فیصدی ایڈیٹر بھی دم دبائے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ادارہ آجکل حقیقت کو اُجاگر کرنے میں دلچسپی نہیں لیتا، کبھی خوف و ہراس کے دائرے میں شب و روز گزارتے ہیں، صرف اس لیے کہ ان کی نقل و حرکت پر حرف نہ آئے۔ ایسی ادارت اور صحافت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے اور کسی

بھی معاشرے کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر زیبا محمود کا مضمون بہترین ہے، ویسے تو معاملہ تنقید کا ہے، پھر بھی ادبی مصروفیت کا احاطہ اس سے ممکن نہیں کیوں کہ اپنے شعار کو مغربی افکار میں اُلجھانا جہالت کی نشانی ہے، ممکن ہے بہت سے دانشور اس سے اتفاق نہیں کریں گے۔ مولانا حالی نے صرف شعر و شاعری میں اصلاح کے لیے مغربی ادب کو اپنے گوشے میں جگہ دی تھی۔ مستقبل کا اندازہ کیے بغیر ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا کوئی جواز نہیں۔ بہت سارے تنقید نگاروں نے انگریزوں کی آمد کے بعد سے مغرب کی اصطلاح سے قربت حاصل کی اور انگریزی تعلیم سے وابستہ ہوکر شعر و ادب میں انقلابی صورت و شکل اختیار کرلی لیکن ہمارے حصے میں تنقیدی اثبات ونفی کے علاوہ کچھ نہیں آیا۔ تفسیر حیات، تنقید حیات اور نقد الادب وغیرہ سے ہمارے جو دانشور متاثر ہوئے شاید علم اور ادبی نظام میں امتیاز نہیں کر سکے، یہی وجہ ہے کہ زمانے کے مطابق تمام دانشوران سور ملاتے چلے گئے۔ جہاں تک جدلیاتی اور مارکسزم کا سوال ہے بھلے ہی وقت کے تقاضوں کے ساتھ دبستان تنقید کا سلسلہ شروع ہوا اور حتی الوسع جانے مانے نقادوں کو اس میں کامیابی بھی ملی لیکن ہمارے معاشرے میں اس کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ تنقید بذات خود تعمیری نظم و ضبط سے تعبیر کی جاتی رہی ہے۔ جو بالکل صحیح ہے اس سے انکار کی گنجائش تک نہیں۔ ہم نے مغربی مصنفوں کی تقلید شروع کردی جس سے مزاحمتی ادب کا جنم ہوگیا، نتیجہ سارے دانشور اپنا لوہا منوانے کے لیے مغربی کا حوالہ دینے لگے۔ اور بعد میں اسے اردو میں تنقید مغرب کا دیا ہوا عطیہ مانا جانے لگا۔ یہ مکمل طور پر خام خیالی ہے، فن برائے فن سے انسانی ذہن متاثر ہوا، ذہنی تغیر جو قدرتی فعل سے جس کا طریقہ عمل علم پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے فروغ سے تنقید کا مطلب واضح ہوتا ہے۔ زیر نظر شمارہ ''انتساب'' میں جناب ساحر شیوی اور پروفیسر آفاق احمد صاحبان نے جناب گلشن کھنہ کو قریب سے دیکھا یہ جس کے ذکر سے گلشن پرستی بالاتر ہوگئی ہے۔ جناب انور سدید صاحب نے آپ کی شخصیت اور فن پر جو مضمون قارئین کے لیے پیش کیا اس سے دنیائے ادب کافی حد تک سرونج میں رنگ چکی ہے۔ آپ خاص کر اردو ادب کے مایہ ناز ہستی ہیں جس سے آنے والی نسل بھی حضرت کی تخلیقات سے استفادہ حاصل کرتی رہے گی اور ڈاکٹر سیفی صاحب کے ساتھ سرونج کا نام صفحہ قرطاس پر محفوظ رہے گا۔ آمین۔

صفحہ ۲۹ سے ۴۲ تک ایک نظم بقیہ غزلیں ہیں، تقریباً بھی غزلیں بیرون ملک سے ہیں، غزلیات کے یہ اوراق زندگی کے نشیب و فراز سے متعلق ہیں، تمام شعرائے کرام مبارکباد کے مستحق ہیں۔ آپ نے انور شیخ کے نغمانہ پر بتیس صفحات خرچ کیے ہیں، جہاں معاملہ عشق و محبت کا ہو ایسی تخلیقات یقیناً بہتر ہوتی ہیں نئے اصناف سے قارئین مسحور ضرور ہوتے ہیں مگر سب کی جڑ غزل ہے اور

غزلیات سے چھیڑ چھاڑ مناسب نہیں

انور شیخ صاحب کا افسانہ ''اتفاق'' سے کافی کچھ سبق ملتا ہے، ویریندر تیواری جی کا افسانہ ''منظر ایک بلندی پر'' اچھا ضرور لگا مگر کامریڈوں کی مزاحمت میں انسانیت کا بول بالا ہوتا ہے اور یہ اپنے مشن میں خاطر خواہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اس افسانے میں کامیابی کا منظر کم نظر آتا ہے۔

قیوم راہی کا افسانہ ''گوپھن'' بہتر تو نہیں البتہ ازدواجی زندگی کی سرگوشیاں ہیں۔ ''سب رنگ اچھے'' میں شمس الدین انصاری نے مختصر افسانے میں عورت کی زیبائش پر اچھا لکھا ہے۔ یٰسین احمد کا افسانہ ''براہ راست'' پسند آیا۔ صفحہ ۸۷ تا ۱۰۲ اندرون ملک کے شاعروں کی تخلیقات ہیں کم و بیش سبھی غزلیں اور نظمیں قابل توجہ ہیں، عبدالاحد خاں طوفاںؔ نے ہزل پیش کی تخلیق بڑی اچھی ہے۔ صفحہ ۱۰۳ سے ۱۳۳ تک جہانِ ادب کا احاطہ ہے، جہانِ ادب کے تحت مختلف مصنفین کی کتابوں/ رسائل پر تبصرے ہیں۔ دراصل تبصرہ بھی نقد و نظر کا اہم حصہ ہوتا ہے او یہ وجہ ہے کہ مبصرین کو عرق ریزی کے دور سے گزر کر مصنف اور کتاب/ رسائل کے بارے میں قرینے سے مواد کو قلم بند کر کے قارئین کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے۔ زیادہ تر تبصرے آپ کی ادبی صلاحیتوں کی نشانی ہیں جو قارئین کی معلومات میں بے انتہا اضافہ کرتے ہیں اور اردو ادب کی ترقی و ترویج کے باعث ہیں۔

مشاہیر کے خطوط محمد ایوب واقفؔ کے نام اور دیگر مکتوبات بہت خوب ہیں، اتنے بہترین بہت کم پڑھنے کو ملتے ہیں۔ جملہ ادارت کے لیے آپ کو مبارکباد پیش خدمت ہے، ادبی خبریں بھی بے حد دلچسپ ہیں، اس سے اردو دنیا کی سرگرمیوں کا علم ہوتا ہے۔

آپ کا مخلص
مجیب الرحمٰن سنگاپوری
دمکا (جھارکھنڈ)

محترم سیفی بھائی، آداب

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ اس بار آپ لندن آئے ملاقات نہ ہو سکی جس کا افسوس رہا، آپ کے پروگرام کا بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا۔ آجکل پروفیسر آفاق احمد اور ہمارے پاپا یہاں آئے ہوئے ہیں، اس لیے ادبی سرگرمیاں زیادہ ہوئی ہیں۔

بھائی علم ہوا کہ آپ آفاق میاں کو بھی یہاں لانا چاہتے تھے مگر ان کا ویزا نہیں ہو پایا، کیا وجہ تھی؟ اگر آپ ہم سے ذکر کرتے تو ممکن تھا ہم کچھ رائے دے سکتے، ہم نے تقریباً چار سال اس محکمے میں کام کیا ہے، اس کی باریکیوں کا اندازہ ہے، اس بار اگر apply کریں تو مشورہ کریں، انشاءاللہ

ہو جائے گا۔

لندن کا عالمی مشاعرہ بہت کامیاب رہا، Report روانہ کر رہا ہوں، قریبی شمارے میں لگا دیں، تہہ دل سے ممنون رہوں گا۔ بھابی کی خدمت میں آداب، بچوں کو دعائیں۔ محترم توفیق خاں صاحب کی خدمت میں ہمارا اسلام کہیے۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔

آپ کا

پرویز مظفر

۳۱/جولائی ۲۰۰۶ء

برادرِ مکرم سیفی سرونجی صاحب!

سلام مسنون،

گیان چند جین صاحب نے اردو زبان و ادب اور مسلمانوں کے خلاف جو بے دلیل باتیں کہی تھیں اُن کا جواب آپ نے نہایت معقول استدلال کے ساتھ دے دیا ہے، ایسا گمان ہوتا ہے کہ گیان چند جین صاحب کے پس پردہ کوئی اور صاحب ہیں جن میں سامنے آ کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی جرأت نہیں ہے، جو نہ صرف اردو بلکہ اردو کی مقبول صنف غزل کے بھی مخالف ہیں

یہاں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اقتدار کا نشہ عجیب ہوتا ہے، اس لیے مسلمان حکمرانوں سے بھی اپنے دورِ اقتدار میں خطائیں ضرور ہوئی ہوں گی۔ لیکن مسلمان حکمرانوں کے سامنے ایک خیال رہتا تھا کہ روزِ محشر میں سب کو اپنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا، اس لیے مسلمان حکمراں اپنی رعایا کے ساتھ جہاں تک ہوسکتا تھا انصاف کرتے تھے۔ مسلمان حکمرانوں کے انصاف کے واقعات تاریخ کے صفحات میں بھرے پڑے ہیں جنھیں آج اُجاگر کرنے کی از حد ضرورت ہے، یہاں صرف شیر شاہ سوری کے انصاف پر مبنی ایک واقعہ کی تفصیل لکھی جاتی ہے۔ اُمرائے ہند میں محمد سعید مارہروی لکھتے ہیں ''ایک دن شیر شاہ کا شاہزادہ عادل خاں ہاتھی پر سوار آگرہ کے ایک کوچے سے ہو کر گزرا۔ راستہ میں ایک بقال کی عورت اپنے گھر میں نہا رہی تھی، مکان کی دیواریں نیچی تھیں، شاہزادے نے ایک پان کا بیڑا اس کی طرف پھینک دیا، عورت بڑی پاک دامن تھی، شرم سے جان دینے پر آمادہ ہوگئی، اسی اثنا میں اس کا شوہر آ گیا، اس نے سمجھا بجھا کر عورت کو خودکشی کے ارادے سے باز رکھا اور پان کا بیڑا ہاتھ میں لے کر دیوان عام میں پہنچا۔ جب بادشاہ نے اس کی فریاد سنی بہت افسوس کیا اور بعد تحقیقات کے حکم دیا کہ اس طرح بقال کو ہاتھی پر سوار کرا کے عادل خاں کی عورت کے سامنے کی جائے تا کہ وہ اس کی طرف پان کا بیڑا اسی طرح پھینکے، اس حکم پر امراء اور وزیروں نے بہت

عرض و معروض کی مگر بادشاہ نے کوئی بات نہ سنی اور کہا کہ عدل میں امیر اور غریب سب برابر ہیں، میں ہرگز نہیں دیکھ سکتا کہ میرے فرزند، رعایا کے ساتھ ایسی لغو حرکت کریں، آخر جب بقال نے خود راضی نامہ دے دیا اُس وقت بادشاہ نے مجبور ہو کر سکوت اختیار کیا۔''

معلوم نہیں ایسے تاریخی واقعات گیان چند جین صاحب اور ان کے ہمنواؤں کی نظر سے گزرے یا نہیں۔ امید ہے بخیر ہوں گے۔

طالب خیر
خلیل تنویر

۸ر ستمبر ۲۰۰۶ء

برادرم سیفی صاحب، سلام مسنون،

انتساب نمبر ۶۰ کل کی ڈاک سے ملا، آپ کا لندن کا چوتھا سفر بھی اور سفر ناموں کی طرح دلچسپ ہے، اس سفر نامے میں آپ نے مشتاق سنگھ کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' کتاب گیان چند جین نے لکھی ہے، یقین نہیں آیا کیونکہ وہ کئی ماہ سے بستر پر ہیں، ''اس میں یقیناً کوئی بڑی سازش ہے''۔ اس سازش کے سلسلے میں شک کی سوئی ستیہ پال آنند کی جانب گھوم رہی ہے، کیونکہ ستیہ پال آنند اپنے ایک انٹرویو (شمارہ جنوری ۲۰۰۶ء) میں فرما چکے ہیں کہ اُردو بطور ایک بولی جانے والی زبان بن کر رہ گئی ہے، اسے آپ ترقی کہیں یا تنزل ایک لکھی جانے والی زبان کے طور پر اس کا مستقبل تابناک نہیں ہے، میں ایک بھاشا دو لکھاوٹ کے حق میں ہوں'' اب ستیہ پال آنند سے کوئی پوچھے کہ وہ کون سا ملک ہے جہاں اردو بطور ایک بولی جانے والی زبان بن کر رہ گئی، اردو کی یہ حالت ابھی تو ہندوستان میں نہیں ہوئی ہے، ایسا لگتا ہے کہ ستیہ پال آنند نے گیان چند جین کی اوٹ میں اردو والوں پر فائر کیا ہے۔

انور شیخ کو ناوک حمزہ پوری کے مضمون نے آپے سے باہر کر دیا ہے، وہ اردو زبان کے ادیب ہیں تو پھر اردو تہذیب کو نظر انداز کر کے بازاری زبان کیوں استعمال کرنے لگے، انور شیخ کی مندرجہ ذیل تحریر شائستگی سے کوسوں دور ہے۔ ''ناوک حمزہ پوری اس وقت خود کون سا تیر مار رہا تھا، شاید کسی طوائف کے کوٹھے کی صفائی کر رہا ہوگا''۔

طالب خیر
خلیل تنویر

برادرم سیفی صاحب!

خلوصِ بیکراں،

ایک زمانہ تھا جب آپ مجھے گاہے گاہے یاد کیا کرتے تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ آپ نے مجھ سے منہ ہی پھیر لیا۔ پچھلے دنوں آپ کی خیر وخبر جاننے کے لیے ایک خط بھی ڈال دیا تھا، اُس کا بھی کوئی جواب نہ آیا۔ آخر ہم سے ایسی کیا گستاخی ہوگئی جو آپ نے قطع تعلق ہی کرلیا؟ کہیں یہ یورپ کی ہواؤں کا اثر تو نہیں؟

بہر حال آپ کی کارگزاریوں کے بارے میں آپ کے چاہنے والوں سے مسلسل خبریں ملتی رہتی ہیں۔ میں بھی چند سالوں تک پھر سے گوشہ نشینی میں چلا گیا تھا۔ اب پچھلے کچھ مہینوں سے پھر ادبی بخار چڑھ گیا۔ آجکل دھڑا دھڑ لکھ رہا ہوں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میرے افسانے ''رنگ وبو''، ''خوشبو کا سفر''، ''انشاء''، ''کاروان''، ''اسباق''، ''کاروانِ ادب''، ''فنون''، ''قرطاس''، ''تمثیل''، ''نورنگ'' وغیرہ وغیرہ میں شائع ہو رہے ہیں۔ یہ تفصیل اس لیے پیش کر رہا ہوں کیونکہ مجھے متحرک کرنے والے آپ ہی تو ہیں

آپ کی خدمت میں بھی ایک افسانہ ''فاصلے'' لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ اسے قابل اشاعت سمجھیں تو ضرور چھاپیے گا، ممنون رہوں گا۔

گھر میں سب کو میرا سلام کہیے گا۔ پہلے ''انتساب'' کے دیدار ہوتے تھے۔ اب اُس سے بھی آپ نے محروم کر دیا۔

رسید اور رائے کا منتظر رہوں گا۔ خط وکتابت جاری رکھیے، آپ کے خطوط سے سہارا مل جاتا ہے۔

آپ کا اپنا
دیپک کنول

محترمی سیفی صاحب،

السلام علیکم

عبداللہ ساجد کی معرفت ''انتساب'' کا ۵۹ واں شمارہ موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ پہلی بار ''انتساب'' سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا اور خوشی ہوئی کہ انتساب اردو کے نمائندہ ادبی رسائل میں اپنا ایک خاص مقام بنا چکا ہے۔ آپ کا مضمون ''انور شیخ کی شگفتہ بیانی اور نغمانہ'' غور سے پڑھا، یہ ایک نئی اور دلچسپ ایجاد ہے۔ زر سالانہ پیش خدمت ہے، امید کرتی ہوں انتساب باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔ ہم دونوں کی طرف سے آداب وسلام، گھر کے تمام افراد کے لیے نیک خواہشات۔ نیاز مند

میمونہ علی چوگلے

کینیڈا،　　　　　　جناب سیفی سرونجی صاحب،

سلام و نیاز،

انتساب کا شمارہ ۵۹ موصول ہوا۔ آپ کو بہت تاخیر سے جواب دے رہی ہوں کیونکہ تقریباً ۴ ماہ بعد واپس گھر لوٹی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان گئی، واپس دو ہفتوں کے لیے آئی تھی، پھر یورپ چلی گئی تو اب چند روز ہوئے واپسی ہوئی ہے اور رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آ رہی ہے۔ ہندوستان میں میری کتاب ''کرچیاں'' کی رونمائی جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر مشیر الحسن نے کروائی اور غالب اکیڈمی میں ڈاکٹر قمر رئیس نے، پھر پاکستان میں معراج جامی نے، وہاں جمیل جالبی، محمد علی صدیقی، حمایت علی شاعر تھے اور خاص کر لاہور سے امجد اسلام امجد بھی میرے لیے تشریف لائے تھے۔ کتاب بہت مقبول ہوئی ہے، اللہ کی مہربانی سے ابھی جرمنی میں یونیورسٹی آف Heidelberg میں کرسٹینا اور ایسٹر بلڈ نے ''کرچیاں'' کا اجراء کیا تھا، پھر لندن میں بزم شعر وسخن برطانیہ نے بھی، وہاں ڈپٹی میئر کے ہاتھوں مجھے ایوارڈ دیا، ایک منفرد شاعری اور مصوری کی کتاب اُردو میں شائع ہوئی ہے، اور اعلیٰ خدمات کے لیے ہائیڈل برگ کی یونیورسٹی اور برٹش لائبریری میں بھی کتاب رکھی گئی ہے۔

جواب کی منتظر رہوں گی۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

خلوص کار

پروین شیر

بریڈفورڈ، انگلینڈ، ۱۹ ستمبر 2006ء

ڈاکٹر سیفی سرونجی

آپ کے وقیع رسالے ''انتساب'' کے دو شمارے ۵۹ اور ۶۰ اکھٹے ملے، شکریہ، دونوں شماروں میں مخزن ۴ اور مخزن ۵ پر الگ الگ تبصرہ موجود و شامل ہے۔ میں شکر گزار ہوں کہ آپ کی توجہ ملی، شکایت وشکوہ کا کوئی مقام نہیں ویسے بھی میں آپ کا شروع سے انگلستان کے پہلے سفر سے منتظر توجہ وقدم رنج رہا ہوں، آپ نے نہایت وکمال مہربانی سے میری بعض تحریرات بھی شائع کی ہیں اور میں آپ کی ادبی خدمات کوششوں سے مرکز نگاہ بناتا آرہا ہوں مگر بڑی حقیقت رہی ہے کہ میں حلقہ عزیزگان ومہربان خاص میں کسی گوشے سے شامل نہیں سمجھا جاسکتا، اس لیے دیار دور وغیر اردو میں آباد اجنبی پیاسے کو قلزم سرونج سے جتنی بھی شبنم مل گئی وہی اس کے لیے سرمایہ روح وشادمانی ہے۔ خدا آپ کو زندہ وسلامت رکھے۔ آمین۔ والسلام۔

مقصود الٰہی شیخ

برمنگھم، انگلینڈ، ۲۵ر ستمبر ۰۶

محترم سیفی سرونجی صاحب! اسلام علیکم

انتساب کا شمارہ نمبر ۶۰ ملا۔ بڑا خوبصورت شمارہ ہے اور سرورق پر پرم جیت جی اور گلشن کھنہ صاحب کی تصویر نے اسے اور جاذب نظر بنا دیا، آپ دوستوں کے ساتھ دوستی نباہنا خوب جانتے ہیں، ویسے پرم جیت اور محترم بھائی گلشن کھنہ ہیں بھی اس قابل کہ ان کے حسن سلوک کی پذیرائی ہونی چاہیے۔

اپنا افسانہ لال اور پیلا نارنجی دیکھ کر خوشی ہوئی، آپ کا شکریہ کہ آپ نے سلیقے سے شائع کیا۔ بس پروف ریڈنگ پر توجہ دیں۔ صفحہ ۲ پر فہرست میں ساح شیوی لکھا ہے، ساحر شیوی ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح صفحہ ۱۷۶ پر ڈاکٹر کیول دھیر کو نیول دھیر بنا دیا ہے۔

آپ کے اور توفیق صاحب کے لئے گلشن کھنہ صاحب کے پاس جناب شفیق موڈک کے ہمراہ سخن ور پنجم اور گفتنی دوم بھجوا رہی ہوں، وہ آپ کو بھجوا دیں گے۔

اس خط کے ہمراہ جناب احمد ندیم قاسمی کے دو مضامین ارسال ہیں اور جاوید صاحب کا افسانہ ''یہ بھی قانون کی ادا ٹھہری'' امید ہے پسند آئے گا۔

اگلے سال ہندوستان آنے کا پروگرام ہے، پروفیسر آفاق احمد صاحب سے بھی وعدہ کیا ہے۔ آپ سے بھی نیاز حاصل ہوں گے۔ جاوید صاحب کا سلام، خیر طلب۔

سلطانہ مہر

پس نوشت: آپ اپنی ایک تصویر مجھے بھیج دیں تو میں آپ کا تعارف سخن ور پنجم سے لے کر نوائے وقت لندن میں شائع کرادوں۔ انتظار رہے گا۔

دہلی، 17-10-06

برادرم ڈاکٹر سیفی سرونجی،

آداب،

انتساب پابندی سے ملتا رہا ہے، چند روز قبل نارنگ صاحب کے تنقیدی اور علمی کاموں کے بارے میں آپ کی تجزیاتی کتاب بھی موصول ہوئی۔ جس کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ خیر ادھر تو میں ایک ماہ سے لگاتار Viral fever میں مبتلا رہا لیکن سچ پوچھئے تو انتساب کے سلسلہ میں آپ سے شرمندہ ہوں کہ اس کے لیے نہ کچھ بھیج سکا اور نہ ہی اس مثالی جریدہ کی اشاعت پر آپ کو داد دے سکا۔ جس ریاضت اور جانکاہی سے آپ یہ معیاری پرچہ پابندی سے نکال رہے ہیں کم از کم میں اس کی داد دینے کا حق

رکھتا ہوں کہ پچھلے پچاس سال میں میں نے بھی کچھ ایسے ہی کام کرنے کی کوشش کی ہے۔
انتساب میں ہمیشہ آپ مغربی دنیا کے تخلیق کاروں اور ان کے کارناموں کو بھی بہت خلوص اور خوبی سے متعارف کراتے ہیں، یہ اہم کام بھی کوئی دوسرا پرچہ نہیں کر پا رہا ہے۔ نارنگ والی تصنیف پر کوشش کروں گا کہ نیا سفر میں تبصرہ شائع ہو لیکن یہ پرچہ بھی اب بند ہونے کی کگار پر ہے، دراصل اکیڈمی کے کاموں نے گھیر لیا ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ اس عمر میں ایک ادبی پرچہ کی ترتیب، طباعت کا کام اب انجام دے سکوں گا۔
ایک بار پھر آپ کی مہربانیوں کے لیے دل سے ممنون ہوں۔ خیر طلب۔

قمر رئیس

نئی دہلی، ۷/اکتوبر ۲۰۰۶ء
محترمی سیفی سرونجی صاحب،
آداب، امید ہے کہ مزاج گرامی شگفتہ ہوں گے۔ آپ کی محبتوں کی خوشبو بکھیرتا ہوا ''انتساب'' تواتر سے مل رہا ہے۔ آج ہی تازہ شمارہ برطانیہ کے نام موصول ہوا۔ حسن کتابت، طباعت کا اعلیٰ معیار حسین اور معیاری غزلیں، معلوماتی مضامین، دلچسپ تبصرے اور علمی و ادبی دنیا کی تازہ خبریں واقعی جریدے کے معیار میں اضافہ کرتی ہیں۔ برطانیہ میں آپ کی پذیرائی کی خبریں اور تصویریں دیکھ کر خوشی ہوئی، اس کے لیے آپ کو بہت بہت مبارکباد۔
آپ کا یہ فیصلہ اچھا لگا کہ آئندہ سے اس بحث کو ختم کیا جائے، لہٰذا 'ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب' کے بارے میں مضامین اور خطوط شائع کرنے کا سلسلہ آئندہ شمارے سے بند کر دیا گیا ہے۔
انور سدید کے مضمون ''سیفی سرونجی کی شخصیت اور فن'' میں آپ کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے، مبارک ہو۔
اس پرچہ میں سرسری نظر میں ادب لطیف کا اشتہار نظر آیا جس میں آپ نے ادارت میں رئیسہ بیگم کا نام لکھا ہے، دراصل ادیب لطیف کی مدیرہ کا نام صدیقہ بیگم ہے، آئندہ اسے درست کر دیں۔
زرِ رفاقت کے سلسلہ میں چیک ارسال ہے، آئندہ کوئی خدمت۔

مخلص
نارنگ ساقی

بھئی سیفی صاحب،
تازہ شمارہ ''انتساب'' ملا، شکریہ۔

آپ نے مہربانی کی، میری کتاب ''ناکام محبت - ساحر لدھیانوی'' پر بہت اپنائیت سے تبصرہ لکھا، اتنی بے پایاں مصروفیات سے وقت نکال لینا، یہ بھی کمال ہے۔ ایک تکنیکی غلطی رہ گئی۔ کتاب کے ملنے کا پتا درج نہیں ہوسکا۔ انتساب ساری دنیا میں جاتا ہے، اگر ساحر سے محبت کی وجہ سے لوگ کتاب منگوانا چاہیں گے تو مایوس ہوں گے۔

''تخلیق'' کا اشتہار بھی شامل ہے۔ مگر آپ کا کمپیوٹر کمپوزر ''بھگوان'' سے خوش نہیں ہوا، اور پتے میں بھگوان سٹریٹ کی جگہ صرف سٹریٹ ہے، بھگوان کی جگہ نکتے ہیں، حیرت ہے، اتنے برسوں سے میں بھگوان سٹریٹ ہی میں موجود ہوں، مجھے تو بھگوان نے کچھ نہیں کہا، شاید میں ''پکا مسلمان'' نہیں ہوں گا۔

''ادب لطیف'' کے شمارے میں مدیرہ کا نام رئیسہ بیگم چھپ گیا ہے، اُن کا نام صدیقہ بیگم ہے۔

آپ ساری دنیا میں گھوم آئے مگر پاکستان کی طرف ابھی تک پھیرا نہیں لگا۔ دراصل پنجاب میں مشاعرے کم ہوتے ہیں، اور اگر ہوں بھی تو انڈیا کے شاعروں سے خوف زدہ رہتے ہیں کہ انہیں بلا لیا تو پتا نہیں حکومت کیا کہے؟ کراچی میں ایسی کوئی بندش نہیں، وہاں بھارت کے شاعر جاتے ہیں رہتے ہیں۔ دیکھیں، ہم ہی کوئی بہانہ نکالتے ہیں۔ آپ سے ملاقات تو ہونا چاہیے۔ میں اگست میں شملہ گیا تھا۔ وہاں چیف منسٹر ہماچل پردیش نے میری دو کتابوں ''غم عشق گر نہ ہوتا'' اور ''ناکامِ محبت - ساحر لدھیانوی'' کی رونمائی کی۔ بہت بڑی تقریب تھی۔

آپ کو حیرت ہوگی۔ انڈین ایمبیسی (اسلام آباد) نے صرف، امرتسر اور شملہ کا ویزا دیا۔ جبکہ میرے پاسپورٹ پر چھ چھ شہروں کے ویزے لگے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے چنڈی گڑھ کا ویزا وہاں سے لیا، دلی تک نہیں جاسکا۔

پتا نہیں حکومتیں کیا سوچتی اور کیا کرتی ہیں؟ شاد آباد رہیں۔ انل اگروال کو آداب کہیں۔

رب راکھا آپ کا

اظہر جاوید

نوٹ :- خالی جگہ پر نقطوں کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ تحریر ناقابل قرأت Illegible ہے۔ (ادارہ)

ویر بھدرا، دہرہ دون، 30/7/6

مکرمی سیفی صاحب سلام و نیاز

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں، ۲۰ر جولائی کو شملہ میں بھاشا وبھاگ کے مشاعرے میں پروفیسر خالد محمود صاحب بھی شریک تھے، موصوف سے باتیں ہوئیں تو آپ کا ذکر خیر بھی ہوا۔ خالد

صاحب آپ کی بے پناہ تعریفیں کرتے رہے۔ وہ خود بھی مجھے انتہائی مخلص انسان معلوم ہوئے۔
انتساب کا تازہ شمارہ موصول ہوا،شکریہ، اپنی غزل کی اشاعت کے لیے بھی شکر گزار ہوں، ابھی میں نے صرف آپ کا اداریہ پڑھا ہے، گیان چند جین صاحب کی کتاب پر آپ کے تاثرات بے حد اہم ہیں لیکن میں اس سے قبل کے دو شماروں کی اقساط بھی پڑھنا چاہتا ہوں یا تو مجھے اس کی زیراکس کاپی ارسال فرمادیں یا پھر دونوں شمارے ہی بھیج دیں۔ بے پناہ شکر گزار ہوں گا۔ ۲۳؍جولائی کو میری والدہ صاحبہ کا انتقال ہوگیا ہے، مرحومہ نجن تھیں اور انتہائی عبادت گزار اور متقی خاتون تھیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ والسلام۔

نیاز مند
راشد جمال فاروقی

بھیونڈی، 02/09/06

مکرمی ڈاکٹر سیفی سرونجی صاحب!

آداب!!

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ۲۷؍جولائی ۲۰۰۶ء کو ارسال کردہ آپ کا محبت نامہ اور انتساب کا شمارہ نمبر ۵۹، ۲۹؍اگست ۲۰۰۶ء کو بڑی خستہ حالت میں موصول ہوا۔ محکمہ ڈاک کی فرض شناسی کی یہ ادنیٰ سی مثال ہے۔ اگر نہ بھی ملتا تو ہم کیا کر لیتے، بہر حال خوشی اس بات کی ہے کہ رسالہ ملا۔ اب یہ اور بات ہے کہ اُس کے گوش سگ کی طرح مڑے ہوئے اوراق کو سیدھا کرنے میں کافی وقت لگا، ورنہ تو سیدھا ہونے سے رہا۔ بہر حال آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کو مضامین پسند آئے، آپ سے مودبانہ گزارش ہے کہ آپ مجموعے پر تبصرہ تحریر فرمائیں۔
محترم گیان چند جین کی کتاب سے متعلق آپ کا اداریہ بے حد فکر انگیز ہے۔ زبان اُردو سے محبت کرنے کے دعویدار تو بہت ہیں مگر آپ نے اُس محبت کا حق ادا کر دیا ہے۔ مکتوبات پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ آپ اس کام کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں، اللہ آپ کو مزید زورِ قلم عطا کرے، آپ کی شخصیت اور فن سے متعلق محترم انور سدید کا مضمون پڑھ کر آپ کی ہمہ گیر شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے، شمارے کے دیگر مشمولات قابلِ مطالعہ ہیں۔ یٰسین احمد کا افسانہ براہِ راست اچھا لگا، شعری حصے میں غزلیں اچھی ہیں، پروین کمار اشک کی ایک غزل وہ پیش رو ہے مگر راستا نہیں دیتا، اچھی لگی، جاوید ندیم کے فکر پارے قابلِ تعریف ہیں۔ مجموعی اعتبار سے رسالہ کافی معیاری ہے، اسے خوب سے خوب تر بنائیے۔ خیر اندیش۔
مشتاق رضا

اجین، 30.9.06

برادرم ڈاکٹر سیفی سرونجی صاحب، آداب و نیاز

شمارہ نمبر ۶۰ کے اندرون میں، سمایا ہوا رقعہ بھی ملا، بہت شکر گزار ہوں کہ آپ وقتاً فوقتاً یاد کرتے ہیں۔ انور شیخ افسانہ نمبر انتساب میں یقیناً آنا چاہیے انور شیخ کی متنوع صلاحیتوں سے واقف کرانے میں آپ کے جریدے ''انتساب'' کا بڑا کردار رہا ہے۔ تازہ شمارے میں موصوف کا افسانہ 'مرغا'' نظر سے گزرا، آپ نے اُن کے افسانے سے متعلق کسی کتاب کے ارسال کرنے کا ذکر کیا ہے، لیکن جہاں تک میری یادداشت کہتی ہے مجھے ایسی کوئی کتاب سرے سے ملی ہی نہیں، ہاں انور شیخ سے متعلق مجھے صرف دو کتابیں ملی ہیں، ایک ''منظومہ'' اور دوسری منظومہ سے متعلق ردِّعمل والی کتاب جس میں میرے بھی تاثرات شامل ہیں۔ لہٰذا آپ کے مضمون، انور شیخ افسانہ نمبر کے لیے درکار ہو تو براہِ کرم اُن کی افسانوں پر مشتمل تصنیف لوٹتی ڈاک سے ارسال کریں۔ دوسری صورت میں اگر آپ اجازت دیں تو ''مرغا'' پر اپنے تاثرات لکھ بھیجوں۔ تیسری صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ شمارہ نمبر ۶۰ کی مشمولات پر ایک سرسری نظر ڈال کر تاثرات قلمبند کرنے کی سعادت حاصل کروں۔ اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

نیاز مند

احمد کمال پروازی

اجین، 30.9.6 مکرمی سیفی صاحب، تسلیمات

بفضلہٖ تعالیٰ آپ بخیر ہوں گے۔

انتساب موصول ہوا۔ اس میں میرا مضمون بھی ہے، اس کے لیے میں آپ کا مشکور و ممنون ہوں۔ انور شیخ صاحب پر آپ نے شاعری کے متعلق کتاب بھجوائی تھی مگر مصروفیت کی وجہ سے مضمون نہیں لکھ سکا تھا۔ افسانہ کے متعلق فون پر تو گفتگو ہوئی تھی کتاب بھیجنے کے لیے بھی کہا گیا تھا مگر اب تک افسانہ کی کتاب موصول نہیں ہوئی ہے۔ اگر ابھی وقت ہو تو افسانے کی کتاب بھیج دیجئے، انشاء اللہ آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ شمارہ نمبر ۵۹ مجھے نہیں مل سکا ہے۔ اس کی مجھے اشد ضرورت ہے۔ اس میں ڈاکٹر زیبا محمود کا مضمون ''اردو تنقید پر مغربی اثرات'' شائع ہوا ہے، محترمہ ہمارے استادِ محترم کی صاحبزادی ہیں اس لیے وہ مضمون دیکھنے کا ازحد اشتیاق ہے، خط و کتابت اگر گھر کے پتہ پر ہو تو بہتر ہوگا کیونکہ کالج میں ڈاک غائب ہونے کا احتمال رہتا ہے، حسب مراتب گھر پہ دعا و سلام کہیے گا اور اپنی خیریت تحریر کیجئے گا۔

نیاز مند

ڈاکٹر غلام حسین

حیدرآباد، ۱۵-۹-۲۰۰۶ء　　　　　　　　بسم اللہ

ڈاکٹر سیفی صاحب،　　　السلام علیکم

تازہ ''شاعر'' میں آپ کا گوشہ دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ دس ادیبوں، شاعروں میں بھی آپ کی اپنی پہچان منفرد ہے۔ اردو ادب میں کل بھی آپ اپنی بے پناہ محبتوں کی وجہ سے منفرد رہے، آج بھی اپنے آپ سے خلوص کی وجہ سے بے مثال ہیں اور انشاء اللہ اپنے کارناموں کے سبب کل بھی یاد رکھے جائیں گے۔ آپ کی شعری تخلیقات، سفرنامے، اداریے اور اندرون و بیرون ہندوستان دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کوئی بھولنے یا بھلانے کی چیز تھوڑی ہے۔ محترمی شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، ایوب واقف، اطہر جاوید جیسے چاہنے والوں کے بیچ ناچیز رؤف خیر کو بھی شمار کر لیجئے۔ مجھے آپ کی سادہ مزاجی وسادہ لوحی بہت پسند آتی ہے۔ اچھے شعر کہنے کی تو آپ کی پرانی عادت ہے اور مزے کی بات یہ کہ ؎

کسی گروپ میں شامل کبھی نہیں ہوتے

ہمیشہ خود کو سیاست سے پاک رکھتے ہیں

یہاں ''سیاست'' کسی قدر معنی خیز اور کثیر المعنی ہے۔ آپ ہی کہہ سکتے ہیں۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے گا۔ پورے شاعر کا اگر آپ کے نام انتساب ہوتا تو بھی کم ہوتا۔ بہر حال یہ گوشہ خوب ہے۔

آپ کا

رؤف خیر

ابوظہبی، ۷ ستمبر ۲۰۰۶ء　　　　　　　　محترم سیفی سرونجی صاحب،

آداب وسلام،

انتساب باقاعدگی سے حاصل ہورہا ہے اور اس کی چمک دمک مسلسل ارتقائی منازل طے کررہی ہے۔ خوش قسمت ہیں آپ اور آپ جیسے دیگر احباب جنہیں ادب کے عمیق ذوق کے ساتھ ساتھ خاطر خواہ وقت بھی میسر ہے کہ وہ اپنی ذہنی وعلمی توانائیوں کو بروئے کار لاکر ادب کے تعلق سے اپنی ذمہ داریوں سے بحسن وخوبی عہدہ برا ہورہے ہیں اور یوں ہندوستان میں خصوصاً اور اردو دنیا میں بہ حد امکان اردو کی ترویج، اس کی توسیع اور ہمہ گیریت کے لیے مستعد اور مجتہد ہیں۔

یہاں کام کی بہتات اور وقت کا فقدان ہے، ''لمحہ لمحہ کاٹ کاٹ کر ساعت ایک بناتا ہوں'' اور پھر اسے مطالعۂ ادب کی نذر کردیتا ہوں۔ کاش اس وقت میں سے جو فرائض کی ادائیگی میں مسلسل صرف ہورہا ہے کچھ وقت بہ طرز احسن مجھے بھی میسر آجاتا........!!

شکر گزار ہوں کہ آپ نے شمارہ ۵۸ اور ۵۹ میں میری غزلوں کو شامل اشاعت کیا۔ چند نئی غزلیں ارسال کر رہا ہوں، اگر ممکن ہو تو آٹھ دس غزلیں ایک ساتھ شائع کر دیں تاکہ اہل ادب کو میرے انداز سخن کا علم ہو سکے، وہ جیسا بھی ہے۔ یہاں ترسیل زر میں کچھ مشکلات ہو گئی ہیں، براہِ کرم اپنا کاؤنٹ نمبر، بینک اور برانچ کا نام اور پتہ تحریر فرمائیں تاکہ زر فاقت بھیجا جا سکے۔

اپنی دو کتابیں ''سیپیوں کی قید میں'' اور ''صحرا میں جگنو'' میں نے ارسال کی تھیں، ان پر اگر آپ کے حلقہ کے ایک دو مقتدر دانشور اظہارِ خیال کر سکیں تو نوازش ہوگی۔ محترم گیان چند جین کی مہمل کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' پر آپ نے جو حقائق اور استدلال کے تناظر میں شمشیر قلم استعمال کی ہے اس کی کاٹ خود مصنف نے بھی محسوس کی ہوگی۔ آپ کی اس تیسری قسط اور محترم و مربی جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریر کے بعد اس سلسلے کو یہیں ختم ہو جانا مناسب ہے۔ اب ان آئینوں کو اپنا کام کرنے دیجیے۔

آپ کی چند کتابوں کی تحصیل کا متمنی ہوں۔ (۱) روشن الاؤ، (۲) سیفی سرونجی - ایک مطالعہ، (۳) سرونج سے لندن تک، (۴) سیفی سرونجی، فن اور شخصیت، (۵) سیفی سرونجی - ایک تنقیدی نظر۔ (ڈاک خرچ کے ساتھ قیمت سے مطلع فرمائیں) باقی کیفیات حسب معمول ہیں۔

احباب ولواحقین کو آداب وسلام۔

خیر اندیش
یعقوب تصور

ابوظہبی، ۱۳ر اکتوبر ۲۰۰۶ء

محترم ڈاکٹر صاحب، السلام علیکم،

امید ہے بخیر ہوں گے۔ تازہ شمارے کے بارے میں خبر ملی ہے کہ اس میں آپ نے میرا افسانہ شامل کیا ہے، اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ آپ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ میرے افسانوں کا مجموعہ ''دیر کبھی نہیں ہوتی'' آپ کو موصول ہو چکا ہوگا۔ یہ کتاب آپ کو دو مرتبہ بذریعہ رجسٹری بھیج چکا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ اس پر تبصرہ کر دیجیے۔ کیونکہ آپ کے تبصرے ہمیشہ متوازن ہوتے ہیں۔

میں آجکل ابوظہبی آیا ہوا ہوں۔ انتساب کا مذکورہ شمارہ تو میں نہیں دیکھ پایا۔ یعقوب تصور نے مجھے یہ اطلاع دی۔ البتہ ابھی تک پرچہ نہیں دیکھ پایا۔ اگر آپ نے یہ پرچہ ابھی تک میرے کراچی کے پتے پر نہیں بھیجا ہے تو براہِ مہربانی یعقوب تصور کے پتے پر بھیج دیجیے۔ میں یہاں سے ۸ رنومبر کو

واپس کراچی چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد ملا تو میرے لیے فائدے مند نہیں ہوگا۔ ورنہ کراچی کے پتہ پر بھیج دیجئے۔

ایک نیا افسانہ بھیج رہا ہوں۔ آپ سے توقع ہے کہ حسب معمول اسے بھی کسی قریبی اشاعت میں شامل کر دیں گے۔ ممکن ہو تو میری کتاب کا اشتہار بھی لگا دیجئے۔ مخلص۔

طاہر نقوی

نئی دہلی، ۲۱ر اکتوبر ۲۰۰۶ء

برادرم سیفی سرونجی صاحب! السلام علیکم

'انتساب' کا شمارہ ۶۰ ملا، اس سے قبل شمارہ ۵۹ بھی موصول ہوا تھا۔ اس عنایت کے لئے بے حد ممنون ہوں۔

گیان چند جین کی کتاب پر شمس الرحمٰن فاروقی کے تحریر کردہ تبصرہ کی اشاعت کے بعد پوری اردو دنیا اس کتاب کی مذمت کر رہی ہے۔ لیکن یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ مذکورہ تبصرہ کی اشاعت سے قبل اس کتاب کا نوٹس لے چکے تھے۔

ابھی جبکہ پوری اردو دنیا اس کتاب کی مذمت میں متفق ہے، سہ ماہی 'نیا ورق' کے مدیر ساجد رشید نے رسالے کے شمارہ ۲۴ میں اس موضوع پر انتہائی منفی اداریہ لکھ کر خود اردو والوں کی گوشمالی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسے پڑھ کر طبیعت مکدر ہوگئی، چنانچہ ایک 'کھلا خط' مدیر موصوف کے نام لکھ کر 'سبق اردو' کو میں نے بھیجا ہے جو آئندہ شمارے میں شائع ہوگا۔ اس کی ایک کاپی منسلک کر رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ اسے 'انتساب' میں شامل اشاعت کر لیں۔ 'کھلا خط' اگر ایک سے زیادہ رسائل میں شائع ہوتا ہے تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اردو زبان کے سلسلہ میں صحیح صورت حال پوری دنیا کے سامنے آسکے۔

امید ہے کہ اس کی رسید سے نوازیں گے۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

مخلص

ارشد کمال

(ڈاکٹر گیان چند جین کی بدنام زمانہ کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ، دو ادب'' پر اردو کے باشعور ادیبوں نے جو بے لاگ تبصرے کیے ہیں، انھیں 'نیا ورق' کے فاضل مدیر نے 'فرقہ وارانہ بحث' کا عنوان دے کر تقریباً تیرہ صفحات میں (شمارہ ۲۴) شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، افتخار امام صدیقی وغیرہ پر تیروں کی بوچھار کی ہے، گیان چند جین کی مدافعت میں کچھ فرقہ وارانہ اقتباسات بھی انہوں

نے درج کیے ہیں، لیکن شمس الرحمٰن فاروقی پر ان کی خاص ''نگاہِ کرم'' رہی ہے۔

غنیمت ہے کہ ساجد رشید کی نظر سے سیفی سرونجی کا مضمون نہیں گزرا یا نظر انداز کر دیا گیا، بہر حال ہم یہاں ارشد کمال صاحب کا ساجد رشید کے نام کھلا خط شائع کر رہے ہیں، قارئینِ انتساب کی رائے اور خطوط کا انتظار رہے گا۔)

ارشد کمال کا مدیر 'نیا ورق' کے نام

ایک کھلا خط

محترم ساجد رشید صاحب! السلام علیکم

'نیا ورق' (شمارہ ۲۴) کا اداریہ (بعنوان: 'ایک دل آزار کتاب' پر فرقہ وارانہ بحث) نظر سے گزرا، اُسے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا دو لکھاوٹ، دو ادب' پر شمس الرحمٰن فاروقی کے مفصل تبصرہ کی اشاعت کے بعد اردو حلقے میں پائی جانے والی بے چینی کا تجزیہ آپ نے بظاہر معروضی انداز میں کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کی معروضیت اس تحریر میں قدم قدم پر جھٹکے کھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔۔۔۔ آپ کی پوری تحریر کا نچوڑ اور لب لباب مضمون کے آخر میں (کسی اندیشے کی شکل میں) اس طرح مذکور ہے:

> ''کہیں اردو والوں کی فرقہ واریت گیان چند جین، کالی داس گپتا رضا اور مانک ٹالا جیسے اردو کے ادیبوں میں منفی ردِ عمل اور انہیں اردو معاشرے میں خود کو اجنبی محسوس کرنے کے لئے مجبور تو نہیں کر رہی ہے! اردو والوں کی اس انتہا پسندی کا غیر مسلم اردو کے ادیبوں پر کتنا بُرا اثر پڑتا ہوگا؟ کیا اس پر ہمیں ٹھنڈے دل سے غور نہیں کرنا چاہیے؟ وہ بھی تو ہمارے معاشرے کی اقلیت ہیں۔''

آپ کا مذکورہ اندیشہ بجا ہے یا بے جا، اس سلسلے میں کوئی تبصرہ کئے بغیر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ اردو حلقے میں پائی جانے والی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزادی کے فوراً بعد اردو معاشرے کے سامنے جو آزمائشی حالات آئے ان کا تجزیہ بھی پوری معروضیت سے کیا جائے، کہ اس کے بغیر معاملے کی اصل تہہ تک نہیں پہنچا جا سکتا۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ تقسیم ملک کے فوراً بعد سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر ہندوستانی مسلمانوں (خصوصاً اردو سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں) کو غیر معمولی نوعیت کے پریشان کن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان آزمائشی حالات میں اردو زبان و ادب کی بقاء کے لئے مؤثر انداز میں جدوجہد کرنا مسلمانوں کے لیے آسان نہ تھا اور ان کی یہ کیفیت غیر مسلم اردو داں طبقے سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔

کیا ایسی صورت میں غیر مسلم اردو والوں کا یہ فرض نہیں تھا کہ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے وہ اردو کے کاز کو اپنا مسئلہ سمجھ کر عوامی سطح پر متحرک ہو جاتے؟ اس طبقے نے اگر واقعی ایسا کچھ کیا ہوتا تو ملک میں اردو کے ساتھ ناروا سلوک کرنے والوں کے حوصلے بلند نہ ہوتے اور اس زبان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ہرگز نہ ہوتا۔ (خیال رہے کہ میں اردو کے غیر مسلم قلم کاروں کی بات نہیں کر رہا ہوں، کہ کوئی بھی زبان محض اپنے قلم کاروں کے سہارے زندہ اور متحرک نہیں رہ سکتی۔ اسے زندہ رکھنے کے لیے عوامی سطح پر عملی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔) اس وقت کے غیر مسلم عوام نے ایسا کچھ کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اس زبان سے خود کو اس طرح دور کر لیا کہ عوامی سطح پر اردو زبان مسلم حلقے میں سمٹتی چلی گئی یہاں تک کہ شری رام کرشن بشنوئی (اجمیر) کو آزردہ خاطر ہو کر 'نیا ورق' کے زیر نظر شمارے میں (صفحہ ۲۲۰ پر) یہ لکھنا پڑا کہ ''اردو اخبار اسلام سے شروع ہو کر اسلام پر ختم ہوتے ہیں''..... آج کی اس افسوس ناک صورت حال کے لیے کیا مسلم اردو داں طبقہ ذمہ دار ہے یا اس کی بنیادی ذمہ داری اس غیر مسلم اردو داں طبقے پر عائد ہوتی ہے جسے تقسیم ملک کے بعد اردو معاشرے سے کنارہ کش ہونے میں ہی عافیت نظر آئی اور جس نے اردو زبان کو اس وقت کے خستہ حال مسلمانوں کے رحم وکرم پر اس طرح چھوڑ دیا کہ یہ غریب زبان آگے چل کر دینی مدارس میں محدود ہو کر رہ گئی ..... بقول پروفیسر قمر رئیس، ''تقسیم سے پیدا شدہ حالات میں ہندوستان کی قومی سیاست نے اردو کے تئیں جو مایوس کن رویہ اختیار کیا اس نے اردو کو مسلمانوں کی زبان بنا کر اسے دینی مدارس میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔'' (نیا ورق، شمارہ ۲۴، صفحہ ۲۰۷)

اردو کی خاطر ملک کی قومی سیاست پر اثر انداز ہونے کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ اس وقت کے غیر مسلم اردو داں عوام کھل کر اردو کی حمایت میں سامنے آتے لیکن صد افسوس کہ یہی طبقہ دامن جھاڑ کر اردو زبان سے اس طرح الگ تھلگ ہو گیا کہ اپنی ہی سرزمین پر یہ زبان بالکل Alien یعنی اجنبی بنتی چلی گئی۔..... وہ تو کہیے کہ اپنی تمام تر زبوں حالی کے باوجود ملک کا اقلیتی طبقہ کسی نہ کسی شکل میں اردو کو ڈھوتا رہا کہ آج بھی اس میں زندگی کی کچھ رمق نظر آتی ہے ورنہ ہندوستان سے یہ زبان کب کی ختم ہو چکی ہوتی!

ان باتوں سے میرا مدعا یہ ہے کہ اردو معاشرے نے اس ملک کے غیر مسلم اردو داں طبقے کو خود سے علیحدہ نہیں کیا بلکہ مذکورہ طبقے نے منصوبہ بند طریقے سے اس زبان کو اس طرح مسترد کیا کہ یہ زبان چار و ناچار مسلمانوں کے درمیان سمٹ کر رہ گئی اور آزادی کے بعد شمالی ہند میں پیدا ہونے والی نسل نے اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کی شکل میں دیکھا نتیجے کے طور پر اردو اخبارات اور رسائل

میں مسلمانوں کی نمائندگی اور ترجمانی اس طرح ہونے لگی کہ اردو معاشرے میں موجود غیر مسلم قلم کار اب اجنبیت محسوس کرنے لگے ہیں۔ جس کی جانب آپ نے اپنے اداریے میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

''اردو معاشرے کا یہ انداز فکر اگر اردو کے غیر مسلم ادیبوں میں خود کو اجنبی ہونے کا احساس پیدا کرتا ہے تو اس کے لیے ہمارا اردو معاشرہ ہی ذمے دار ہوگا۔''

آپ نے اپنے مذکورہ الفاظ میں جس اندیشے کا اظہار کیا ہے وہ چیز اندیشے کے حدود کو پار کر کے ایک حقیقت کی شکل اختیار کر چکی ہے، البتہ اس کے لیے اردو معاشرے کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا، جیسا کہ آپ کے مذکورہ اقتباس سے تاثر ملتا ہے.... اردو کے موجودہ مفلوک الحال معاشرے کا حال تو یہ ہے کہ جب نئی نسل سے تعلق رکھنے والا کوئی غیر مسلم اردو کی جانب متوجہ ہوتا ہے اسے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اردو حلقے میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ اس کی نسبتاً کمزور تخلیق کو قدرے اہتمام سے رسائل میں جگہ دی جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو کو اس کا ایک محسن مل گیا۔

جہاں تک کالی داس گپتا رضا اور تاراچرن رستوگی جیسے قلم کاروں کی اس شکایت کا سوال ہے کہ غیر مسلم ہونے کی وجہ سے اردو حلقے میں انہیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے، تو اس سلسلے میں یہ عرض کرنا چاہوں کہ اگر واقعی ان کی حق تلفی ہوئی ہے جیسا کہ ان حضرات کا دعویٰ ہے تو اس کی کوئی فرقہ وارانہ وجہ نہیں ہو سکتی۔ کیا اس طرح کی 'ناانصافی' اور نقادوں کی طرف سے 'بے اعتنائی' کی شکایتیں اردو کے مسلم قلم کاروں کی طرف سے نہیں آئیں؟

سہ ماہی 'انتخاب' (گیا) کے حالیہ شمارے میں پروفیسر ساجدہ زیدی نے خود اپنی شاعری پر ایک تفصیلی مضمون لکھ کر نقادوں کی جانب سے ہونے والی سرد مہری اور بے التفاتی کی شکایت کی ہے۔ ان کا ایک جملہ اس طرح ہے:

''اکثر محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے نقاد (بہ استثنائے چند) میری شاعری سے خوف زدہ ہیں، کیونکہ میں ایک عورت ہوں۔''

یعنی ساجدہ کے بقول اگر وہ عورت نہ ہوتیں تو ہمارے نقاد خاطر خواہ انداز میں ان کی شاعری کی جانب متوجہ ہوتے۔ ...دراصل معاملہ یہ ہے کہ جب کوئی قلم کار (صحیح یا غلط) یہ سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے تو وہ مختلف قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کسی کو یہ شکایت کہ غیر مسلم ہونے کی وجہ سے اسے نظر انداز کیا گیا تو کوئی اس بات پر بدگمان کہ عورت ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی۔ ان تمام باتوں کو ہم قلم کاروں کا اپنا وہم ہی کہہ سکتے ہیں اور وہم کا کوئی علاج نہیں ہے۔

ساجد بھائی! میں آپ کے اس غم میں برابر کا شریک ہوں کہ موجودہ صورت حال میں اردو معاشرے کا اقلیتی طبقہ خود کو اجنبی نہ محسوس کرنے لگے، لیکن تقسیم ملک کے بعد اردو زبان کو ہندوستانی سماج میں تنہا کرنے اور اجنبی بنانے کے لیے جس طرح کے حربے استعمال کیے گئے (جس کے منطقی نتیجہ کی شکل میں ہی موجودہ صورت حال سامنے آئی ہے) اس پر ہم آزردہ خاطر کیوں نہیں ہوتے اور ہمارا دل کیوں نہیں تململاتا؟ آپ کہیں گے ان باتوں پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب ان باتوں کو دہرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔... آپ کی بات سر آنکھوں پر لیکن کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ گیان چند جین کی متذکرہ کتاب اسی پرانی اردو مخالف ذہنیت کی ایک تازہ ترین کڑی ہے۔... تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں خود کو اردو سے لاتعلق کرنے والے عام لوگ، گیان چند جین جیسے قلم کاروں سے بہر حال بہتر تھے کہ کم از کم ان لوگوں نے اردو معاشرے کے خلاف ڈھیر ساری بے بنیاد، لغو اور بے سر و پا باتیں تحریر کر کے ہندوستانی عوام کو اردو کے خلاف ورغلانے اور بدگمان کرنے کی کوشش نہیں کی، ان لوگوں نے گیان چند جین کی طرح اس زبان پر تنگ نظری کا الزام نہیں لگایا، اسے تقسیم ملک کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا اور نہ ہی اس کے رسم الخط میں نقص نکالنے کی کوشش کی۔... خیال رہے کہ درج بالا سطور میں، میں نے جین کے صرف اردو مخالف رویے کی جانب اشارہ کیا ہے، مصنف کا مسلم مخالف رویہ میری بحث کا موضوع نہیں ہے۔

آپ کی یہ بات بھی کتنی عجیب ہے کہ جین کے مذکورہ اردو مخالف رویے کے باوجود ان کی زیر بحث کتاب کو اپنے ان الفاظ میں **بے حد ضروری** خیال کرتے ہیں:

> ''میں اس کتاب کو اس لیے بے حد ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ اردو کے ایک ایسے قد آور محقق اور ناقد کی کتاب ہے جو اردو معاشرے کی اقلیت سے تعلق رکھتا ہے اور جس نے اردو ادب کو کئی گراں قدر کتابیں دی ہیں۔''

سبحان اللہ، آپ کے اس ادبی فتویٰ کے بعد جین کی مذکورہ کتاب کو اس کے اپنے معیار پر تولنے اور پرکھنے کی گنجائش ہی کہاں باقی رہتی ہے! اردو معاشرے کی اقلیت سے تعلق رکھنے والا قد آور محقق اپنی کتاب میں کیسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں تحریر کر دے وہ کتاب آپ کی نگاہ میں پھر بھی وقیع قرار پائے گی۔ کتاب کو پرکھنے کا آپ کا یہی وہ غیر منطقی پیمانہ ہے جس کی بنا پر آپ:

(الف) اس کتاب میں موجود (اردو کے خلاف بغض و عناد سے بھرپور) انتساب کو ایک 'بچکانہ تحریر' کہہ کر اس سے درگزر کر جاتے ہیں،

(ب) جس 'محسنِ اردو' کی شان میں مذکورہ انتساب تحریر کیا گیا ہے، وہ اس کتاب سے (یا کم از کم اس کے مکروہ انتساب سے) اپنی لاتعلقی ظاہر نہیں کرتے، بلکہ

آپ کے بقول، اس کتاب کی طباعت اور اشاعت میں معاونت کرتے ہیں تو
اسے آپ ان کی 'بشری کمزوری' پر محمول کرکے ٹال جاتے ہیں،

اور

(ج) جب اردو والے ان باتوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں تو آپ ان کی تحریر کو 'بغض و عناد کا بدترین نمونہ' قرار دے کر اسے ان کی 'فرقہ واریت' اور 'انتہا پسندی' سے تعبیر کرتے ہیں!

آپ اپنے اداریے کے پہلے پیراگراف میں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ''بلاشبہ گیان چند جین کی متذکرہ کتاب مسلمانوں کے لیے بے حد دل آزار ہے''، لیکن اداریے کے عنوان میں لفظ 'دل آزار' کو واوین میں رکھتے ہیں۔..... آپ کی تحریر کا یہ تضاد کم از کم میری سمجھ میں نہیں آیا۔

آپ نے اپنے اس سوال سے، کہ فاروقی اور حنفی نے کتاب کے سولہ ابواب میں سے صرف چار ابواب پر ہی کیوں بحث کی، یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ کتاب میں ڈھیر ساری مثبت باتیں بھی تو موجود تھیں، مذکورہ مبصروں نے ان پر بحث کیوں نہیں کی؟ میری نظر میں اس کا سیدھا اور بالکل سادہ سا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے گھر میں آگ لگا کر اس گھر پر پھول بھی برساتا جاتا ہے تو کیا ایسے میں اس گھر کا مالک ان برسنے والے پھولوں کے رنگ و بو سے محظوظ ہوگا، یا اس کی پہلی کوشش یہ ہوگی کہ اس لگائی گئی آگ کو کسی طرح بجھایا جائے۔ ایسا نہیں کہ وہ پھولوں کے رنگ و بو کا قائل نہیں، لیکن وہ یہ بھی تو جانتا ہے کہ اگر اس لگائی آگ پر فوراً قابو نہیں پایا گیا تو یہ آگ بڑھتے بڑھتے اس کے گھر کے علاوہ آس پاس کی پوری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے اور ایسے میں گھر پر برسنے والے پھول بھی جل کر خاکستر اور بے معنی ہو جائیں گے۔ لہٰذا مذکورہ کتاب کو پڑھتے ہوئے اردو سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کی نگاہ فطری طور پر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ انہی چار ابواب پر جائے گی!

برسبیل تذکرہ یہ بھی عرض کردوں کہ اگر شمس الرحمٰن فاروقی کا تحریر کردہ تبصرہ آپ نے بغور پڑھا ہوتا تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ فاضل مبصر نے اپنے تبصرے میں کتاب کے کل سترہ ابواب میں سے ہر ایک باب سے کچھ نہ کچھ حوالے دیے ہیں، نیز یہ کہ کتاب میں کم و بیش تین سو صفحات ہیں، ان میں سے آخر کے صرف ۲۵-۳۰ صفحات ہی ایسے ہیں جہاں سے مذکورہ تبصرے میں اقتباس نقل نہیں کیے گئے ہیں۔ اس لیے کم از کم فاروقی کے تبصرے کی حد تک آپ کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مبصر نے کتاب کے صرف چار ابواب سے بحث کی ہے۔

اردو کے سلسلے میں آپ کی نیک نیتی اور خلوص کو میں مشکوک یا مشتبہ نہیں سمجھتا، کہ آپ تو ہر

حال میں اردو معاشرے کو غیروں کی نگاہ میں سرخرو دیکھنا چاہتے ہیں، البتہ آپ کے اس اداریے کو پڑھ کر میرے ذہن میں اپنے خاندان کے ایک بزرگ کی یاد تازہ ہوگئی۔ ان بزرگ کا قصہ یہ ہے کہ جب کبھی ان کے اکلوتے بچے کی پڑوس کے کسی بچے سے بحث یا تکرار ہو جاتی اور یہ خبر موصوف تک پہنچتی تو بغیر کسی پوچھ تاچھ یا سوال جواب کے وہ اپنے بچے کی خوب سرزنش کرتے..... پڑوس کے بچے ان کے اس رویے کا خوب خوب فائدہ اٹھاتے اور جب ان کی اہلیہ اس ضمن میں کچھ مداخلت کرنا چاہتیں تو انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیتے کہ اگر بچے کی تنبیہ نہ کی جائے تو بچے بگڑ جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ اپنے اس بچے کے تئیں ان کا رویہ یا سلوک، اخلاص پر مبنی تھا، لیکن اس سے بھی بڑھ کر جو بات ان کے لاشعور میں گھر کر گئی تھی وہ یہ تھی کہ اپنے بچے کے سلسلے میں ان کی اس 'اصول پسندی' کی وجہ سے آس پاس کے لوگ ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ اپنی اس '**امیج**' کو برقرار رکھنے کی کوشش میں انہوں نے جو کچھ کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا بچہ نفسیاتی طور پر پژمردگی کا شکار ہو گیا، اور اپنی ذلت پر سے اس کا اعتماد اٹھتا گیا، یہاں تک کہ اس کی زبان میں لکنت پیدا ہوگئی.... مذکورہ بزرگ کو اپنی غلطی کا احساس تو ہوا لیکن جب تک بہت دیر ہو چکی تھی، یعنی ہر طرح کے علاج معالجے کے باوجود ان کا بچہ اپنی زبان کی لکنت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا۔

ساجد بھائی! آزادی کے بعد سے اب تک اردو زبان کو اپنے ملک میں جن حالات کا سامنا کرنا پڑا اس کی وجہ سے یہ زبان تو لکنت زدہ ہو ہی چکی ہے، اب اگر آپ جیسے مخلص (مذکورہ بزرگ کے انداز میں) اس کی گوشمالی اسی طرح کرتے رہے تو خدشہ یہ ہے کہ یہ لکنت زدہ زبان سرے سے بے زبان بن کر نہ رہ جائے!!

میری تو اس تحریر کا اصل موضوع تو آپ کا اداریہ ہے نہ کہ گیان چند جین کی کتاب یا اس پر لکھے گئے تبصرے، تاہم یہ بات بہت زیادہ بے محل نہ ہوگی اگر میں (جین کے تحریر کردہ مذکورہ انتساب کے حوالے سے) 'محسن اردو' گوپی چند نارنگ کی خدمت میں اپنا ایک شعر نذر کر کے اس مراسلے کو اختتام تک پہنچاؤں۔

تکلم کا کرشمہ اب دکھاؤ
تمہاری خامشی میں شور و شر ہے

☆☆

نوٹ:۔ گوپی چند نارنگ نے "صدائے اردو" اور "نیا ورق" میں متنازعہ انتساب کے سلسلے میں اپنی برأت کا اظہار کر دیا ہے، درج بالا خط اس سے پہلے کا تحریر کردہ ہے۔ (ادارہ)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ محمد ایوب واقف کی کتاب ''شعور و ادراک'' کا اجراء کرتے ہوئے
کھڑے ہوئے (دائیں سے بائیں) نسیم انصاری، کوثر صدیقی، محمد ایوب واقف، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر بشیر بدر

Quarterly

Issue No. 61

INTISAB

Sironj

ساہتیہ اکاڈمی کے سیمینار میں شرکت کے موقع پر -سیفی سرونجی، مہتاب حیدر نقوی، چندر بھان خیال اور گلزار

نجمہ عثمان، سیفی سرونجی اور چمن لال چمن